فتحِ افغانستان

مصطفےٰ کمال پاشا





مصطفےٰ کمال پاشا تاریخ و سیاست کے ایسے طالب علم صحافی ہیں جو حقائق پر پڑی ہوئی تعصب و جانبداری کی گرد صاف کرنے کا عزم لئے صحافت کے میدان پرخار میں اترے ہیں۔ ایک مقامی کالج میں تعلیم و تدریس کے علاوہ عملی صحافت سے بھی وابستہ ہیں۔ قومی اہمیت کے سیاسی و معاشی موضوعات پر ان کی اپنی ایک رائے ہے جس کے تناظر میں وہ حقائق کا تجزیہ ہی نہیں کرتے بلکہ پیش آئند حالات کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار بھی کر دیتے ہیں۔ جماعتی و گروہی وابستگیوں کے علی الرغم ان کی رائے کا مرکزی نقطہ حقائق اور ان کی پاکستانی تشریح ہوتا ہے انہیں بین الاقوامی واقعات کو ملکی اور اسلامی عالم کے مفادات کے تناظر میں رکھ کر لوگوں کے سامنے پیش کرنے کا بھی ایک خاص ملکہ حاصل ہے۔ بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی میں حصول تعلیم کے دوران ایک عرب پروفیسر ڈاکٹر عبداللہ عزام کی وساطت سے ہندوکش کی وادیوں تک جا پہنچے اور بھرپوری ایک دھائی تک تحریک مزاحمت اور مسئلہ افغانستان ان کی نظری اور عملی کاوشوں کا محور بنا رہا۔ زیر نظر کتاب انہی کاوشوں کاایک تحریری ثبوت ہے

ا

بسم الله الرحمن الرحیم



3

فتحِ افغانستان



مصطفیٰ کمال پاشا

جنگ پبلشرز

اکیسویں صدی کے تقاضوں سے ہم آہنگ

ہر عمر اور ہر ذوق کے قارئین کے لئے

خوبصورت اور معیاری مطبوعات



ناشر		میر شکیل الرحمٰن
باراول	:	جولائی 1992ء
تعداد	:	2000
قیمت	:	175 روپے
اہتمام وادارت	:	مظفر محمد علی
پبلشر	:	جنگ پبلشر 'لاہور (جنگ انٹرپرائیزز پرائیویٹ لیمٹڈ کا ایک ذیلی ادارہ)
مطبع	:	جنگ پبلشرز پریس 13- سر آغا خان روڈ- لاہور

اس منصوبہ ساز کے نام

جس نے فتح افغانستان کا خواب دیکھا
اور پھر روسیوں کو عسکری ہزیمت سے دوچار کیا

6

پروڈکشن : اقبال حیدر بٹ

ٹائٹل ڈیزائن : انٹر فلو کمیونی کیشنز

پینٹنگ : عقیل احمد

کمپوزنگ : محمد واجد۔ نزہت روبی۔ سمیرا۔

7

فہرست

فتح افغانستان

//

فتحِ افغانستان .... ان لاکھوں شہداء کے خوابوں کی تعبیر ہے جنہوں نے کوہ ہندوکش کی وادیوں میں دنیا کی پُر شکوہ سپر طاقت کی ظالم افواج کے ساتھ پنجہ آزمائی کی۔ شہداء کے ان لاکھوں ورثاء کی امید ہے جو ابھی تک افغانستان میں ایک حقیقی اور اصلی اسلامی حکومت کے قیام کی خبر سننے کے لئے بے تاب ہیں۔

فتحِ افغانستان .... ان لاکھوں مہاجرین کے طویل اور صبر آزما انتظار کا اجر ہے جو افغانستان میں ابھی تک پائیدار امن کے قیام کے منتظر ہیں تاکہ وہ اپنے مادرِ وطن کو لوٹ سکیں۔

فتحِ افغانستان .... ایک ماضی ہے جس میں سوویت یونین قصۂ پارینہ بن کر صفحہ ہستی سے مٹ گیا۔

فتحِ افغانستان .... ایک ایسا خواب ہے جس کی تعبیر۔ حقیقت بن کر بھی

گہنا گئی۔ اپنوں کی نادانیوں اور دشمنوں کی چالوں نے واضح منظر کو دھندلا دیا ہے۔
لیکن

مجاہدین ــــــ سربکف تیار۔ تاکہ کابل میں ہلالی پرچم لہرایا جاسکے۔

مہاجرین ــــــ ہنوز منتظر۔ کہ افغانستان میں پائیدار امن لوٹ آئے۔

قائدین ــــــ بے تاب اور سرگرداں۔ کہ فتحِ افغانستان ان کا مقدر بنے۔

فتحِ افغانستان ــــــ روشنی کی ایک ایسی کرن ہے جو وسطی و جنوبی ایشیا کی مسلم ریاستوں کے امکانی اتحاد کو واضح کر سکتی ہے۔

فتحِ افغانستان ــــــ مسلم ورلڈ آرڈر کا ابتدائیہ ہے۔

افتتاحیہ

15

سرفروش حریت پسندوں کی ارضِ قدیم ، افغانستان اشتراکی افواج کے الحادی وجود سے پاک ہوچکی اشتراکیوں کی ارضی جنّت کا خواب پریشان ہوچکا۔ سوویت یونین نقشۂ عالم سے ایک حرفِ غلط کی طرح مٹ چکا۔ وسطِ ایشیاکی نو آزاد مسلم ریاستوں کے ساتھ مسلم ممالک کے تعلقات کی ابتدابھی ہوچکی لیکن کابل ہے کہ ابھی تک سلگ رہاہے۔ اعلانِ امن کے باوجود قیامِ امن کی صورت دکھائی نہیں دے رہی ہے۔

بطروس غالی 'اپنے پانچ نکاتی فارمولے پر اتفاقِ رائے حاصل کئے بغیر کابل میں ایک ایسی حکومت قائم کروانے میں کامیاب ہو چکے ہیں جو امریکہ ' روس کے علاوہ بھارت سرکار کے لئے بھی قابلِ قبول ہے۔ جہادِ افغانستان اور مجاہدین کے ازلی دشمن ولی خان اور اس قبیل کے دیگر سیاستدان اور دانشور بھی افغانستان میں ایسے امن کے قیام پر خوش ہیں جس میں سے خون بھی رستا ہے اور بارود کا دھواں بھی اٹھتا رہے حیران کُن بات تو یہ ہے کہ میاں نواز شریف نے جہادِ افغانستان کی " دو رکعت نماز " پڑھ کر " مجاہدین کی حکومت " کے قیام کا فرضِ کفایہ بھی ادا کر دیا۔ ملکی و بین الاقوامی پریس سے دادِ تحسین بھی حاصل کر لی لیکن فاتح افغانستان کے منصبِ عالیہ پر فائز نہیں ہوسکے جو بہت سے " جہاد دوست " سیاسی اور عسکری رہنماؤں کی خواہش تھی۔

صبغتہ اللہ مجددی ' رسوائے زمانہ گلم جم ملیشیاکی بندوقوں کے سہارے کابل کے قصرِ صدارت میں

جلوہ افروز بھی ہو چکے۔ ظاہر شاہی اور نجیب اللہ باقیات کے علاوہ مجاہد تنظیمات کے کچھ نمائندے بھی اس عبوری کونسل میں مجددی صاحب کے شریک کار ہیں تاکہ اقتدار افغان عوام کے نمائندوں کو منتقل کیا جا سکے۔ گویا افغان عبوری کونسل کی کوئی نمائندہ حیثیت نہیں ہے۔

یہاں سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا اس طرح پُرامن انتقالِ اقتدار کے مختلف مراحل طے بھی ہو سکیں گے۔ پُرامن انتقال اقتدار ایک ایسا خواب اور خواہش تو ہو سکتی ہے جس کی عملی تعبیر اور حقیقت کے بارے میں اس منصوبے کے خالقوں کو بھی زیادہ معلومات حاصل نہیں ہوں گی۔

"معاہدہ پشاور" جس کے تحت صبغتہ اللہ مجددی نے کابل جا کر عبوری طور پر امورِ مملکت سنبھالے ایک لحاظ سے درست ہے کہ اس طرح امورِ مملکت افغان عوام کے نمائندوں کو منتقل کرنے کا اقرار کر لیا گیا ہے جس سے افغانوں کے حق خود ارادیت کو تقویت ملی ہے لیکن اس کے لئے جو طریق کار تجویز کیا گیا ہے وہ شاید زیادہ قابلِ عمل اور بہتوں کے لئے قابلِ قبول بھی نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ کابل ابھی تک بے یقینی اور خانہ جنگی کی ابھرتی ڈوبتی لہروں میں گھرا ہوا ہے۔ سفینۂ امن ابھی تک منجدھار میں ہچکولے کھا رہا ہے۔

دسمبر 1979ء سے لے کر فروری 1989ء تک صورتحال بڑی واضح تھی روسی افواج کی موجودگی میں دو نکاتی فارمولے کے تحت جہاد جاری رہا۔ افغانستان سے روسی افواج کے غیر مشروط انخلاء اور کابل میں مجاہدین کی حکومت کے قیام جیسے اہداف کے حصول کے لئے مجاہدین یکجا اور متحد تھے 1989ء میں روسی افواج کے انخلاء کے بعد عالمی سازش کے تحت "مجاہدین کی حکومت" کے قیام کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کی جانے لگیں اب مسئلہ افغانستان کی نوعیت کو بڑا پیچیدہ بنا دیا گیا ہے ویسے تو ہماری حکومت نے اقوام متحدہ کے ساتھ مل کر اپنے تئیں اس مسئلے کو حل کر دیا ہے حتیٰ کہ اس مسئلے پر کابل جا کر "دو رکعت نماز" بھی پڑھی جا چکی ہے۔ لیکن وہاں ابھی تک نہ تو عبوری حکومت قائم ہو سکی اور نہ ہی اس کے قیام پر اتفاق ہو سکا ہے۔

گلبدین حکمت یار کو، جس نے روسیوں کو "ناکوں چنے چبوانے" میں مرکزی کردار ادا کیا، اقتدار سے علیحدہ رکھنے کی سازشیں کی جا رہی ہیں اور جنرل رشید دوستم جیسے ننگ ملت افراد کو جنہوں نے اشتراکی افواج اور ان کے پروردہ حکمرانوں کی کابل پر حکمرانی کرنے میں معاونت کی، شریکِ اقتدار رکھنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ مغربی ذرائع ابلاغ گلبدین کو ایک ایسے "نٹ کھٹ" اور "خودسر" افغان جنگجو کے طور پر پیش کر رہے ہیں جو افغانستان میں قیامِ امن کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے وہ کسی کا کہنا نہیں مانتا اور من مانی کی راہ پر گامزن ہے۔ حالانکہ حقیقی صورتِ حال اس کے برعکس ہے۔ موجودہ غیر یقینی صورتِ حال کی بنیادی وجہ "مجاہدین کی حکومت" کے قیام کے ہدف سے انحراف ہے اشتراکی افواج کے انخلاء کے بعد "انتقالِ اقتدار" کے انتظامات کی بجائے "شرکتِ اقتدار" کی منصوبہ بندی کا شروع کرنا ہے یہی وجہ ہے کہ معاملات اب بھی عدم توازن کا شکار دکھائی دیتے ہیں۔

"مسئلہ افغانستان" سے تھوڑی بہت دلچسپی رکھنے والا ہر فرد یہ جاننا چاہتا ہے کہ "جہادِ افغانستان" کیا ہوا؟ مجاہدین کی حکومت کا قیام کیوں نہیں ہو سکا؟ اگر موجودہ حکومت مجاہدین کی ہے تو اس میں ظاہر شاہ اور نجیب اللہ کے حامیوں اور جنرل رشید دوستم کی شمولیت چہ معنی دارد؟ مجاہدین کی حکومت گلبدین کے خلاف زہر کیوں اگل رہی ہے؟ مجاہدین اگر حقیقتاً اس قدر طاقتور تھے کہ انہوں نے روسی افواج کو افغانستان سے نکلنے پر مجبور کر دیا تو پھر جلال آباد کیوں فتح نہ ہو سکا کابل پر فتح کا جھنڈا لہرانے کی بجائے انہیں اقوامِ متحدہ کی بیساکھیوں کا سہارا لے کر مخلوط عبوری انتظام میں شامل کیوں ہونا پڑا؟ روس نے افغانستان پر لشکر کشی کیوں کی؟ تحریکِ مزاحمت کی ابتدا کیسے ہوئی اور پھر اس میں طاقت کیسے پیدا ہوئی؟ مجاہدین کی صفوں میں پائی جانے والی اتحاد و افتراق کی قوتوں کی اصلیت کیا ہے؟ کیا یہاں پائیدار امن کے قیام اور تعمیرِ نو کے لئے بھی مجاہدین متحد ہو سکتے ہیں؟ روسی افواج کو افغانستان سے نکالنے کے لئے کن کن لوگوں نے کیا کردار ادا کیا اور پھر روسی افواج کے انخلاء کے بعد مختلف افراد کا کیا کردار رہا ہے۔ آئندہ صفحات ایسے ہی حقائق کی نقاب کُشائی کی جستجو کا نتیجہ ہیں جن میں افغانوں کے طویل مزاحمتی کردار اور مسلم تشخّص کے حوالے سے مستقبل میں پیش آئند حالات کے علاوہ زار شاہی اور اشتراکی روس کے ماضی اور حال کے بارے میں بھی تفصیلات بیان کی گئی ہیں جن کی مدد سے روسیوں کے طویل توسیعی اقدامات کے ساتھ مسلمانوں اور افغانوں کے مزاحمتی کردار کو درست پس منظر میں دیکھا اور سمجھا جا سکتا ہے۔ بہت سے بیان کردہ حقائق شاید باخبر افراد کے لئے نئے نہ ہوں لیکن انہیں تاریخی و تجزیاتی پس منظر میں جس طرح بیان کیا گیا ہے وہ بالکل نیا ہے ماضی میں پیش آنے والے واقعات اور حقائق کو جس طرح غیر جذباتی انداز میں غیر جانبدارانہ طریقے سے بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے اس سے مباحث کے نئے دریچے وا ہونے کی توقع ہے جو اس کتاب کی اشاعت کا مقصدِ وحید ہے۔ کئی واقعات کی جانچ پرکھ کے لئے کئی "معتبر شخصیات" سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ انہوں نے بیشتر توجیحات کو درست قرار دیتے ہوئے مجھے انہیں بے کم و کاست بیان کرنے اور پھر شائع کروانے سے باز رکھنے کی برادرانہ و مشفقانہ کوشش کی۔ کئی احباب نے ان حقائق اور "نئی توجیحات" چھپنے کے بعد با اثر دوستوں کی ناراضگی سے بھی ڈرایا لیکن میرے پیشِ نظر حقائق کو "پروپیگنڈہ اور جانبداری" کی گرفت سے آزاد کر کے صاف شفاف اور اصلی حالت میں لوگوں کے سامنے پیش کرنے کی ایک دُھن سوار تھی جسے میں نے طویل مسافتیں طے کرتے 'مسئلہ افغانستان سے وابستہ کئی افراد سے طویل گفتگوؤں اور ہزاروں صفحات کے مطالعے کے بعد "فتحِ افغانستان" کی صورت میں قوم کے سامنے پیش کر دیا ہے۔

"حقیقتوں کی تلاش" کے اس سفر میں مدح و ستائش کی تمنّا نے نہ تو میرے قدموں میں برق رفتاری پیدا کی اور نہ ہی نقد و جرح کا خوف میرے پاؤں کی زنجیر بن سکاہاں! مجھے برادر فاروق احمد (ٹوبہ ٹیک

سنگھ والے) جناب چودھری عبدالرحمٰن (ادارہ معارفِ اسلامی) کے علاوہ میری رفیقہ حیات فیضیہ ثمین کا تعاون بھی حاصل رہا۔

مصطفےٰ کمال پاشا

53/36 میاں میر دربار۔ لاہور

افغان اور افغانستان

ماضی اور حال کے آئینے میں

افغان کون ہے؟

بقول سید جمال الدین افغانی ' اہل ایران ' ان کو افغان کہتے ہیں اور اس نام کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ جب بخت نصر نے ان لوگوں کو گرفتار کیا تو یہ لوگ آہ وفغاں کیا کرتے تھے اور فارسی میں آہ وزاری کو فغاں یا افغان کہتے ہیں۔ اسی وقت سے اس کا نام افغان پڑ گیا۔

یہ بھی کہا جاتا کہ شاوڈؤ کے پوتے کا نام افغان تھا اور یہی افغانوں کا مورث اعلیٰ ہے۔ افغانیوں کا نام افغان اسی دادا کے نام پر افغان پڑ گیا ہے۔ ایران کے عوام انہیں اوغان کہتے ہیں جو لفظ افغان کا متبادل ہے۔ ہندوستان والے انہیں پٹھان کہتے ہیں۔ افغانیوں کے بعض قبیلے مثلاً قندھار کے باشندے اور قزن کے باشندے اپنے آپ کو پشتو اور پشتان کہتے ہیں اور بعض مثلاً خوست ' کورم اور باجوڑ کے باشندے اپنے آپ کو پغتو اور پغتان کہتے ہیں۔

ذرا غور کرنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ سب الفاظ ایک ہی لفظ کی مختلف شکلیں ہیں۔ لفظ افغان اوغان اور پُٹھان لفظ پغتان یا پشتان کی تحریف ہے۔ لفظ پغتان وپشتان ممکن ہے لفظ پاشتان سے ہوں۔ پاشتان نام کا مقام ضلع نیشاپور میں موجود ہے یا شاید یہ الفاظ خراساں کے ایک شہر باشت سے بنے ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ دونوں لفظ فلسطین کے ایک قریہ بشیت سے ماخوذ ہوں یہ احتمال اس بنیاد پر ہے کہ افغان بنی اسرائیل میں سے ہیں۔ افغان متعدد قبائل کا مجموعہ ہیں۔ ارباب تاریخ نے ان کی ابتدا کے متعلق مختلف آراء پیش کی ہیں۔ کچھ انہیں بحر خزر

کے باشندے قرار دیتے ہیں کچھ انہیں تیمور گورگان کی نسبت سے یاد کرتے ہیں بعض انہیں اشوری کلدانی قرار دیتے ہیں۔ بعض مورخین انہیں اسباط بنی اسرائیل میں شمار کرتے ہیں۔ بخت نصر نے ان میں سے بہتوں کو قتل کر دیا اور بقیہ السیف کو لا کر ان پہاڑوں میں بسا دیا جسے آج کوہستان غور کہا جاتا ہے۔ ان لوگوں نے اپنے جدید مسکن کو اپنے قدیم مسکن وادی غور واقع ارض شام کی یاد میں غور کا نام دیا اور زبان کو بخت نصر کی طرف نسبت کر کے پختو کہا جو زمانہ مابعد میں پشتو ہو گیا۔ اس کے بعد عرب یہودیوں کے ساتھ ان کی خط و کتابت شروع ہوئی۔ جب عرب یہودی مسلمان ہوئے تو انہوں نے خالد نامی شخص کو یہاں دعوت اسلامی کے لئے بھیجا۔ اس کے بعد افغانیوں نے اپنے سرداروں کی ایک جماعت کو عربوں کے پاس بھیجا۔ ان میں سے ایک شخص کا نام قیس تھا جس کا نسب نامہ ۴۷ پشتوں سے بنی اسرائیل اور ۵۵ واسطوں سے حضرت ابراہیم علیہ اسلام سے جاملتا تھا۔ خالد نے اس جماعت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا۔ حضورؐ نے قیس کا نام عبدالرشید رکھ دیا اور امیر کا لقب عطا فرمایا۔ آپ نے فرمایا کہ عبدالرشید اس لقب کا حقدار ہے کیونکہ یہ سلاطین بنی اسرائیل کی نسل سے تعلق رکھتا ہے۔ افغانوں کی یہ جماعت فتح مکہ کی مہم میں آپؐ کے ہمرکاب تھی۔ فتح مکہ کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ساتھ اہل مدینہ کی ایک جماعت کو خراسان کے کوہستان غور میں اسلام کی تبلیغ کے لئے بھیجا۔ قیس نے واپس آکر اپنی ساری توجہ دعوت و اقامت دین پر لگا دی اور پھر سارے کے سارے لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ قیس عبدالرشید شاوؤل کی اولاد میں سے تھا۔ اور آج بھی کئی افغانی سرداروں کے پاس ایسے نسب نامے موجود ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ لوگ اسباط بنی اسرائیل کی نسل میں سے ہیں۔ افغان ان نسب ناموں پر مکمل اعتماد بھی کرتے ہیں اور انہیں ان نسب ناموں کی سچائی کے بارے میں ذرا سا بھی شک نہیں ہے۔

افغانستان کے قیام اور موجودہ جغرافیائی ہیت کے بارے میں تاریخ زیادہ پرانی نہیں ہے۔ ۱۸۳۸ء تک افغانستان کے نام کا کوئی ملک دنیا کے نقشے پر نہیں تھا۔ مختلف حصوں کے مختلف نام تھے۔ باختر، بلخ، ولایت کابل، ولایت قندھار اور ولایت ہرات وغیرہ۔ کبھی کبھی ان میں سے بعض کو افغانستان بھی قرار دے دیا جاتا تھا لیکن اس کی نہ تو حدود متعین تھیں اور نہ ہی کوئی ایک حکومت تھی۔ مختلف زمانوں میں اس کی مختلف حصے ایرانی اور ہندوستانی حکمرانوں کے تحت ہوتے تھے۔ انگریزوں نے جب مغلیہ سلطنت پر قبضہ کیا تو انہوں نے افغانستان پر بھی مغلیہ بادشاہت کے ایک صوبے کی طرح قبضہ کرنے کی کوشش کی لیکن طویل اینگلو افغان جنگوں کے بعد بالآخر انگریز یہاں

پر قبضہ جمانے میں ناکام ہو کر لوٹ گئے۔ انہیں یہ تسلیم کرنا پڑا کہ افغانستان ہندوستان کا حصہ نہیں بلکہ ایک الگ خطہ زمین ہے۔ انگریزوں نے ۱۸۸۹ء میں سر ہیبزی مارٹر ڈیورنڈ کی سرکردگی میں ایک مشن کابل روانہ کیا تاکہ برطانوی ہند اور کابل کی سرحدات کا تعین کرے۔ اس کمیشن نے افغانستان کی مشرقی اور جنوبی سرحدات کا تعین کیا اور اسی خط کا نام "ڈیورنڈ لائن" ہے جو پاک افغان سرحد بھی کہلاتی ہے۔ یہ لائن کنسر کے پہاڑ سے شروع ہو کر درہ خیبر اور علی مسجد کے پہاڑ ڈکر تک پھیلی ہوئی ہے۔

افغانستان قبل از اسلام بھی مختلف قبائل کی سرزمین تھی جو تہذیب و تمدن میں ہی نہیں بلکہ رنگ و نسل میں بھی مختلف تھے۔ بعد از اسلام بھی ایک تبدیلی کے علاوہ معاملات جوں کے توں ہی رہے اور اب تک ویسے ہی چل رہے ہیں۔ وہ تبدیلی "من الظلمات الی النور" کی تھی یعنی اس سرزمین میں بسنے والے قبائل نے بحیثیتِ مجموعی اسلام کو قبول کیا اور اسی رنگ میں رنگے جانے کی کوشش کی۔ کیونکہ یہ خطہ ارض مادی آسائشوں سے تہی دامن رہا ہے' اس لئے یہاں کے بسنے والے لوگوں نے اپنے اردگرد کے ماحول سے مطابقت پیدا کر کے ہنسی خوشی زندہ رہنے کا فن سیکھ لیا۔ افغان قبائل ان لوگوں کی طرف مائل ہوتے چلے گئے جن سے ان کی قربت تھی۔ یا واقفیت تھی۔ ان کی دنیا اپنا قبیلہ تھی۔ خاندان اس کی ایک اکائی تھا جس سے وہ ایک دوسرے کا چہرہ پہچانا کرتے تھے۔ ان کی وفاداریاں بھی بڑی محدود' یعنی قبیلے تک ہوتی تھیں۔ یہی اندازِ فکر ابھی تک افغان معاشرے میں غالب نظر آتا ہے۔ جدید ریاستوں اور قوموں کی دنیا ایک افغان کے لئے پہلے بھی اجنبی تھی اور اب بھی جدیدیّت وہاں تک نہیں پہنچ سکی۔ اس میں فطرت نے بھی کمال کارکردگی دکھائی ہے۔ دشوار گزار راستے' شدید موسم اور سنگلاخ پہاڑوں نے ماحول میں اس قدر سختی پیدا کر دی ہے کہ "آسان کوشی" کا تصوّر بھی ناممکن ہو گیا ہے۔ بیسویں صدی میں آج بھی وہاں ایسے علاقے موجود ہیں جہاں غیر افغان قبائلی انسان کا پہنچنا محال ہے۔ جدید ٹیکنالوجی کی دستیابی کے باوجود غیر علاقائی آدمی ان دشوار گزار راستوں کو پار کر کے پہاڑوں کے اس پار نہیں پہنچ سکتا' جہاں تک علاقائی قبائلی پہنچ سکتا ہے۔ یہ دشوار گزار راستے اور سربکف پہاڑ صدیوں سے معاشرت کے قدرتی محافظوں کا کردار ادا کرتے چلے آ رہے ہیں۔ یہاں ان پہاڑوں کے بیچ بسنے والے قبائل نے حملہ آور ہونے والوں کو کبھی چین سے نہیں بیٹھنے دیا۔ حملہ آور اگر قدرتی رکاوٹوں کو توڑ کر یہاں تک آن بھی پہنچے تو یہاں کے جفاکش اور جرائت مند قبائل نے انہیں مار بھگایا یہاں کسی بھی "بدیشی" یا "غیر علاقائی" اور "غیر قبائلی" شے کو پسند نہیں کیا جاتا' چاہے وہ مذہب ہو یا تہذیب و ثقافت۔ یہاں کے باشندوں نے صرف اسلام ہی کو من و عن قبول

کیا کیونکہ یہ ان کی شجاع روایات کا امین ہو سکتا تھا۔ حرّیت وغیرت کا سبق دینے کے ساتھ ساتھ مساوات اور انصاف بھی اس کی بنیادی تعلیمات میں شامل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اس کے رنگ کو اپنے اوپر طاری کر لیا اور مکمل طور پر اسی کے ہر رنگ میں رنگتے چلے گئے۔ لیکن اس کے باوجود افغان نسلی 'لسانی اور جسمانی قطع وبرید کے اختلافات پر مشتمل ایک مسلم قوم ہیں۔ کاکسک نسل CAUCASOID RACE کے ایسے لوگ بحیرہ روم کے دونوں طرف جبرالٹر اور تانجیر میں بھی بستے ہیں۔ سفید رنگت والی یہ نسل بحیرہ روم سے ہٹتے ہوئے اناطولیہ اور ایران کے علاوہ جنوبی افغانستان اور شمال مغربی پاکستان تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس فرضی نسل کے بارے میں زیادہ معلومات موجود نہیں ہیں لیکن ان سب میں سفید جلد اور رنگین آنکھیں ایک مشترک قدر ہیں سپین 'سسلی 'یونان 'ترکی 'سرزمینِ عرب کے رہنے والے ہوں یا بھیڑ بکریاں چرانے والا اسرائیلی یہودی افغانستان میں آ کر بظاہر جسمانی طور پر اجنبی محسوس نہیں ہو گا۔ مخصوص قبائلی لباس ' زبان 'اندازِ معاشرت اور مذہب کے اختلاف کی وجہ ہی سے اس کے مخصوص قبیلے یا علاقے کو جانا جا سکتا ہے لیکن بظاہر وہ سب ایک ہی نسل کے دکھائی دیتے ہیں۔ کوہِ ہندوکش 'ہمالیہ اور پامیر کے درمیان موجود یہ سرزمین طویل عرصے تک تہذیبی اور ثقافتی کشمکش کا شکار رہی۔ یہاں بہت سی تہذیبوں کے دنگل ہوئے خارجی و بدیسی تہذیبوں نے یہاں آ کر اپنا رنگ جمانے کی کوششیں کیں۔ ان کی یہ کاوشیں کسی حد تک کامیاب بھی ہوئیں 'ان پر یہاں کی علاقائی تہذیب وتمدن کا رنگ بھی چڑھا اور پھر ہر قوم کی تہذیبی و عسکری یلغار کے بعد جب امن وسکون پیدا ہوا تو معاشرے کا ایک نیا رنگ سامنے آیا۔ تہذیبِ فارس کے علاوہ وسط ایشیائی 'یورپی ہندوستانی 'ترک عرب اور منگول نسلوں نے بھی یہاں اپنا رنگ جمانے کی کوشش کی۔ سائبیریا 'چینی تہذیب نے بھی یہاں کچھ نہ کچھ اپنا رنگ جمانے کی کوشش کی۔ مختلف نسلوں کے جدل نے یہاں عجیب وغریب رنگ پیدا کیا ہے۔

مشرقِ وسطیٰ 'وسط ایشیا اور برِ صغیر پاک وہند کے ساتھ ساتھ مشرقِ بعید اور چینی سنکیانگ کے سنگم پر واقعہ یہ علاقہ تہذیبی وثقافتی میل جول کا ایک عجیب وغریب نقشہ پیش کرتا ہے۔ یہاں سے ملنے والے گیارہ ہزار برس قبل کے آثارِ قدیمہ کی زبانی یہ پتہ چلا ہے کہ دریائے نیل اور دریائے فرات کے کنارے پھلنے پھُولنے والی تہذیبوں کے ساتھ ساتھ دریائے سندھ کے کنارے پروان چڑھنے والی تہذیب بھی یہاں کی تہذیب سے پرانی نہیں ہے۔ معلوم افغان تہذیب ۳۵۰۰ سال پرانی ہے۔

افغانستان کے تہذیبی ارتقاء میں سکندر اعظم کی اس علاقے میں مہم جُوئی کو ایک خاص مقام

حاصل ہے چوتھی صدی قبل مسیح میں سکندرِ اعظم کے یہاں داخلے کے ساتھ ہی وسط ایشیا، چین، کوریا اور پھر شاہراہ ریشم کے ذریعے جاپان وغیرہ سے بھی رابطے قائم ہونا شروع ہوگئے قدیم کیتھے (چین) سلطنت اور رومی سلطنت کے ساتھ بھی تعلقات استوار ہونا شروع ہوگئے تھے بدھ آرٹسٹوں نے یونانی خدا 'اپالو کی طرز پر مہاتما بدھ کے بت بنانے شروع کر دیے تھے اس طرح مختلف تہذیبوں کی کھچڑی سی پکنی شروع ہو گئی تھی۔ ایشیا کی بڑی بڑی تہذیبوں کے قیام میں "پانی کی موجودگی اور استعمال" نے اہم کردار ادا کیا ان تہذیبوں کی بنیاد زراعت اور اس سے متعلقہ امور ہوا کرتے تھے اس وقت ان قدیم تہذیبوں کا نقشہ دیکھنا ہو تو افغانستان میں موجود قبائلی اور نسلی تہذیب کا مطالعہ کر لیجئے وہی قدیم اندازِ معاشرت ہر جگہ دکھائی دے گا۔ یہاں قبائلی نظامِ زندگی کا غلبہ ہے لوگوں کی وفاداریاں قبائلی و علاقائی ہیں غیر ملکی حملہ آوروں کے خلاف لڑی جانے والی حرّیت کی جنگیں بھی اسی انداز میں لڑی گئیں افغانوں کا اندازِ فکر بھی داخلی (INWARD) ہے وہ اردگرد اور بیرونی جانب (OUTWARD) دیکھنے کی بجائے اپنے معاملات پر توجّہ دینا زیادہ اہم سمجھتے ہیں افغانستان کی موجودہ تحریک آزادی کو لیجئے۔ نادر شاہی اور ظاہر شاہی نظام کے خاتمے کے بعد بھی سردار داؤد اور پھر نور محمد ترکئی و حفیظ اللہ امین تک افغانوں کا اندازِ فکر داخلی رہا۔ ببرک کارمل کے دورِ حکومت میں روسی افواج کے داخلے کے بعد افغانوں نے جس انداز میں تحریکِ مزاحمت کا آغاز کیا وہ بھی قبائلی و گوریلا طرز کی تھی لیکن آٹھ سالہ تحریک کے دوران انہوں نے جس بے باکی اور فقید المثال جرأت کا مظاہرہ کیا وہ رواں صدی کا ایک محیّر العقول کارنامہ ہے۔ دنیا کی عظیم الشّان سپر طاقت کو ناکوں چنے چبوانا افغانوں ہی کا کام تھا اس وقت پوری دنیا سوویت یونین کے خاتمے پر بغلیں بجا رہی ہے۔ امریکہ نیو ورلڈ آرڈر کا ڈنکا بجا رہا ہے۔ مغربی دنیا کمیونزم کے انہدام پر جھوم رہی ہے۔ لیکن اس کارنامے کے حقیقی خالق "افغان" ابھی تک کابل پر ہی نظریں جمائے ہوئے ہیں۔ انہیں شاید روسی افواج کی شکست کے عالمی اثرات کا علم نہیں ہے یا وہ اسے اہم نہیں سمجھتے۔ بلکہ اپنے فطری داخلی اندازِ فکر کی بدولت اپنی نظریں اپنے ملک پر ہی جمائے بیٹھے ہیں انہیں اس بات سے غرض نہیں ہے کہ ان کے عسکری کارنامے کی بدولت دنیا کی عظیم سپر طاقت نہ صرف شکست سے دوچار ہوئی بلکہ پھر ایک عظیم الشان سلطنت کا خاتمہ بھی ہو گیا۔ انہیں صرف اپنے داخلی معاملات سلجھانے کی فکر ہے۔ ساتویں صدی عیسوی کے وسط میں شمع اسلام کی روشنی یہاں پہنچی اور اب تک جدید افغانستان کے سیاسی، ثقافتی اور تہذیبی معاملات میں ایک اہم کردار ادا کر رہی ہے۔ روایتی طور پر یہاں بہت سی سلطنتیں قائم ہوئیں کئی اقوام کی افواج یہاں اپنا رنگ نہ جما سکیں اور جیسے آئی تھیں ویسے ہی چلی گئیں لیکن کچھ نے یہاں اپنا رنگ جمانے کی

کوشش بھی کی۔

افغانستان میں کئی داخلی سلطنتیں بھی قائم ہوئیں۔ ان میں سب سے اہم ''عظیم غزنوی بادشاہت'' کا قیام ہے، جو دسویں تا بارھویں صدی عیسوی تک قائم رہی۔ اس دور میں افغانوں نے نہ صرف عسکری کامیابیاں حاصل کیں بلکہ ثقافتی میدان میں بھی گراں بہا کارنامے سرانجام دیے لیکن قانونِ فطرت کے مطابق جوں جوں فتوحات بڑھتی گئیں اور سلطنت کی عمر طویل ہوتی گئی داخلی اضمحلال نے سر اٹھانا شروع کر دیا۔ قبائلی ولسانی تفرقات نے سیاسی انتشار کو فروغ دینا شروع کر دیا جس کے نتیجے میں طاقتور خارجی عوامل کو ایک بار پھر یہاں عمل دخل کا موقع ملا۔ تیرھویں اور چودھویں صدی عیسوی میں یہاں منگولوں کی مہمات اسی تناظر میں دیکھنی چاہئیں جنھوں نے یہاں کے طویل مدّت سے قائم تہذیبی وسیاسی نظام کو تہس نہس کر دیا۔ پھر علاقائی جنگیں شروع ہو گئیں شاہراہِ ریشم پر ہونے والی تجارت الٹ پلٹ گئی تو سارے تاجروں نے نئے تجارتی راستوں کی تلاش شروع کر دی۔ پرتگالی، فرانسیسی اور برطانوی ملاحوں اور سیاحوں نے یہاں نئے تجارتی راستے تلاش کیے۔ مشرق کی طرف آنے والے نئے بحری راستوں کی تلاش نے یہاں جدّت کے ساتھ ساتھ استحصال اور نئی دنیا کے قیام کے مواقع بھی پیدا کیے۔ اس علاقے میں برطانوی اور زار شاہی مفادات کی کشمکش کا آغاز ہوا جس نے جغرافیائی تبدیلیاں بھی پیدا کیں۔ فارس کے صفوی اور ہندوستان کے مغلوں نے اس علاقے پر اپنا اپنا تسلّط قائم کرنے کی کوششیں کیں۔ سولھویں سترھویں صدی عیسوی میں ان طاقتوں (صفوی اور مغل) کے درمیان افغانستان پر قبضے کے لئے جنگیں بھی ہوئیں لیکن افغانوں نے دونوں کو یہاں پر پرزے نہیں نکالنے دیے اور آخر کار دونوں قوموں کو یہاں سے بوریا بستر گول کرنا پڑا۔

بالآخر ۱۷۴۷ء میں آخری عظیم افغان سلطنت کو قندھار کے بادشاہ احمد شاہ درانی کی زیرِ قیادت عروج نصیب ہوا افغان تاریخ میں افغانوں کی یہ آخری عظیم سلطنت تھی جس نے تاریخ میں ان مٹ نقوش مرتب کیے۔ افغانوں کی قبائلی فطرت کے مطابق احمد شاہ درانی نے فتح ونصرت کی داستانیں رقم کیں منتشر قبائل کو اکٹھا کیا یہ اتحاد زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا قبائلی اور لسانی عصبیّتوں نے سر اٹھانا شروع کر دیا انیسویں صدی میں یورپی سامراجی طاقتوں نے یہاں دخل اندازی شروع کر دی۔ زار شاہی اثرات کے خطرے کے پیشِ نظر برطانوی افواج نے ۱۸۳۹ء اور ۱۸۷۸ء میں دوبار افغانستان پر فوج کشی کی لیکن یہ بات ابھی تک طے نہیں ہو سکی کہ کیا واقعی برطانوی ہند کو روس کے زار شاہی سامراج سے کسی قسم کا خطرہ درپیش تھا یا یہ برطانوی مہم جُو فطرت کا کارنامہ تھا کہ انھوں نے دوبار اپنی افواج افغانستان میں داخل کیں زار شاہی افواج وسط

ایشیائی مسلم ریاستوں پر تو قبضے کر رہی تھیں لیکن کیا وہ افغانستان پر بھی قبضہ کرنے کا پروگرام رکھتے تھے یا نہیں؟ اس بارے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ زار شاہی افواج کئی ایک ایسے علاقوں پر بھی فوج کشی کر رہی تھیں جن پر افغان امراً (حاکموں) کا دعویٰ تھا انگریزوں نے افغانستان کی درمیانی حیثیّت ختم ہوتے دیکھی تو آگے بڑھ کر اس پر قابض ہونے کا منصوبہ بنایا اور اسی منصوبے کے تحت افغانستان پر فوج کشی بھی کی انہیں افغانسان پر قدم جمانے کا موقع تو نہ مل سکا لیکن افغانستان کی سرحدیں دریائے آمو تک چلی گئیں اور اس کی "درمیانی حیثیّت" ایک بار پھر قائم ہو گئی۔ برطانوی اور زار شاہی سلطنتیں ایک دوسرے سے دور ہو گئیں۔ جب ۲۷ر دسمبر ۱۹۷۹ء میں کمیونسٹ روسیوں نے افغانستان کی اس "درمیانی حیثیّت" کو ختم کرنے کے لئے اپنی افواج یہاں افغانستان میں داخل کیں تو پوری دنیا میں جیسے ایک زلزلہ آ گیا۔ (اس کے اثرات کے متعلق بحث یہاں مطلوب نہیں ہے) مشرقی و مغربی دنیا میں اضطراب کی ایک شدید لہر دوڑ گئی۔

جدید افغانستان کی تاریخ امیر عبدالرحمٰن خان (۱۹۰۱ء۔ ۱۸۸۰ء) کے دورِ حکومت کے ساتھ شروع ہوتی ہے۔ اس دور میں برطانوی اور روسی استعماری طاقتوں نے افغانستان کی سرحدیں قائم کرنے کی کوششیں کیں۔ امیر عبدالرحمٰن نے اپنا دائرہ اثر ان سرحدوں کے اندر اور باہر بسنے والے لسانی قبائل تک بڑھانے کی کوشش کی۔ اس طرح "داخلی استعمار" کو مضبوط بنانے کی پالیسی اختیار کی گئی۔ امیر عبدالرحمٰن افغانستان کو ایک جدید ریاست کی شکل دینا چاہتے تھے۔ ایک مضبوط مملکت کا قیام ان کے پیش نظر تھا۔ ۱۸۸۰ء سے پہلے تک افغانستان کے لوگ اپنے علاقوں کو کابلستان (ہندوکش کے جنوب سے لے کر دریائے سندھ تک) زابلستان (خراسان بشمول ہندوکش، قندھار اور ہرات) اور ترکستان (ہندوکش کے شمال اور ہرات کے مشرق پر مشتمل) کے نام سے پکارا کرتے تھے۔ اجتماعیّت کا کوئی نظام موجود نہیں تھا۔ عبدالرحمٰن خان نے قبائل کو اجتماعیت کی شکل دینے کی کوشش کی اس لئے اسے جدید افغانستان کا بانی کہا جاتا ہے۔ لیکن بہت سے افغان تاریخ نویس احمد شاہ درانی کو جدید افغانستان کا بانی تصوّر کرتے ہیں جس نے ۱۷۴۷ء میں ایک سلطنت قائم کی لیکن یہ سلطنت افغانوں کی قومی سلطنت نہیں کہلا سکتی کیونکہ اس میں مختلف قبائل شامل تو ضرور تھے لیکن انہوں نے وہ یکجہتی اختیار نہیں کی تھی جو کسی قومی سلطنت کے قیام کے لئے ضروری تھی ۱۸۸۰ء سے پہلے تک افغانستان میں سیاسی اتحاد و ملاپ ہوتے رہے۔ کبھی کوئی جنگجو بہادر قبائلی سردار منظر پر ابھرتا۔ بہادری، سازش اور طاقت کے ساتھ ساتھ دیگر قبائل سے شادی ناطے قائم کر کے ایک اتحاد قائم کر لیتا جو آہستہ آہستہ ایک

کنفیڈریشن کی شکل اختیار کر لیتا جو ایک خاص حد تک پھیلتا رہتا اور پھر ایک سلطنت کی شکل اختیار کر لیتا جس پر کسی خاص قبائلی سردار یا رہنما کی چھاپ ہوتی۔ اس سردار یا بادشاہ کے انتقال کے بعد اسی طرح کی کنفیڈریشن دوبارہ قائم ہوتی اور اس پر اسی قبیلے یا کسی اور قبیلے کی قیادت غالب ہوتی اس طرح سلطنتیں بنتی اور بگڑتی رہیں۔ انہیں حقیقی معنوں میں سلطنت نہیں کہا جا سکتا ہے۔ احمد شاہ درانی نے بھی ۱۷۴۷ء میں ایسی ہی ایک سلطنت قائم کی جسے افغانوں کی قومی سلطنت کی بجائے درانی سلطنت کہنا زیادہ بہتر ہے۔ احمد شاہ درانی کی زندگی ہی میں حکمران قبیلے میں شخصی اقتدار کے حصول کے لئے سازشیں شروع ہو گئی تھیں احمد شاہ درانی کے انتقال کے بعد حکمران قبیلے کی مختلف شاخوں کے سرکردہ لیڈروں نے حصولِ اقتدار کی جدوجہد تیز کر دی تھی۔ یہ لڑائیاں بیسویں صدی تک جاری رہیں حتّیٰ کہ عبدالرحمٰن خان جیسی سرکردہ شخصیّت منظر پر طلوع ہوئی اور اس نے آگے بڑھ کر ایک حقیقی افغان سلطنت قائم کر دی۔ قریب تھا کہ عبدالرحمٰن خان وسط ایشیا بر صغیر اور فارس تک اپنے اثرات کو پھیلا لیتا لیکن برطانوی اور روسی سامراج نے عبدالرحمٰن خان کی سلطنت کو پھیلنے سے روک دیا یورپی سامراج نے آگے بڑھ کر علاقے میں اپنے اثرات کو حتمی طور پر پھیلا دیا اس طرح عظیم افغان سلطنت کے اثرات ہندوکش کے اس پار اور دریائے آمو سے آگے نہ بڑھ سکے برطانیہ نے روسیوں کے ساتھ مل کر سازشی انداز میں افغانستان کے خارجہ امور پر کنٹرول حاصل کیا۔ افغان اپنے روایتی داخلی اندازِ فکر کے سبب ان سازشوں سے عہدہ بر آ نہ ہو سکے۔ حتّیٰ کہ تیسری اینگلو۔ افغان جنگ کے بعد ۱۹۱۹ء میں افغانوں کو اپنے خارجی امور طے کرنے کا حق حاصل ہو سکا اور وہ حقیقی معنوں میں غیر ملکی مداخلت سے آزاد ہوئے۔ تو پھر دوسری جنگِ عظیم کے بعد جب نئی عالمی طاقتوں کا ظہور ہوا اور دور دراز واقع مملکتوں کی اہمیّت بڑھنے لگی۔ مغربی طاقتوں اور اشتراکی روس کے درمیان بڑھتی ہوئی چپقلش نے افغانستان کی اہمیّت میں اضافہ کر دیا۔ افغانستان کی سیاسی و عسکری تاریخ کا مطالعہ کرتے وقت اس بات کا خاص خیال رکھنا چاہئے کہ افغانستان کی منفرد جغرافیائی حیثیّت کے علاوہ اس کی اپنی ایک تہذیبی و ثقافتی انفرادیّت بھی ہے جو اسے عالمی سیاست میں ایک خاص مقام دلاتی ہے دورِ حاضر کی ترقی پذیر اقوام کا مطالعہ کرتے وقت جو پیمانے مقرر کئے جاتے ہیں ان کا اطلاق افغانستان کی تاریخ و تہذیب پر نہیں کیا جا سکتا ہے افغانستان سے روسی افواج کے انخلاء کے بعد اقوامِ متحدہ کے نمائندوں اور دیگر اسلامی ممالک نے مل جل کر افغانستان میں قیامِ امن کے لئے جو کوششیں شروع کر رکھی ہیں ان کے بار آور نہ ہونے کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ یہاں قیامِ امن کے خواہش مند جدید انداز میں ""مصالحت"" اور ""مفاہمت"" کی کوششیں کر رہے ہیں انہیں افغان سوسائٹی کی مسلّمہ اقدار کے بارے میں علم

نہیں ہے افغان سوسائٹی میں پائی جانے والی ''اتحاد'' اور ''افتراق'' کی قوتوں کے بارے میں بھی انہیں زیادہ علم نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ روسی افواج کے انخلاء کے بعد تین سال گزرنے کے باوجود ابھی تک وہاں امن قائم نہیں ہو سکا بلکہ دن بدن خانہ جنگی کے امکانات بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ افغانستان جو اسلام کی دولت ملنے کے بعد کبھی بھی مذہبی بنیادوں پر تقسیم نہیں ہوا تھا آج مذہبی فرقہ واریّت کی بنیاد پر بھی منقسم دکھائی دے رہا ہے۔ روسی افواج کی آمد کے بعد شروع ہونے والے جہاد میں عربوں کی شمولیّت نے یہاں کے افغان معاشرے میں ''اتحاد'' اور ''افتراق'' کی نئی جہتیں بھی پیدا کر دی ہیں جن پر مصالحت کنندگان کی نظر نہیں ہے۔

افغانستان میں بڑی بڑی تبدیلیاں رونما ہوتی رہی ہیں۔ افتراق واتحاد کی قوتیں بار بار سر اٹھاتی رہی ہیں لیکن افغان معاشرے کی قبائلی ہیئت میں زیادہ تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ یہاں حملہ آور آتے رہے ہیں۔ کچھ نے افغانستان کو تاراج کیا اور اسے آتش وخون کے سیلاب میں غرق کر کے آگے بڑھ گئے کچھ نے یہاں محض خونی نقوش چھوڑے کچھ مقامی آبادی میں گھل مل گئے کچھ وقتی طور پر آئے اور پھر واپس چلے گئے افغانستان میں اس وقت ۱۲۱ سے زائد قبیلے اور قومیتیں پائی جاتی ہیں جن میں ۲۱ بڑے نسلی گروہ بھی شامل ہیں ہر قبیلہ اور ہر گروہ اپنی جگہ پر ایک مستقل اکائی ہے۔ اس سرزمین نے کئی تہذیبوں کے عروج وزوال کا نظارہ بھی کیا ہے۔ سکندرِ اعظم کی فوج کے ساتھ آنے والے قبائل کی باقیات بھی یہاں دیکھی جا سکتی ہیں۔ کچھ قدیم عرب قبائل بھی یہاں آباد ہیں سکھوں وہندوؤں کی قلیل آبادی بھی یہاں دیکھی جا سکتی ہے۔ حتیٰ کہ بنی اسرائیل کے ایک گمشدہ قبیلے کے متعلق جدید تحقیق کے مطابق یہ کہا جاتا ہے کہ وہ یہاں آباد ہے۔ امان اللہ کے دورِ حکومت میں افغان لڑکیوں کو ترکی میں تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے بھیجنے کی بنیاد پر شنواری قبیلہ ناراض ہو گیا تھا جو ہندوستان کی سرحد کے قریب کوہِ سفید کے خان گوہر علاقے میں رہتا تھا۔ یہ لوگ سرکش اور لٹیرے تھے یہاں سے گزرنے والے کاروانوں کو لُوٹ لیا کرتے تھے یہی ان کی گزر بسر کا ذریعہ بھی تھا۔ اسی قبیلے کے متعلق مشہور ہے کہ یہ بنی اسرائیل کا گمشدہ قبیلہ ہے اس پر اسرائیلی حکّام کسی دور میں تحقیقاتی مشن بھی یہاں بھجوا چکے ہیں اس کے نتائج کیا نکلے اس کے بارے میں زیادہ معلومات منظرِ عام پر نہیں ہیں۔ ۱۹۸۳ء میں بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی میں حصولِ تعلیم کے دوران بلوچستان کا مطالعاتی دورہ کرنے کا موقع ملا تو شعبہ ارضیات بلوچستان یونیورسٹی میں ایک پروفیسر سے ملنے کا موقع ملا جو اردو اور انگریزی دونوں زبانیں فرفر بولتا تھا۔ اس نے ہم سے اسلامی نظام کے متعلق ایسے ایسے سوال کئے کہ ہم ''ارضیات کے پروفیسر'' کی اسلام کے متعلق معلومات پر حیران رہ گئے مولانا مودودیؒ کی اسلامی تشریحات کے متعلق پروفیسر صاحب

نے بڑے عالمانہ وناقدانہ سوالات کیئے ہم بلوچستان یونیورسٹی سے حیران وسرگرداں نکلے وہ سوالات کسی روایتی کیمونسٹ کے نہیں بلکہ کسی مستشرق کے لگ رہے تھے اس وقت ہمیں اتنا علم نہیں تھا اس لئے اس سے زیادہ جوابی سوالات نہ کر سکے چند سال بعد اخبار میں ایک چھوٹی سی خبر پڑھی "بلوچستان یونیورسٹی شعبہ ارضیات کا ایک پروفیسر پُراسرار طور پر غائب ہو گیا" تفصیلات میں درج تھا کہ موصوف عرصہ بائیس سال سے یہاں تعلیم وتدریس میں مصروف تھے اور مذہباً یہودی الاصل تھے" یہودیوں کے اس علاقے میں سیاسی مفادات بھی ہونگے لیکن "گمشدہ قبیلے" کی بازیابی ان کے لئے کتنی اہم ہے کہ اس مقصد کے لئے وہ پہلے بھی ایک مشن افغانستان بھیج چکے ہیں۔ اس لئے ان پروفیسر صاحب کی یہاں طویل عرصے موجودگی بھی شاید اسی "تحقیق" کے سلسلے کی ایک کڑی ہوگی۔ افغانستان میں غیر مسلم کے لئے اس قدر آزادی سے تحقیقی کام کرنا آسان نہیں ٗاس لئے انہوں نے یہاں پاکستان کو مرکز بنا کر اپنی تحقیق جاری رکھنے کو ترجیح دی ہو گی۔ بہرحال اس واقعہ کو یہاں بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ یہاں کی تہذیب وتمدن کی قدامت کے متعلق بیان کیا جاسکے۔

افغانستان نہ تو لسانی اعتبار سے 'ایک اکائی ہے اور نہ ہی تہذیبی وثقافتی اعتبار سے یہاں ایک قوم بستی ہے۔ چند ایک قبائل فطری اعتبار سے یکساں ہیں لیکن اس کے باوجود وہ اپنا تشخص برقرار رکھنے پر بضد ہیں اور اپنے مخصوص ناموں پر اصرار بھی کرتے ہیں مثلاً اس خطے میں بسنے والے تمام پشتونوں کا ارتقاء فطری اور یکساں ہے لیکن تمام پشتون افغانی نہیں ہیں بلکہ بہت سے پشتون پاکستان کے شمال مغربی سرحدی صوبے اور قبائلی ایجنسیوں کے علاقے میں بھی بستے ہیں۔ تاجک 'ازبک' ترکمان اور کرغیز قبائل کی وسط ایشیاء میں اپنی ریاستیں بھی ہیں۔ مغربی افغانستان کے انتہائی علاقوں میں بسنے والے فارسی دان بنیادی طور پر ایرانی سرسبز میدانوں میں بسنے والے قبائل سے تعلق رکھتے ہیں۔ فارسی زبان بولتے ہیں جو ایران میں بھی بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ ان کی تہذیب وثقافت بھی ایرانی قبائل سے ملتی جلتی ہے۔ اس طرح بلوچ نہ صرف ' مغربی افغانستان کے جنوب مغرب میں بستے ہیں بلکہ پاکستان کے شمال مغرب اور ایران کے جنوب مشرق میں بھی بستے ہیں حتّٰی کہ بلوچوں کے بڑے بڑے گروہ وسط ایشیائی ریاست ترکمانستان (سابق سوویت یونین کی ایک ریاست) میں بھی بستے ہیں اسی طرح براہوئی (BRAHUI) بھی پھیلے ہوئے ہیں نورستانی ' کوہستانی اور گجر بھی پاکستانی چترال اور مشرقی افغانستان میں بستے ہیں کوہستانی گڈریئے بھی انہیں علاقوں میں سکونت پذیر ہیں۔ یہ لوگ موسموں میں تبدیلی کے ساتھ ساتھ اِدھر سے اُدھر منتقل ہوتے رہتے ہیں پاکستانی چترال میں تقریباً تین ہزار " کافر" بھی بستے ہیں

ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ سکندرِ اعظم کی فوج میں شامل تھے کہ بس یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ ان کے نین نقش بھی یونانیوں سے ملتے جلتے ہیں۔ واخی۔ پامیری گروہ نہ صرف پاکستانی پہاڑوں میں بستے ہیں بلکہ مشرقی ایران میں بسنے والے بربری قبائل کا تعلق بھی انہی سے ہے۔ اور غالبًا یہ سب گروہ ایمک یا ہزارہ نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔

پشتون ' تاجک ' بلوچ ' اور نورستانیوں کا تعلق کاکسائیڈ (CAUCASOID) نسل سے ہے جبکہ ہزارہ ایمک ' ترکمان ' ازبک اور کرغیز قبائل منگول نسل سے ہیں جبکہ کچھ قبائل آسٹریلوی قبائل سے بھی مشابہت رکھتے ہیں۔

افغانستان میں بسنے والے کچھ قبائل کے ہم نسل و اصل گروہ نہ صرف پاکستان میں بستے ہیں بلکہ ایران اور وسط ایشیائی ریاستوں میں بھی بستے ہیں موجودہ جغرافیائی تقسیم کے علی الرغم یہ گروہ اپنے ہم نسل و ہم زبان قبائل کے پاس سرحدوں کے آرپار آتے جاتے رہتے ہیں ان کی وفاداریاں اپنے قبائل سے زیادہ مستحکم ہوتی ہیں قبائل فیصلے کرتے وقت ہی نہیں بلکہ انہیں قبول کرتے وقت جغرافیائی حدبندیاں نہیں بلکہ اپنی قبائلی وفاداریاں دیکھتے ہیں مسئلہ افغانستان کے حل کی پیچیدگی کی ایک بڑی وجہ بھی یہ ہے مصالحت کنندہ پارٹیاں اس قبائلی و گروہی سیاست کے اسرار و رُموز سے واقف نہیں ہیں۔ افغان رہنماؤں سے معاملات کرتے وقت اس قبائلی و گروہی تقسیم پر گہری نظر رکھنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا افغانوں کی تاریخ پر۔

پشتون

افغانستان میں بسنے والا سب سے بڑا گروہ پشتونوں کا ہے افغانستان میں ان کی مجموعی تعداد ۶۵ لاکھ کے قریب ہے جو پشتو زبان بولتے۔ ان کی ظاہری ساخت بحیرہ روم کے قریب بسنے والے کاکسک قبائل سے ملتی جلتی ہے تقریباً اتنے ہی پشتون پاکستان میں بھی بستے ہیں پشتونوں کی اکثریّت مسلم اور حنفی مسلک سے تعلق رکھتی ہے پشتونوں کی ایک بہت قلیل تعداد طوری (شیعہ) مسلک سے بھی تعلق رکھتی ہے۔

تاجک

یہ لوگ افغانستان کے علاوہ پاکستان ' ایران اور وسط ایشیا کی مسلم ریاست تاجکستان میں بھی بستے ہیں ۳۵ لاکھ تاجک شمالی افغانستان کے شمال مشرقی علاقوں میں بستے ہیں یہ لوگ عموماً اپنے

آپ کو اسی وادی یا علاقے کے حوالے سے پکارتے ہیں جہاں سکونت پذیر ہوں جہاں کسی اور نسل کے لوگ اکثریت میں ہوں وہاں یہ لوگ اپنے آپ کو صرف "تاجک" ہی کہلوانا پسند کرتے ہیں پرانی فارسی میں تاجک سے مراد "عرب" ہے۔ بنیادی طور پر تاجکوں کی ساخت پرداخت بحیرہ روم کے کنارے بسنے والے قبائل سے ملتی جلتی ہے۔ اور ہم جوں جوں جنوب سے شمال کی طرف آگے بڑھتے چلے جائیں منگولین خصوصیات زیادہ سے زیادہ واضح ہوتی چلی جاتی ہیں۔ افغانستان میں بسنے والے تاجکوں کے ثقافتی وتہذیبی رابطے زیادہ تر تاجکستان کے مسلمانوں سے ہیں جمعیت اسلامی کے سربراہ پروفیسر برہان الدین ربانی کا تعلق تاجک قبیلے سے ہے۔ یہی وجہ کہ روسیوں سے براہِ راست معاملات طے کرتے وقت جو سرعت پروفیسر ربانی نے دکھائی وہ کوئی اور افغان لیڈر نہیں دکھا سکا اس کی وجہ پروفیسر ربانی کے سابق روسی ریاست "تاجکستان کے لوگوں" سے تعلقات بھی ہیں جو کہ قبائلی یکسانیّت کے باعث بہت جلد اور آسانی سے قائم ہو گئے تھے۔ بہت سے تاجک کابل میں ملازمت کرنے کے لئے بھی آتے ہیں لیکن اپنی جڑیں اپنے دیہاتوں میں ہی رکھتے ہیں شہر میں صرف روپیہ پیسہ کمانے کے لئے آتے ہیں اور زائد روپے سے زمین خرید لیتے ہیں کچھ تاجک ٹرک بسیں بھی خرید کر معاش کا بندوبست کرتے ہیں۔

ازبک

شمالی افغانستان میں اس قبیلے کے بسنے والے دس لاکھ کے قریب افراد ازبکی یا جگاتانی زبان بولتے ہیں جس کا انداز ترکی زبان جیسا ہے ازبکی لوگ اپنے آپ کو پرانے قبائلی ناموں، حراکی، کاکی، منگت، منگ، شیش کارا' اور تیموس سے پہچان کروانا پسند کرتے ہیں ان کا بنیادی جسمانی انداز و ساخت منگولوں سے بھی ملتی جلتی ہے لیکن ان میں بحیرہ روم کے قریب بسنے والے قبائل کی مشابہت بھی پائی جاتی ہے۔ ازبکی حنفی، سنی اور باعمل مسلمان ہیں۔ پیشے کے اعتبار سے ازبکوں کی اکثریت کاشتکار ہے۔

فارسی وان

ان کا تعلق امامیہ شیعہ فرقے سے ہے افغانستان میں ان کی مجموعی تعداد چھ لاکھ کے قریب ہے یہ سب زراعت پیشہ ہیں ہرات، قندھار، غزنی اور جنوب مغربی افغان سرحدوں کے علاوہ ایرانی سرحد کے قریب بستے ہیں۔ ادبی لٹریچر میں انہیں غلطی سے تاجک بھی لکھ دیا جاتا ہے۔

جسمانی ساخت کے اعتبار سے یہ بحیرہ روم کے ذیلی قبائل سے ملتے جُلتے ہیں۔ ان کی قومی زبان دری ہے۔

قزلباش

دری بولنے والے اس قبیلے کا تعلق بھی امامیہ شیعہ فرقے سے ہے یہ شہری نژاد گروپ تقریباً پورے افغانستان میں پھیلا ہوا ہے۔ اٹھارھویں صدی میں نادر شاہ افشار نے جب افغانستان پر حملہ کیا تو اپنے ساتھ مختلف قبائل کے گروہ بھی لایا تھا جب وہ افغانستان سے نکلا تو پیچھے کئی انتظامی اور عسکری امور کے ماہرین چھوڑ گیا قزلباش انہی ماہرین کی اولاد ہیں افغانستان میں بہت سے اہم پیشہ وارانہ اور انتظامی عہدوں پر یہی قزلباش فائز ہیں اور احسن انداز میں امورِ مملکت چلا رہے ہیں بیوروکریسی میں بھی ان کا غلبہ ہے افغان معاشرے کے پڑھے لکھے لوگوں میں قزلباشوں کا شمار صفِ اوّل کے گروہوں میں ہوتا ہے۔ اپنے آپ کو سنی مسلمانوں میں چھپائے رکھنے کے لئے کچھ قزلباش ""تقیہ"" کرتے ہیں شیعہ مذہب میں وقتی طور پر باوقتی مصلحت کے تحت اپنی اصلیت چھپانے کو ""تقیہ"" کہتے ہیں افغان معاشرے میں شیعہ مذہب کی زیادہ پذیرائی نہیں ہے اور اس اختلاف کو چھپانے کے لئے قزلباش 'جو اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز ہیں' اپنا مذہب چھپائے رکھتے ہیں۔ تاکہ انہیں معاشرتی رکاوٹوں کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ ان کے ظاہری خدوخال میدانی علاقوں میں بسنے والے قبائل سے ملتے جُلتے ہیں۔

ہزارہ

ہزارگی زبان دری انداز میں بولنے والے قبائل کا یہ گروہ ۱۲۲۹ء۔ ۱۴۴۷ء سن عیسوی میں افغانستان پہنچا جہاں ان کی مجموعی تعداد تقریباً ۹ لاکھ کے قریب ہے۔ ان کا تعلق چنگیز خان سے بیان کیا جاتا ہے عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ ہزارہ جات چنگیز خان کی افواج کے باقیات میں سے ہیں لیکن تاریخی تحقیق کے نتیجے میں یہ بات غلط ثابت ہو چکی ہے۔ ان کی جسمانی ساخت منگول قبائل سے ملتی جُلتی ہے۔ ان میں اسماعیلی شیعہ اور امامیہ شیعہ کے علاوہ کچھ معقول تعداد سنیوں کی بھی پائی جاتی ہے۔



ایمک

(AIMIQ) ترک الفاظ کی کثرت پر مشتمل دری زبان بولنے والے ایمک قبائل کا یہ گروہ حنفی سنی مسلک رکھتا ہے افغانستان میں ان کی تعداد ۸لاکھ کے قریب ہے۔ انہیں "چہار" یعنی چار بھی کہا جاتا ہے جو غلط ہے کیونکہ یہ لوگ خود اپنے لئے یہ لفظ کبھی استعمال نہیں کرتے۔ یہ اپنے آپ کو قبائلی القابات سے پکارتے ہیں۔ اور اس پر خوشی محسوس کرتے ہیں کچھ ایمک ایران کی طرف بھی چلے جاتے ہیں اور وقتاً فوقتاً افغانستان و ایران کی طرف آتے جاتے رہتے ہیں۔

مغل

حنفی سنی مسلمانوں کا یہ قبیلہ غور میں بستا ہے۔ اسی قبیلے کے چند ہزار افراد وسطی اور شمالی افغانستان میں بھی بکھرے ہوئے ہیں۔ تقریباً ڈیڑھ صدی پہلے اس قبیلے میں ایک جھگڑا ہوا تھا جس کی وجہ سے کچھ لوگوں کو غور سے نکال دیا گیا تھا اور پھر یہ لوگ وسطی و شمالی افغانستان میں جا بسے۔ بہت سے مغل "دائز" بولتے ہیں جس میں منگولین الفاظ کی کثرت ہے۔ پرانے مرد اور عورتیں اب بھی "مگولی" کو ہی قبیلے کی مادری زبان قرار دیتے ہیں۔ جنوبی افغانستان میں بسنے والے مغل پشتو زبان بھی بولتے ہیں۔ مغل شاید چنگیز خان کی اولاد ہوں لیکن اس بارے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا ہے۔ ان کی آنکھیں نیلی اور بال گھنگھریالے اور سرخی مائل ہوتے ہیں۔

ترکمان

سوالاکھ کے قریب ترکمان شمالی افغانستان میں بستے ہیں یہ سارے حنفی سنی مسلمان ہیں اپنے پیشے کے اعتبار سے یہ جگہ بھی بدلتے رہتے ہیں کچھ لوگ ایک جگہ بس جاتے ہیں لیکن کچھ خانہ بدوشی کی زندگی گزارنا پسند کرتے ہیں۔ ۱۹۲۰ء میں جب بالشویکوں کے خلاف باسمچی تحریک نے انقلابی سرگرمیاں شروع کیں تو یہی قبیلہ یہاں قراقل بھیڑ (فارسی بھیڑ) اور ترکمانی قالین کی صنعت افغانستان میں لایا۔ اس قبیلے میں تیکے (TEKKE) یومڈ' طارق لکائی (ہرات میں بستے ہیں) ۔ ارساری (اک چاہ کے علاقے میں بستے ہیں) ساروق 'چکرا (اندخوئی) سالور (میمانا میں بستے ہیں) ۔ ماوری (دولت آباد بستے ہیں) جیسے گروہ زیادہ مصروف ہیں۔ ترکمانوں کی جسمانی ساخت منگولوں سے ملتی جلتی ہے۔



کرغیز

افغانستان کے پامیر پہاڑوں میں بسنے والا یہ قبیلہ بھی منگول نسل سے تعلق رکھتا ہے ان کی تعداد کچھ ہزار ہے یہ لوگ کیچک ترکی زبان بولتے ہیں اور حنفی سُنّی مسلمان ہیں۔

پامیری (چالچا یا پہاڑی تاجک)

بدخشان اور واخان میں بسنے والے اس قبیلے کی تعداد چند ہزار ہے یہ لوگ بنیادی طور پر کاشتکاری کرتے ہیں۔ پامیریوں کے کئی گروہ 'پراچی'، 'منجی'، 'سنگلیچی'، 'شُغنی'، 'یگھنوبی'، ارموری'، واخی' اسکاشیمی کے نام سے معروف ہیں۔ ان کی جسمانی وظاہری ساخت رومی النسل قبائل سے ملتی جلتی ہے مختلف "پامیری زبانیں" بولتے ہیں کچھ کا لہجہ مشرقی ایرانیوں سے بھی ملتا ہے۔

بلوچ (بلوچی)

ہندیورپی لہجے میں بلوچی زبان بولنے والا یہ قبیلہ حنفی سنی مسلمانوں پر مشتمل ہے ان کی تعداد ایک لاکھ کے قریب ہے بنیادی طور پر یہ کاروان لے کر چلتے رہتے ہیں اب کچھ لوگ خانہ بدوشی کی زندگی چھوڑ کر کسی ایک جگہ ٹک کر زندگی گزارنے کو ترجیح دینے لگے ہیں کچھ بلوچ شمال مغربی افغانستان میں بستے ہیں جبکہ دیگر گرمیوں میں سیستان سے ہرات کی طرف اور سردیوں میں پھر واپس ہرات سفر کرتے رہتے ہیں بہت سے بلوچ "رخشانی" کہلاتے ہیں جبکہ بلوچوں کے دیگر گروہوں میں سنجرانی 'تھروئی' لیمرزئی 'سمرزئی 'گشانی 'سرابندی 'میاں گل 'ہروت' سالرزئی شامل ہیں سیستان میں ماہی گیر شکاریوں کا ایک گروپ "سیلر" بھی کہلاتا ہے یہ لوگ یہاں جھیلوں اور آبی ذخیروں میں ماہی گیری کرتے ہیں یہ کوئی علیحدہ یا مخصوص قبائلی گروہ نہیں ہے کچھ سیدوں کا تعلق "فارسی وان قبیلے" سے بھی ہے۔ بھیڑ بکریوں کو پالنے اور نسل بڑھانے میں بلوچوں کا ایک گروہ "گودر" بہت مشہور ہے۔ ان کے بارے میں اس سے پہلے زیادہ معلومات نہیں تھیں ،لیکن اب یہ گروہ بھی معروف ہے۔

نورستانی

مشرقی افغانستان میں بسنے والے تقریباً ایک لاکھ افراد پر مشتمل نورستانی قبائل امیر عبدالرحمٰن خان کے دورِ حکومت میں انیسویں صدی کے آخر میں مسلمان ہوئے۔ کچھ محققوں کا خیال ہے کہ امیر عبدالرحمٰن نے انہیں زبردستی مسلمان بنایا تھا۔ لیکن قبائلی اندازِ زندگی کے پیشِ نظر ایسا ممکن دکھائی نہیں دیتا کیونکہ قبائلی معاشرت میں کسی کو بغیر مرضی کے عقائد سے ہٹانا ممکن نہیں ہوتا۔ نورستانی وادیوں اور علاقوں کی معرفت اپنی پہچان کراتے ہیں۔ ویگالی' وامائی اور کرونی گروہ اسی قبیلے میں شامل ہیں۔ یہ لوگ کافری زبان بولتے ہیں اور حنفی سُنّی مسلمان ہیں۔

براہوئی

اس قبیلے کے لوگ "براہوئی" زبان کے علاوہ پشتو یا بلوچی بھی بولتے ہیں۔ حنفی سُنّی مسلمان ہیں۔ دو لاکھ کی تعداد میں جنوب مغربی افغانستان میں بستے ہیں۔ پیشے کے اعتبار سے مزارع (کرائے کے کاشتکار) ہیں۔ کچھ براہوئی بلوچ اور پشتون خانوں کے جانوروں کے ریوڑوں کو کرائے پر پالتے ہیں۔ یہی ان کا ذریعہ معاش بھی ہے اور معاشرت بھی۔ ایدوزی' لیوارزی' بجیزی 'زرکندی' مماسانی گروہوں کا تعلق بھی اسی قبیلے سے ہے۔ براہوئی عموماً اپنے آپ کو بلوچ قبیلے سے تعلق کے حوالے سے متعارف کروانا پسند کرتے ہیں اور اسی قبیلے کا ایک گروہ کہلوانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔

کوہستانی

ڈاردک زبان بولنے والے پاشائی' گواربتی' مسووجی' ڈیکھانی اور کوار جیسے مخصوص لسانی گروہ جنوبی نورستان کے قریب بستے ہیں اور کوہستانی کہلاتے ہیں۔ ان میں سے بہت سے لوگ پشتو زبان بھی بولتے ہیں۔ حنفی سُنّی مسلمان ہیں۔

گجر

حنفی سُنّی مسلمانوں کا یہ مشرقی قبیلہ نورستان میں بستا ہے اور امن پسند قبیلے کے طور پر مشہور

ہے۔ ان کا اندازِ تکلّم ہندوستانی زبانوں سے ملتا جُلتا ہے۔ بہت سے لوگ پشتو بھی بولتے ہیں۔

جٹ گجّی

شمالی افغانستان میں یہی لوگ گجر کہلاتے ہیں۔ چنگڑ، مصلّی، مہمندی قبائل کے لوگوں کا گفتگو کا انداز اور لہجہ ہندوستانیوں سے ملتا جُلتا ہے۔ تاجر پیشہ لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کا تعلق عربوں سے ہے یہ سب لوگ حنفی سُنّی مسلمان ہیں اور خانہ بدوشوں کی سی زندگی گزارتے ہیں۔ تاجروں، مفکروں، موسیقاروں، نجومیوں کے گروہوں کی صورت میں یہ لوگ محوِ سفر رہتے ہیں ان میں سے اکثر عرب نژّاد ہونے کا دعویٰ بھی کرتے ہیں ان کے خدوخال بحیرہ روم کے آس پاس بسنے والے قبائل سے ملتے جُلتے ہیں۔

عرب

حنفی سُنّی مسلمانوں کا یہ گروہ دری یا پشتو بولتا ہے۔ تحقیقات کے مطابق کچھ لوگ عربی زبان بھی بولتے ہیں اور یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ عربی ان کی مادری زبان ہے یہ لوگ سیّد کہلاتے ہیں اور عربی لہجے میں فارسی بھی بولتے ہیں ان کی جسمانی ساخت رہائشی علاقے کے مطابق ڈھلی ہوئی ہے۔

ہندُو

ان لوگوں کی مادری زبان ہندوستانی، پنجابی یا لاہندا ہے۔ مذہباً ہندو ہیں اور ان کی اندازاً تعداد ۲۰ ہزار کے قریب ہے شہری مراکز ہیں تاجروں اور سود خور مہاجنوں کی صُورت میں رہتے ہیں۔ ان کی جسمانی ساخت شمالی ہندوستانیوں سے ملتی جُلتی ہے۔

سکھ

پنجابی یا لاہندی بولنے والے یہ لوگ سکھ مت سے تعلق رکھتے ہیں افغانستان کے شہروں اور دیہاتوں میں بکھرے ہوئے یہ لوگ تاجروں اور قرضہ دینے والے ساہوکاروں کی زندگی گزارتے ہیں۔ ان کی تعداد دس ہزار کے قریب ہے۔ یہاں ہندُو اور سکھ زیادہ تر پشتو اور دری بولتے ہیں ان میں سے بیشتر افغان شہری ہیں۔ اور بغیر کسی رکاوٹ کے اپنے مذہبی فرائض سرانجام

دیتے ہیں۔

یہُودی

کابل' قندھار اور ہرات میں تاجروں اور ساہو کاروں کے رُوپ میں بستے ہیں ان کی تعداد چند ہزار سے زائد نہیں ہے۔ اسرائیل کے قیام کے وقت چند سو یہُودی افغانستان سے ہجرت کر کے اسرائیل جا بسے لیکن پھر واپس آگئے اور یہیں کے ہو رہے۔ کچھ یہودی ایرانی زبان بھی بولتے ہیں لیکن زیادہ تر یہودی پشتو یا دری بولتے ہیں۔

آج افغانستان میں ۲۱ بڑے بڑے نسلی گروہ بستے ہیں ۱۲۱ سے زیادہ قبیلے اور قومیتیں یہاں پائی جاتی ہیں افغانستان کی موجودہ سیاسی سرحدوں کے اندر جس کا رقبہ ۶ لاکھ ۵۵ ہزار مربع کلو میٹر ہے متفرق قبائل کچھ اس انداز میں بس رہے ہیں کہ ان کی تہذیبی ترکیب کو اتنی آسانی سے نہیں سمجھا جا سکتا ہے حزبِ اسلامی کے انجینئر گلبدین حکمت یار کا جارحانہ اور غیر مصالحانہ رویّہ' جمعیت اسلامی کے پروفیسر برہان الدین ربانی کا مصالحانہ اور صُلح پسند طرزِ عمل بظاہر عجیب وغریب لگتا ہے لیکن اس طرزِ عمل کو اگر قبائلی معاشرت کے حوالے سے دیکھا جائے تو حیرانگی نہیں ہوگی کیونکہ قبائلی فرق نے طرزِ عمل میں بھی بعد المشرقین پیدا کر دیا ہے۔ اہلِ عرب کی نظروں میں حکمت یار اور ربانی' دونوں ہی بنیاد پرست ہیں لیکن دونوں کا طرزِ عمل حیران کن دکھائی دیتا ہے۔ افغانستان میں روسی افواج کے داخلے کے بعد جس انداز میں تحریکِ مزاحمت پھُوٹ نکلی اس کا مطالعہ بھی اسی قبائلی تقسیم در تقسیم کے تناظر میں ہی کرنا مفید ہے۔ پھر روسی افواج کے انخلا کے بعد افغانستان میں پیدا ہونے والی غیر یقینی صورتحال بھی اسی معاشرت کے شاخسانے کے طور پر لینی چاہئے۔ اس وقت افغانستان میں جو اتھل پتھل ہو رہی ہے اس کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اس افتراق وانتشار کا جائزہ لیں جو ماضی میں اس سرزمین پر برپا رہا جس نے کئی تہذیبوں روایتوں اور تمدّنوں کا عروج وزوال دیکھا۔ ماضی پر نظر ڈال کر موجودہ حالات کا تجزیہ کیا جا سکتا ہے اور اسی راستے سے افغانستان کے مستقبل میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

مسئلہ افغانستان میں ہندوستانی حکمرانوں کی دلچسپی کچھ لوگوں کے لئے شاید حیران کن ہو لیکن جن کی نظر تاریخ کی قدیم روایتی لہروں پر ہے وہ حال کے مدوجزر کو بھی بخُوبی سمجھ سکتے ہیں افغانستان میں قیامِ پاکستان سے لے کر آج تک پاک دوست خیالات کے حامل افراد برسرِاقتدار نہیں آئے۔ نادر شاہی دور ہو یا ظاہر شاہی حکمرانی' ہر دور میں پاک دشمنی کے جذبات غالب رہے۔ سردار محمد داوٗد' نور محمد ترکئی' حفیظ اللہ امین اور ببرک کارمل' تمام حکمران پاکستان کے

خلاف رہے یایوں کہئے کہ انہیں پاکستان کے خلاف رہنے پر اُکسایا گیااور مجبور رکھا گیا' اور جونہی کسی بھی حکمران نے دہلی' ماسکو خطِ تعلق سے باہر نکلنے کی کوشش کی اسے کابل کے تخت شاہی سے معزول کر دیا گیا۔ افغانستان میں اگر مضبوط اور پاکستان دوست حکومت آجاتی تو پاکستانی مغربی سرحدیں محفوظ ہو جاتیں اور اگر پاکستان کی پشت محفوظ ومامون ہو جاتی تو ہندوستان کو ایک زیادہ مضبوط اور مؤثر پاک فوج کا سامنا کرنا پڑتا۔ لیکن ایسا کبھی بھی نہ ہو سکا بلکہ سوویت روس کے مفادات کے محافظ بھارتی حکمرانوں نے پاک دشمنی کے جذبات کو فروغ دیا۔ اس پالیسی کے سیاسی پہلوؤں کے علاوہ معاشی پہلو بھی تھے افغانستان میں ہندوستانی تاجر عرصہ طویل سے تاجروں اور ساہوکاروں کے گروپ میں کام کر رہے ہیں۔ اپنے معاشی و تجارتی مفادات کے تحفّظ کے لئے بھی انہوں نے یہ ضروری سمجھا ہے کہ افغانستان میں پاک دوستی کی فضا پرورش نہ پا سکے 'اور ماضی میں ایسا ہی ہوتا رہا ہے۔

افغان قبائل کے "ہیرو" جنگجُو ہیں۔ ایسی شخصیات یا تو داخلی قبائلی چپقلشوں کے نتیجے میں ابھرے یا پھر خارجی قبائلی جھگڑوں اور طویل منافرتوں کے نتیجے میں نام پیدا کر گئے' قبائلی اوران پڑھ معاشرے میں جنگ وجَدَل ایک اہم کردار ادا کرتا رہا ہے اور افغانستان اس کی بہترین مثال ہے' جنگیں قبائلی ہوں یا ملکی اور عالمی ہر صورت میں اسے جنگ میں شریک افراد کے حوالے سے دیکھنا چاہئے۔ معاشرتی اندازِ فکر بھی جنگجُو ماحول کی پرورش کرتا ہے۔ داخلی چپقلش اور جھگڑے بالآخر خارجی حملہ آوری یا مہم جُوئی کو فروغ دیتے ہیں یا یوں کہئے کہ داخلی باہمی تناؤ کو حل کرنے یا کم کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہوتا ہے کہ عوام کی خارجی سطح پر توجّہ مبذول کرا دی جائے یا کسی خارجی خطرے کا ہوّا کھڑا کر کے لوگوں کی توجہ داخلی محاذ سے ہٹا دی جائے ے خلیفہ راشد عثمان بن عفانؓ کے دور میں جب اسلامی سلطنت میں تناؤ پھیلنے لگا داخلی جھگڑے پرورش پانے لگے تو خلیفۃ المسلمین نے شوریٰ بلائی جہاں ایک صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے تجویز پیش کی کہ ان تمام داخلی معاملات کے حل کے لئے اعلانِ جہاد کر دیا جائے۔ یعنی مسلمانوں کی افواج جہاں کہیں بھی دشمن کے ساتھ معرکہ آرائی کی منتظر ہیں انہیں حتمی معرکہ آرائی کے لئے تیاری کا حکم دے دیا جائے اور سلطنتِ اسلامیہ کے شہری اس مہم میں شامل ہو جائیں پندرہ سو برس قبل پیش کی جانے والی اس تجویز کو دورِ حاضر کے عسکری و جنگی نظریات پر پرکھ کر دیکھئے اس میں کس قدر دانائی اور بالغ نظری دکھائی دیتی ہے۔ تاریخ میں جب کبھی کسی زندہ معاشرے میں گڑبڑ پیدا ہونے لگی تو اس معاشرے کے اکابرین نے خارجی محاذ کھول کر اپنے لوگوں کی توجّہ اس جانب مبذول کرانے کی کوشش کی۔ سلطنتِ روما ہو یا فرانسیسی بادشاہت یہاں جب کبھی بھی داخلی تنازعات یا کمزوریوں

نے سر اٹھایا' انہوں نے خارجی مہم جوئیاں شروع کر دیں۔ برطانوی شاہی حکمران بھی ایسا ہی کرتے رہے۔ اڈولف ہٹلر نے بھی اپنی قوم کی بڑے قلیل عرصے میں تنظیم قائم کر کے انہیں فوری طور پر خارجی محاذ پر لگا دیا اور دوسری عالمی جنگ کا طبل بجا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ پہلی جنگِ عظیم کے بعد جرمن قوم میں پیدا ہونے والی کمزوریاں اور تضادات اسی طبلِ جنگ کی گھن گرج میں دبے رہے تو ہٹلر اپنے منصوبوں پر یکسوئی اور مکمل عوامی حمایت سے عمل پیرا رہا۔ زار شاہی کی تاریخ ہو یا اشتراکی روس کی تاریخ کا مطالعہ ہر دو طرز کے حکمرانوں نے داخلی تضادات پر قابو پانے کے لئے خارجی محاذ قائم کیے۔ اشتراکی روس نے انتہائی داخلی تضادات اور کمزوریوں پر پردہ ڈالنے کے لئے افغانستان پر لشکر کشی کی اور انہی تضادات کو دبانے اور چھپانے کے لئے طویل مدّت تک افغانستان میں ذلیل و رسوا ہوتے رہنا قبول بھی کیا لیکن جونہی افغانستان میں ان کا قیام ناقابلِ برداشت ہوا اور انہیں واپسی کی راہ ناپنی پڑی تو اشتراکی معاشرے کے تضادات فوری طور پر منظرِ عام پر آگئے اور دیکھتے ہی دیکھتے سوویت یونین ریت کی دیوار کی طرح زمین بوس ہو گیا۔ ایران میں انقلاب کے فوراً بعد "عراقی جارح" کی صُورت میں ایک ایسا دشمن تلاش کیا گیا جس کے خلاف پوری ایرانی قوم کو لگا کر داخلی تضادات سے توجّہ ہٹانے کی بھرپور کوشش کی گئی۔ اسی کاوش میں آٹھ سال تک دو مسلم ممالک ایک دوسرے کے ساتھ برسرِپیکار رہے۔ اربوں ڈالر کے وسائل جنگ میں جل بھُن کر راکھ ہو گئے جب یہ بے مقصد جنگ بند ہوئی تو عراق نے ایک بار پھر داخلی تضادات پر قابو پانے کے لئے کُردوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ شروع کی اور پھر کویت کے ساتھ ایک ایسا جھگڑا شروع کر دیا جو خلیجی جنگ کی صورت میں سامنے آیا۔ ایرانی معاشرے کے تضادات اب اس لئے کھل کر سامنے آنا شروع ہو گئے ہیں کہ اب کوئی "خارجی دشمن" سامنے نہیں ہے۔ امام خمینی کے فرزندِ ارجمند احمد خمینی بھی حکمران جماعت کے خلاف ہیں اور کھُل کر تنقید کر رہے ہیں۔ پاک بھارت تاریخ کا بھی مطالعہ یہی کچھ بتاتا ہے کہ ہر دو ممالک نے اپنے داخلی معاملات پر پردہ ڈالنے کے لئے ایک دوسرے کا ہوّا کھڑا کیا اور کئی دفعہ سرحدی جھڑپیں صرف اس لئے ہوتی ہیں تاکہ داخلی طور پر اپوزیشن کا منہ بند کیا جا سکے۔ پاک بھارت جنگوں کی وجوہات میں "داخلی انتشار پر قابو پانا" بھی ایک اہم وجہ رہی ہے۔

افغان قبائلی معاشرے میں بھی داخلی دباؤ کے نتیجے میں خارجی جھگڑے شروع ہو جانے کی روایت پرانی ہے۔ افغان زراعتی معاشرے میں جب خشک سالی آتی ہے اور خانہ بدوش حرکت کرنا بند کرتے ہیں تو اس کے نتیجے میں بوریّت کے طویل اوقات شروع ہوتے ہیں۔ پھر خانہ بدوش کیمپوں اور دیہاتوں میں بیٹھے نوجوان گرم دماغی سے سوچتے ہیں تو قبائلی عصبیّت کے

رجحانات غالب آنا شروع ہو جاتے ہیں اور اس طرح جھگڑے شروع ہو جاتے ہیں۔ عموماً ایسا بھی ہوتا ہے کہ داخلی چپقلش اچانک کسی "بیرونی مداخلت کار" کی طرف مڑ جاتی ہے اور پھر جو کچھ دیر پہلے خود دست و گریبان تھے اب متحد و متفق ہو کر بیرونی مداخلت کار کے خلاف بر سرِپیکار ہو گئے ہیں۔ یہ بڑی عجیب و غریب نفسیات ہے جس کی ابھی تک سائنٹفک توجیح ممکن نہیں ہے۔ افغان معاشرے میں تفریح طبع کے مواقع بہت کم بلکہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ "جنگجوئی" ان کے لئے ایک بہترین مشغلہ رہا ہے۔ قبائلی اپنے جنگی سورماؤں کے کارناموں کے بارے میں بڑے جذباتی ہوتے ہیں یہی ان کی زندگی ہے اور یہی ان کی تفریح و آسائش اور تضیع اوقات ایک بہترین و فطری ذریعہ بھی۔

قبائلیوں کی اس فطرتِ ثانیہ کو پاکستان کے محکمہ خارجہ یا دفاع کے اہلکار کبھی بھی نہیں سمجھ سکے۔ اس لئے ہمارا شمالی مغربی سرحدی علاقہ اکثر نقصِ امن کا شکار رہا اور وہاں تحریکِ پاکستان اور قیامِ پاکستان کے مخالف عناصر کو بھی طبع آزمائی کے مواقع میسّر آتے رہے۔ غفار خان، ولی خان، اجمل خٹک اور اسی قبیلے کے دوسرے سرکردہ افراد ماسکو اور کابل کے علاوہ دہلی کو اپنا قبلہ و کعبہ بنا کر پاکستان کے خلاف سرگرمیوں میں مشغول رہے۔ بھٹو دور میں بھی اس سرکشی کو دبانے کے لئے سرحد و بلوچستان میں کوششیں کی گئیں۔ نیپ پر پابندی کے ساتھ ساتھ "باغی قبائل" پر فوج کشی بھی کی گئی، لیکن نتیجہ وہی نکلا جو اس طرح کے غلط فیصلے سے نکل سکتا تھا۔ شورش اور بھی زیادہ پھیل گئی۔ کابل نے اسلام آباد کے خلاف اور بھی زیادہ زہریلا اندازِ فکر اپنا لیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ پاکستان نے افغانوں کے اندازِ فکر و معاشرت کو نظر انداز کر کے پالیسی اپنائی تھی۔

بھٹو دور میں ہی ایک ایسی فکر انگیز پالیسی بھی اختیار کی گئی جس نے آگے چل کر بہتر نتائج حاصل کرنے میں معاونت کی۔ افغانوں کے داخلی و معاشرتی تضادات کو پہلی مرتبہ اُس وقت کے حالات کے مطابق پاکستان کے مفادات کے لئے استعمال کیا گیا۔ صوبہ سرحد کے گورنر جنرل نصیر اللہ بابر نے ظاہر شاہی اور داؤد شاہی نظام کے خلاف جدوجہد کرنے والے قبائل کو پاکستان میں منظّم کرنا شروع کیا۔ انجینئر حبیب اللہ، انجینئر گلبدین حکمت یار اور پروفیسر برہان الدین ربانی کو یہاں خوش آمدید کہا گیا۔ داخلی قبائلی تضادات کو منظّم کر کے افغان حکومت کے خلاف مؤثّر جوابی کارروائی کی منصوبہ بندی کی گئی۔ یہ افغان سوسائٹی کا طرہ امتیاز ہے کہ وہ اپنے دشمن کے خلاف بیرونی امداد لینے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ نصیر اللہ بابر نے اسی قبائلی فطرت کے عین مطابق انہیں خوش آمدید کہا اور "پشتونستان" کے غیر فطری نعرے کے خلاف افغان حکمرانوں کو

دفاعی حکمتِ عملی اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ افغانستان کے صدر سردار محمد داؤد نے پاکستان کا دورہ بھی کیا اور ڈیورنڈ لائن سمیت تمام متنازعہ معاملات کے حوالے سے گفت و شنید پر آمادگی کا اظہار بھی کیا۔ لیکن حتمی معاملات طے کرنے کا نہ تو سردار داؤد کو موقع مل سکا کیونکہ انہیں ان کے خاندان سمیت قتل کر دیا گیا تھا اور نہ ہی ذوالفقار علی بھٹو کو اپنے منصوبوں پر عمل پیرا ہونے کا موقع مل سکا کیونکہ الیکشن ۱۹۷۷ء میں دھاندلیوں کی بنیاد پر اپوزیشن نے ان کی حکومت کے خلاف ایک ملک گیر مہم چلائی جو ضیاء الحق کے مارشل لا پر منتج ہوئی۔ اس طرح ایک نیا دور شروع ہونے سے پہلے ہی دم توڑ گیا۔

افغانستان کی صدیوں پرانی تاریخ میں جب کبھی بھی کسی شخص نے قبائلی معاشرت اور سیاست کو سمجھ کر معاملات ہاتھ میں لئے تو پھر وہ قبائلی رہنما سے بڑھ کر امیر یا بادشاہ بنا' سرکش قبائل کی اطاعت اور وفاداریوں کے سبب تاریخ میں نامور ہوا۔ لیکن جب کسی شخص یا حکمران نے معاملات میں بے احتیاطی یا غیر ذمّہ داری کا مظاہرہ کیا تو پھر انارکی پھیلی' جنگ و جدَل ہوا۔ یہ بے احتیاطی یا غیر ذمّہ داری اگر کسی قبیلے کی طرف سے ہوئی تو قبائلی جنگیں شروع ہو گئیں اور اگر یہ بے احتیاطی کسی غیر افغان قوم یا غیر ملک کی طرف سے ہوئی تو پھر یا تو اینگلو افغان جنگوں کی تاریخ لکھی گئی جس کا ایک ایک ورق افغانوں کی شجاعت اور انگریزوں کی ہزیمت کی داستانوں سے بھرا پڑا ہے یا پھر افغانستان میں روسی افواج کی شکست اور بالآخر سوویت یونین کے خاتمے کی داستان سے بھرا پڑا ہے۔ کیونکہ یہی افغان تاریخ ہے' یہی افغان روایت ہے اور یہی افغانستان کا حال بھی ہے اور ان کا مستقبل بھی انہی خطوط پر ترتیب پائے گا۔ ان خطوط سے ہٹ کر کسی قسم کا حل اگر افغانوں پر مسلّط کرنے کی کوشش کی گئی تو نتائج بھی تباہ کن ہونگے۔

افغانستان میں علماء کا زبردست اثر و نفوذ' یہاں عمومی دینداری کی موجودگی کو بھی ظاہر کرتا ہے سعودی عرب کی طرح یہاں بھی علماء ریاستی معاملات میں اسی طرح دخل انداز ہوتے رہے ہیں جس طرح خلفائے راشدین کے سنہری دورِ اسلام کے بعد اموی' عباسی اور اس کے بعد کے ملوکی ادوار میں علماء ریاستی معاملات کی نگرانی کرتے تھے۔ دورِ حاضر میں سعودی عرب کے بعد صرف مسلم افغانستان کو یہ اعزاز حاصل رہا ہے کہ یہاں بلاشرکتِ غیرے مسلمان نہ صرف اکثریّت میں رہے بلکہ معاشرے کا مجموعی چلن بھی اسلامی شرعی بنیادوں پر ہی استوار رہا۔ قبائلی معاشرے کو جب ''بادشاہی حصار'' میں باندھنے کی کوشش کی گئی تو اس کے ساتھ ہی علماء کو بھی منظم اور مربوط کرنے کی منصوبہ بندی کی گئی۔ محمد نادر شاہ کے دورِ حکومت میں افغان جمعیت علماء قائم کی گئی جس میں ہر صوبے سے ایک چوٹی کے عالم کو شامل کیا گیا۔ اس طرح ۱۹۳۱ء میں ۱۷ ممبران پر

مشتمل جمعیت قائم کی گئی جس کا مقصد انتظامی اور قانونی امور پر حکّام کی رہنمائی کے علاوہ مملکت کے اندر وقوع پذیر ہونے والے عمومی واقعات پر نظر رکھنا تھا۔ لوگوں کے اخلاق اور تعلیمی درسگاہوں کے ماحول پر نظر رکھنا بھی اسی جمعیت کے فرائضِ منصبی میں شامل تھا۔ ۱۹۵۳ء میں جب سردار محمد داؤد نے وزارتِ عظمیٰ کا منصب سنبھالا تو علماء کے ریاستی کردار میں کمی آنی شروع ہو گئی کیونکہ سردار داؤد نے "لادینیت" کی پالیسی اختیار کرنا شروع کر دی تھی۔ ویسے تو امیر عبدالرحمان نے ۱۸۹۶ء میں علماء کے اداروں کو سرکاری تحویل میں لے لیا تھا۔ بہت سے "وقف" شخصی کنٹرول سے نکال کر سرکاری کنٹرول میں دے دیئے گئے تھے، کیونکہ یہ "اوقاف" اجتماعی فوائد کی نسبت شخصی طاقت کا مرکز بننے شروع ہو گئے تھے۔ "اوقاف" کو عطیات کی صورت میں ملنے والے وسائل اس کے منتظمین کی نازبرداریوں پر خرچ ہونے شروع ہو گئے تھے۔ حکمرانوں نے انہی اوقاف کو اپنی حکمرانی کے لئے خطرہ بھی سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ اس لئے طاقت کے ان چھوٹے چھوٹے مراکز کو کمزور کرنے کے لئے سرکاری تحویل میں لے لیا گیا۔ اس کے بعد مؤذّن، امام، خادم اور مدرس کے عہدے قائم کئے گئے جو سرکار سے اپنی خدمات کا معاوضہ لینے لگے۔ "قاضی" کا ادارہ گو سرکاری انتظام کا ایک حصّہ ہے، لیکن مذہبی یا دینی جتنا سے الگ رہ کر وزارتِ انصاف کے تحت کام کرتا ہے۔ افغان تاریخ میں قاضی کا کردار بہت اہم رہا ہے۔ لادینی قوانین کو بتدریج شرعی قوانین کے دائرے میں لانا یا انہیں بدل دینے کا سہرا انہی "قاضیوں" کے سر بندھتا ہے گو یہ سلسلہ انقلابِ ثور (۱۹۷۸) کے بعد اور روسی افواج کے افغانستان داخلے کی وجہ سے بری طرح متاثر ہوا ہے، لیکن بہرحال افغان معاشرتی ڈھانچے میں اس کی نفوذ پذیری ابھی تک قائم و دائم دکھائی دیتی ہے افغانستان میں بہت سے دینی اعزازات کے حوالے سے بھی کچھ خاندان اور شخصیات معروف ہیں ان میں سے کچھ اعزازات تو موروثی طور پر چل رہے ہیں جبکہ کچھ دیگر اعزازات ذمّہ داریوں یا علم و فضل کے حوالے سے "معزّز علمی و دینی شخصیّات" کو دیئے جاتے ہیں۔

افغانوں کی دین داری اور مسلم دوستی کا اندازہ بخت خان کے تاریخی کردار سے بھی لگایا جاسکتا ہے۔ یہ وہی کردار ہے جو ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے دوران اہلِ ہند کے لئے رحمت ایزدی بن کر آیا۔ اس نے ڈوبتے ہوئے مسلمانوں کو سہارا دیا۔ عسکری طور پر انگریزوں کو شکست دے کر ثابت کر دیا کہ مسلمانوں پر غلبہ حاصل کرنا آسان کام نہیں لیکن مغل شہنشاہ کی بزدلی اور انگریزوں کی سازشیں آڑے آئیں اور وہ اہلِ ہند کو انگریز غلامی سے نہ بچا سکا۔

جنگِ آزادی کے آغاز کے وقت بخت خان توپ خانے کے صوبیدار کے طور پر کام کر رہا

تھا۔ اس نے پہلی اینگلوافغان جنگ میں بھی بہادری کا مظاہرہ کر کے اپنا آپ منوالیا تھا۔ جب بریلی میں بغاوت پھوٹی تو بخت خان روہیل کھنڈ میں بغاوت کی تیاری کر رہا تھا۔ یہاں سے اس نے دہلی کارخ کیا اور ۲ر جولائی ۱۸۵۷ کو یہاں پہنچ کر باقی "باغیوں" سے مل گیا۔ جنرل بخت خان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس کے اپنے انگریز دشمن جذبات پہلے کبھی نہیں تھے۔ ان جذبات کو پیدا کرنے کا سہرا امیرالمجاہدین مولوی سرفراز علی کے سر بندھتا تھا جو سیّد احمد بریلوی شہید کے پیرو کار تھے۔ بخت خان انہی کے نائب کے طور پر کام کر رہا تھا اور انہی کے اشارے پر دہلی میں وارد ہوا' جہاں اس نے بہادر شاہ سے مل کر حالات کو سنبھالا دینے کی کوشش کی۔ ۱۹ر ستمبر تک انگریزوں کو دہلی کی شہرپناہ میں داخل ہونے کی جرأت نہ ہوئی لیکن غداروں نے کام دکھایا اور بخت خان کو بدایوں اور فرخ آباد سے ہوتے ہوئے لکھنؤ کارخ کرنا پڑا' جہاں سے اس نے آزادی کی جدوجہد جاری رکھی۔ دہلی چھوڑتے وقت اس نے شہنشاہ کو کہا کہ وہ اس کے ساتھ چلے کیونکہ دہلی پر انگریزوں کے قبضے کا مطلب "تحریکِ آزادی کا خاتمہ ہرگز نہیں تھا" مگر شہنشاہ نہ مانا۔ جنرل بخت خان نے لکھنؤ اور شاہ جہاں پور میں جنگِ آزادی کی شمع روشن رکھنے کی کوشش کی لیکن مقامی مسلمانوں کی عدم توجہی اور مرکز کی بزدلانہ پالیسیوں سے مایوس ہو کر بخت خان نیپال چلا گیا۔ بخت خان کی ساری جدوجہد ہند میں مسلم اقتدار کے استحکام اور انگریزوں کے خلاف تھی۔

احمد شاہ دُرّانی سے ظاہر شاہ تک

قبائلی معاشرت میں پنپنے والی سرکاری اور درباری سازشوں کا جائزہ

افغانوں کے سیاسی معاملات کو سمجھنے کے لئے وہاں کی قبائلی سیاست واندازِ فکر کو سمجھنا ضروری ہے۔ قبائلی طرزِ سیاست و عساکر کی ایک اہم مثال سلطنت درانی DURRANI EMPIRE (۱۷۴۷ء ـ ۱۷۷۳ء) کا قیام اور خاتمہ ہے اس بادشاہت کے قیام اور زوال کے مطالعہ سے جہاں افغانوں کے داخلی جھگڑوں اور سازشوں بھرے ماحول سے واقفیّت حاصل ہوتی ہے وہاں افغانوں کی "بیرونی مداخلت" کے خلاف نفرت و جذبۂ حریّت کا ثبوت بھی ملتا ہے افغانوں میں یہ دونوں خصوصیّات اب بھی بدرجہ اتم موجود ہیں قبائلی تفاخر و نفرت کے ساتھ ساتھ خود پسندی آج بھی اسی شدّت سے موجود ہے جس قدر صدیوں پہلے موجود تھی قبائلی سردار جہاں داخلی جھگڑوں پر قابو پانے کے لئے قوت جمع کرتے رہے ہیں وہاں کئی مہم جُو سردار اپنی حکومت قائم کرنے کے لئے قبائلی فوجیں بھی تیار کرتے رہے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بڑی اہم ہے کہ اپنی سلطنت کو بنانے کے لئے جس طرح غیر ملکی فوجوں سے مقابلہ کرنے کے لئے صف بندی کرتے رہے ہیں بالکل اسی طرح وہ اپنے ہم مذہبوں اور ہم قبیلہ مہم جُوؤں سے بھی مقابلہ کرتے رہے ہیں دورِ حاضر کے مسئلہ افغانستان میں بھی افغانوں کی یہی نفسیات واضح انداز میں دیکھی جاسکتی ہے۔

درانی سلطنت کی سرحدیں وسط ایشیا سے لے کر دہلی تک اور کشمیر سے لے کر بحیرہ عرب

تک پھیلی ہوئی تھیں خلافتِ عثمانیہ کے بعد مسلم دنیا کی دوسری بڑی سلطنت درانیوں کی تھی۔ نادر شاہ افشاری کابل کے حکمران نے غلزئیوں کے آخری مرکز غزنی کی فتح کے بعد احمد شاہ درانی کی قیادت کو تسلیم کر لیا۔ یہ تسلیم صرف اس لئے تھی کہ احمد شاہ درانی ابھرتا ہوا فاتح تھا درانیوں کا ہونہار سپوت اپنا آپ دکھا رہا تھا اس سے قبل افغانوں کو اپنی سرزمین پر اپنی حکمرانی کا ملکہ حاصل نہیں ہوا تھا بہت سے قبائل خود آزاد تھے گو دیگر قبائل مکمل طور پر غلامی کی زندگی بھی نہیں گزار رہے تھے لیکن انہیں حکمرانی کا حق بھی حاصل نہیں تھا ان کی منشا اور مرضی کے خلاف ان پر کسی نہ کسی انداز میں حکمرانی کی جا رہی تھی بالکل جیسے آج کل افغانستان میں ایک ایسا گروہ مجددی کی سربراہی میں مسندِ اقتدار پر بیٹھا ہوا ہے جس سے افغانستان کی نصف سے کہیں زیادہ آبادی خوش نہیں ہے ۴۵ لاکھ افغان مہاجر ہیں تین لاکھ سے زائد اس نجیب حکومت کے خلاف برسرِپیکار ہیں یہی وجہ ہے کہ اشتراکی افواج کی واپسی کے تین سال گزرنے کے بعد بھی وہاں امن وامان قائم نہیں ہو سکا ہے اس کی وجہ کچھ بھی ہو لیکن افغان قوم آج بھی متفقہ اور قد آور قیادت سے محروم ہے داخلی چپقلشوں کا ایک بازار گرم ہے اس دور میں بھی ایسا ہی ہو رہا تھا خوشحال خان خٹک جیسا جنگجو شاعر ایک طرف نہ صرف اپنے ہم قوموں کو مغل حملہ آوروں کے خلاف ابھار رہا تھا بلکہ دوسری طرف اپنے قبائلی خونی جھگڑوں کو نمٹانے کے لئے بھی مستعد تھا۔ اس نے اپنی پوری زندگی داخلی جھگڑوں کو نمٹانے اور مغل افواج کے خلاف لڑنے میں گزاری۔

افغانستان کا اندازِ حکمرانی یا افغان حکمرانوں کی سوچ برِصغیر پاک وہند کے علاوہ وسط ایشیا کے معاملات پر بھی اثرانداز ہوتی رہی ہے۔ تاریخ میں کئی دفعہ وسط ایشیا سے اٹھنے والی مہم جوؤں کی طاقتور لہریں، کوہِ ہندوکش سے گزرتے ہوئے درہ خیبر کے راستے برِصغیر کی طرف امڈتی رہیں۔ پھر کئی بار ایسا بھی ہوا کہ برصغیر پر حملہ آور ہونے والے بالآخر افغانستان کی طرف چل پڑے۔ یہ الگ بات ہے کہ انہیں یہاں بہت زیادہ کامیابیاں نہ ہو سکیں اور اس طرف سے اٹھنے والا سیلاب آگے نہ بڑھ سکا۔ لیکن جو لہریں وسط ایشیا سے اٹھیں اور کوہ ہندوکش پر اپنا رنگ جما گئیں انہیں ہندوستان پر اپنا رنگ جمانے سے کوئی نہ روک سکا۔ مغلیہ سلطنت کے بانی ظہیرالدین بابر کی مثال اس ضمن میں بڑی اہم ہے بابر پدری طور پر تیمور لنگ کی نسل سے تھا جس کا تعلق چغتائی ترکوں سے مل جاتا ہے جبکہ مادری طور پر وہ چنگیزی نسل کا تھا شیبانی ازبکوں کے ہاتھوں تنگ ہو کر وہ فرغانہ سے کابل کی طرف ہجرت پر مجبور ہوا اور یہاں قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا۔ ۱۵۲۵ میں ۱۲ ہزار جنگجوؤں پر مشتمل جانفروشوں کی ایک مختصر فوج لے کر ہند کے حکمران لودھی سلطان دوم کی ایک لاکھ سفاک فوج پر حملہ آور ہوا۔ بابر کی سریع الحرکت مختصر فوج نے لودھی سلطان کی جنگی

مشین کو تباہ کر کے رکھ دیا اور پھر یہاں مغلیہ سلطنت کی بنیاد رکھی گئی جو معنوی طور پر ۱۸۵۷ء تک قائم رہی جسے ایسٹ انڈیا کمپنی نے ختم کر ڈالا۔ ہمایوں' اکبرِ اعظم' جہانگیر' شاہ جہان اور اورنگ زیب جیسے شہرۂ آفاق مغل شہنشاہوں نے تختِ دہلی پر بیٹھ کر حکمرانی کی۔

سولھویں صدی میں ہی سہ فریقی چپقلش کا آغاز ہوا جس کے اثرات ابھی تک ہندو پاک کے علاوہ افغانستان' ایران اور وسط ایشیا کے سیاسی' جغرافیائی اور عسکری ماحول پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ ہند کے شمال میں ازبکی' جنوب میں مغل اور مغرب میں صفویوں کو عروج حاصل ہوا تھا۔ سولھویں صدی کے آغاز میں ہی ترکی زبان بولنے والے غالباً کرُد نسل شاہ اسماعیل اوّل (۱۵۰۱ء ۔ ۲۴) نے فارس میں ایک سلطنت کی بنیاد رکھی اور اس کے ساتھ ہی وسط ایشیا تک رسائی حاصل کرنے کے لئے مغلوں اور ازبکوں کے ساتھ مقابلہ شروع کر دیا۔ مغل سلطنت کا بانی کیونکہ فرغانہ سے آیا تھا اس لئے مغلوں کو اپنی آبائی سرزمین سے دلچسپی تھی۔ وہ اپنی سلطنت کی سرحدیں وہاں تک لے جانے کے خواہشمند تھے۔ ازبک کیونکہ تھے ہی وسط ایشیا کے اس لئے ان کا محور و مرکز ہی وسط ایشیا تھا' جہاں ان کے دوسرے بھائی بند بستے تھے۔ اس طرح کابل سے قندھار تک سہ فریقی محاذ آرائی شروع ہونا فطری ٹھہر گیا۔ اس دور میں کم از کم ۳۴۵ معلوم قبائل موجودہ افغانستان کی سرحدوں میں بس رہے تھے اور قبائلی نظام بھی جاندار اور شباب پر تھا۔ صفوی' مغلوں کے خلاف اور مغل صفویوں کے خلاف معرکہ آرائیوں میں مصروف تھے۔ فارس کے صفوی مغربی افغانستان پر حکمران تھے۔

شاہ عباس دوئم نے ۱۶۴۸ء میں کمزور ہوتی ہوئی مغلیہ سلطنت پر فیصلہ کن حملہ کیا اور قندھار کو صفوی مملکت میں شامل کر لیا۔ شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے اپنے گمشدہ علاقوں کو دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن اسے کامیابی حاصل نہ ہو سکی' کیونکہ پٹھانوں نے مغلیہ بادشاہت کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر دیا تھا۔ یہ بغاوت ۱۶۵۸ء میں شروع ہوئی اور ۱۶۷۵ء تک جاری رہی۔ باغیوں کو صفوی بادشاہ کی حمایت بھی حاصل تھی' اس لئے اورنگ زیب کو باغیوں کے خلاف کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔

افغان قبائل نے اس وقت تک منظم صورت اختیار نہیں کی تھی۔ بغاوتوں اور شورشوں میں وہ ہر وقت سرِفہرست رہتے تھے' لیکن ان کی اپنی کوئی منظم و مربوط مملکت نہیں تھی۔ وہ کبھی مغلوں سے لڑتے تو صفویوں کے زیرِ احسان ہو جاتے' جب ذرا سی مدّت گزرتی تو صفویوں کے احسانوں کا بوجھ کم ہوتا۔ پھر کسی اور داخلی مہم جُوئی میں لگ جاتے' ان کی زندگیاں اسی طرح گزر

رہی تھیں۔ ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد احمد شاہ ابدالی نے درانی سلطنت کی بنیاد رکھی اور قندھار کو پایۂ تخت بنا کر افغان قبائل کی طاقت کو مجتمع کیا۔ ابدالیوں اور غلزئیوں کے درمیان چپقلش اس دور میں بھی جاری رہی۔ مغلوں اور صفویوں کے درمیان جھگڑوں میں غلزئیوں کا کردار دوغلہ رہا۔ وہ کبھی اِدھر کبھی اُدھر ہو جاتے۔ صفوی مذہباً" شیعہ تھے اور غلزئی سُنّی لیکن صفوی شیعوں کی لادین پالیسیوں کی وجہ سے غلزئیوں نے اکثر اپنا وزن فارس کے حکمرانوں کے پلڑے میں ہی ڈالا۔ یہی وجہ ہے کہ جب مغلوں نے ۱۶۵۳ء میں قندھار پر قبضہ کرنے کے لئے لشکر کشی کی تو غلزئیوں نے عسکری طور پر بھی صفویوں کی مدد کی۔ اس کے بعد ایک صدی تک ایسی ہی قبائلی چپقلش چلتی رہیں۔ حتّٰی کہ فارسی، ہندوستانی اور ازبکی اثرات سے آزاد ہو کر ابدالی افغانوں نے ایک بار پھر منظر پر ابھرنا شروع کر دیا۔ ایسے وقت میں قیادت کے مسئلے پر ابدالیوں کے محمد زئی اور سدوزئی قبیلوں میں اختلاف پیدا ہوا۔ دونوں اپنے اپنے افراد کو "قیادت" سونپنا چاہتے تھے۔ حتمی مقابلہ محمد زئی قبیلے کے حاجی جمال خان اور سدوزئی قبیلے کے ۲۵ سالہ احمد خان کے درمیان ہوا۔ جرگہ مسلسل نو روز تک جاری رہا قریب تھا کہ حاجی جمال خان کو "لیڈر" چن لیا جاتا، اچانک ایک "درویش بابا" اٹھا اور اس نے جرگہ کے شرکاء کو مخاطب کر کے کہا۔ "اللہ تعالیٰ نے احمد خان کو تم میں سے بہتر پیدا کیا ہے۔ اس کے خاندان کا شمار بھی اعلیٰ افغان خاندانوں میں ہوتا ہے۔ یہ اللہ کی مرضی ہے کہ اسے رہنما بنایا جائے اور اگر تم نے اس کی منشا کے برعکس عمل کیا تو تم پر عذاب نازل ہو جائے گا۔" احمد خان نے جرگہ کے اس فیصلے کو تسلیم کرنے میں ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا کہ جرگے کے ایک اور بزرگ نے اٹھ کر گندم یا جو کے کچھ دانے اس کی پگڑی میں ڈال دیئے اور نعرہ بلند کیا "بادشاہ، در دوران" یعنی بادشاہ، وقت کا ہیرا۔ اسی لقب کی نسبت احمد شاہ ابدالی کو احمد شاہ درانی بھی کہا جاتا ہے۔ اسی احمد شاہ ابدالی نے آنے والے وقت میں نہ صرف افغان قبائل کو مجتمع و منظم کیا بلکہ مسلمانانِ ہند کی نُصرت و تائید کے لئے کئی دفعہ ہندوستان پر لشکر کشی بھی کی۔ دیگر ابدالی قبائلی رہنماؤں نے ۲۵ سالہ نوجوان احمد شاہ کی قیادت ویسے ہی قبول نہیں کر لی تھی۔ اس کی وجہ نہ صرف اس کی طلسماتی شخصیت تھی بلکہ وہ چار ہزار گھڑ سواروں کا کمانڈر بھی تھا۔ اس کا تعلق سدوزئیوں کے اس گھرانے سے تھا جو صفوی دربار شاہی میں سفارتکاری کے فرائض انجام دیتا رہا تھا۔ ان تمام عوامل نے مل جل کر احمد شاہ ابدالی کی قیادت کو کسی حد تک متفقہ بنایا۔ افغانستان کے موجودہ بحران میں سب سے زیادہ کمزوری اسی شعبے میں پائی جا رہی ہے۔ حکمران جماعت پی ڈی پی اے تو

انقلابِ ثور کے بعد سے اب تک اپنے کئی رہنما بدل چکی ہے لیکن کسی ایک پر اتحاد و اتفاق نہیں ہو رہا ہے۔ دوسری طرف افغان حریت پسندوں کی صفوں میں بھی قیادت کی جنگ جاری ہے۔ ہر گروہ اپنے لیڈر کو "فاتح" دیکھنا چاہتا ہے اور ہر گروہ کا لیڈر اپنے قد میں اضافے کے لئے اپنے قبیلے کے لوگوں کو الگ تھلگ رکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں معاملات دن بدن گھمبیر ہوتے چلے جا رہے ہیں۔

احمد شاہ ابدالی (۷۳۔ ۱۷۲۰ء) نے ۱۷۴۷ء میں دیگر افغان سرداروں کی مدد سے کابل اور قندھار کو صفوی بادشاہت سے آزاد کروایا اور تاریخ افغانستان میں پہلی مرتبہ فعال حکومت قائم کی۔ صفویوں کی حکومت کے خلاف اپنی مملکت کی مغربی سرحدوں کا دفاع مؤثر بنایا اور پنجاب و سندھ میں تعینات فارسی افواج پر حملے شروع کر دیئے۔ ان حملوں میں قبائلی سوچ کے علاوہ اس کی "سُنّی مسلم" سوچ بھی کارفرما تھی۔ شیعوں کے خلاف نفرت کو قبائلی تفاخر کے ساتھ ملا کر احمد شاہ ابدالی نے بڑی تیز رفتاری سے اپنی سلطنت کی سرحدیں وسیع کرنی شروع کر دیں۔ اس نے اپنے دورِ حکمرانی کی چوتھائی صدی میں کشمیر اور سندھ حاصل کرنے کے علاوہ مغلوں کے پایۂ تخت دہلی کے خلاف بھی یورشیں کیں۔ ایک دفعہ مغل افواج نے احمد شاہ ابدالی کو دہلی کے باہر شکست بھی دی۔ اس وقت مقابلہ کرنے والی مغل فوج کا حجم افغان فوج سے پانچ گنا زیادہ تھا' لیکن اس کے باوجود احمد شاہ ابدالی نے مسلمانوں کو غیر مسلم حکمرانوں کے ظلم و ستم سے بچانے کے لئے دہلی پر کئی حملے کئے۔ ہندوستان پر اس کا سب سے مؤثر حملہ ۱۷۵۹ء میں ہوا جب شاہ ولی اللہ شہید (۶۲۔ ۱۷۰۳ء) نے اسے مرہٹوں کے خلاف مسلمانوں کی مدد کے لئے پکارا۔

شاہ ولی اللہ کا شمار اپنے وقت کے عظیم آئمہ کرام میں ہوتا ہے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ ہندو مرہٹوں کی بڑھتی ہوئی طاقت بالآخر کمزور ہوتے ہوئے مغل دربار کو کھا جائے گی۔ اس کے لئے انہوں نے افغان عسکری مدد حاصل کرنے کا پروگرام بنایا۔ مرہٹے ۱۷۵۸ء میں نہ صرف لاہور پر قابض ہو چکے تھے بلکہ آگے بڑھتے ہوئے اٹک پر قبضہ کرنے کی تیاریوں میں بھی مصروف تھے۔ انہوں نے دیگر کئی علاقوں پر بھی قبضہ کر کے اپنی مقبوضات میں اضافہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ مرہٹہ طاقت مغل دربار کے لئے اس قدر خطرناک تھی کہ مغلیہ سلطنت وقتی طور پر اس کے آگے مٹتی ہوئی دکھائی دینے لگی احمد شاہ ابدالی نے شاہ ولی اللہ کی درخواست پر ۱۷۵۹ء میں لاہور پر مرہٹوں کا قبضہ ختم کرنے کے بعد پانی پت کی طرف یلغار کی۔ اس نے ۱۷۶۱ء میں پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کی ٹڈی دل فوج سے مقابلہ کیا اور ۵۰ ہزار مرہٹہ سپاہیوں و سالاروں کو

موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس طرح مرہٹوں کی طاقت کو مکمل طور پر ختم کرنے کے بعد دہلی کا رخ کیا۔ لیکن اسی دوران قبائلی جھگڑوں نے سر اٹھانا شروع کر دیا۔ مرہٹوں کے خاتمے کی صورت میں "ایک بڑا دشمن" منظر سے غائب ہو چکا تھا۔ اس لئے افغان قبائلی فطرت کے عین مطابق ان کا اب اکٹھا رہنا مشکل ہونے لگا اس لئے اپنی حکمرانی کو یہاں مستحکم کئے بغیر احمد شاہ ابدالی کو واپس لوٹنا پڑا۔ لیکن اس نے مغل مسلمانوں کی حکمرانی کے خلاف ابھرتی ہوئی ایک ہندو طاقت کو ہمیشہ کے لئے دفن کر دیا۔ تاریخ نویس اور تجزیہ نگار احمد شاہ ابدالی کی ہندوستان پر یلغاروں کو ایک اور نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں۔ ان کے مطابق احمد شاہ ابدالی نے مرہٹوں کو ختم کر کے ایک ایسی طاقت کا خاتمہ کر دیا جو ہندوستان کو انگریزوں کے ظلم و ستم اور غلامی سے بچا سکتی تھی۔ لیکن احمد شاہ ابدالی نے سینکڑوں میل دور سے آ کر ہندوستان کا دفاع کرنے والی اس طاقت کا خاتمہ کر کے ہندوستان پر برطانوی سامراج کی گرفت قائم کرنے کی راہ ہموار کی۔ یہ ان تجزیہ نگاروں کی رائے ہے جو اپنے آپ کو انگریز دشمن اور آزادیٔ ہند کا علمبردار قرار دیتے ہیں۔ یہی تجزیہ نگار بعد میں کانگریس کے کردار کے حامی بھی رہے ہیں۔ حالانکہ کانگریس نے مسلمانوں کی قوتِ مدافعت کو ختم کرنے کے لئے انگریزوں کا جس انداز میں ساتھ دیا وہ ایسے تجزیہ نگاروں کو شاید دکھائی نہیں دیتا۔ دراصل یہ تجزیہ نگار مسلم دشمنی میں اس قدر اندھے ہو کر حالات کا مطالعہ و تجزیہ کرتے ہیں کہ انہیں دیگر حقائق نظر ہی نہیں آتے۔ اسی قبیل کے تجزیہ نگاروں نے اب یہ بھی کہنا شروع کر دیا ہے کہ اب افغان مجاہدین نے روسی عسکری طاقت کو ضعف پہنچا کر عالمی طاقت کا توازن بگاڑ دیا ہے۔ ان کے مطابق سوویت یونین کے خاتمے کے بعد سرد ست دنیا میں "ایک طاقتی نظام" " " قائم ہو گیا ہے، جس سے امریکی سامراجیت اور بھی ننگی ہو کر تیسری دنیا کے سامنے آ گئی ہے۔ اب امریکہ کے جارحانہ عزائم کے راستے میں کوئی طاقت نہیں رہی ہے اور اس سارے "بگاڑ" کی ذمہ داری بھی افغان مجاہدین پر عائد کر دی گئی ہے۔ انہیں اشتراکی روس کے وسط ایشیا اور دیگر مشرقی یورپی ممالک پر ظلم و ستم تو نظر نہیں آتے، لیکن افغانوں کا اپنے وطن و دین کا دفاع کرتے ہوئے "روسیوں کو پیٹنا اور ہزیمت سے دوچار کرنا" برا بُرا لگتا ہے۔ ایسے تجزیہ نگاروں کی آراء افغان مجاہدین نے برطانوی استعماری دور میں بھی غلط ثابت کر دی تھیں اور سوویت افواج کے افغانستان میں داخلے کے بعد سے لے کر مکمل عسکری ہزیمت تک بھی غلط ثابت کر دی ہیں۔ افغانوں کے ماضی پر نظر رکھنے والے مسلم دانشوروں کی رائے کے مطابق مسئلہ افغانستان کے حل کے متعلق سیکولر اور متعصب تجزیہ

نگاروں کے تجزیئے انشاء اللہ اب بھی غلط ہی ثابت ہوں گے' کیونکہ حقیقی تجزیہ نگاروں کے لئے افغانوں کے جس قبائلی نظم و نسق اور تاریخی روایات کو جاننے کی ضرورت ہے وہ ایسے تجزیہ نگاروں کی نظروں سے اوجھل ہے۔ ابدالیوں کے روایتی دشمن غلزئیوں کو نادر شاہ نے شکست دے کر کمزور کر دیا' اس کے بعد وہ کبھی بھی طاقت حاصل نہ کر سکے۔ ابدالیوں کے دوسرے دشمن پشتونوں کا خیال تھا کہ احمد شاہ سدوزئیوں اور محمد زئیوں کی باہمی چپقلشوں کو نمٹا تا رہے گا اس لئے اس سے خائف ہونے کی ضرورت نہیں۔ لیکن نوجوان احمد شاہ نے بڑی بے دار مغزی سے حالات کو اپنے حق میں کر لیا پھر ایک انتہائی اہم خوش قسمتی نے بھی اس کی مدد کی۔ احمد شاہ کے قندھار پہنچنے سے قبل شہر کے قریب ایک کارواں گزر رہا تھا۔ جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بادشاہ فارس کا تھا۔ احمد شاہ نے اس خزانے پر قبضہ کر کے اسے قبائلی سرداروں اور اپنے حامیوں کے درمیان تقسیم کر دیا۔ قزلباشوں کا ایک گروہ' جو اس خزانے کی حفاظت پر مامور تھا نئے بادشاہ سے مل گیا اور اسے احمد شاہ نے اپنے دربار میں انتظامی عہدے بھی دے دیئے یہی قزلباش اب بھی افغانستان کے ریاستی ڈھانچے کی تنظیم میں اہم عہدوں پر فائز ہیں۔ قندھار میں داخل ہو کر نئے بادشاہ نے اپنے ماموں عبدالغنی خان سمیت کئی بھگوڑوں کو پھانسی پر لٹکا دیا۔ اس کے ماموں پر نادر شاہ افشاری کے ساتھ مل کر ابدالیوں کے خلاف سازشیں کرنے کا الزام تھا۔ یہی ماموں نادر شاہ کی طرف سے قندھار کا گورنر بھی رہ چکا تھا۔ قندھار پر قبضے کے بعد احمد شاہ درانی کے سنہری دور کا آغاز ہوا۔ یہ دور پھر کبھی لوٹ کر نہ آ سکا۔ تقریباً نصف صدی افغانستان پر درانی اقتدار قائم رہا۔ اس کی سرحدیں وسط ایشیا' دہلی اور کشمیر سے لے کر بحیرہ عرب تک پھیلی ہوئی تھیں۔ سلطنتِ عثمانیہ کے بعد درانی سلطنت مسلمانوں کی دوسری بڑی سلطنت تھی۔ ۱۷۵۴ء میں ہندوستان سے واپس لوٹتے ہوئے احمد شاہ ابدالی نے یہاں ابدالی سلطنت کے وفاداروں کو اعلیٰ مناصب پر فائز کر دیا۔ جونہی احمد شاہ قندھار پہنچا اسے اپنے قتل کی سازش کا پتہ چلا۔ اس نے نہ صرف منصوبہ سازوں کو قتل کروا دیا بلکہ اس سازش میں شامل افراد کے قبیلوں کے دس دس افراد کو بھی قتل کروا دیا۔ یہاں یہ بات بڑی حیرانگی کی ہے کہ احمد شاہ ابدالی جب پایۂ تخت قندھار سے باہر گیا ہر مرتبہ اس کی حکومت کا تختہ الٹنے کی سازشیں کی گئیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی بھی پشتون یہ پسند نہیں کرتا کہ اس پر کسی کی حکمرانی ہو۔ پھر خاص طور پر جب حکمران کا تعلق کسی دوسرے قبیلے سے ہو۔ دورِ حاضر میں افغان مجاہدین کے درمیان پائی جانے والی نا اتفاقی کا ایک سبب یہ قبائلی اندازِ فکر بھی ہے کہ ہر کوئی رہنما یہ چاہتا ہے کہ اقتدار میں اسے "بڑا حصہ" ملے جو کہ

منطقی اور عملی اعتبار سے ممکن نہیں ہے۔

داخلی سازشوں پر قابو پانے اور ہندوستان کے مغل حکمرانوں سے معاملہ کرنے کے بعد احمد شاہ نے ۲۵ ہزار افراد پر مشتمل ایک مؤثر قوت تیار کی اور فارسی حکمرانوں کے خلاف مہم شروع کر دی۔ پہلے قدم کے طور پر ہرات پر حملہ کیا جس پر امیر خان کی حکمرانی تھی، جو یہاں شاہ رخ ''حکمرانِ فارس'' کے آشیرباد سے حکمران تھا۔ شاہ رُخ نادر شاہ افشاری کا پوتا تھا، جس نے ۹۵۔ ۱۷۴۸ء تک خراسان پر حکمرانی کی۔ ہرات ۹ ماہ تک محاصرے کی حالت میں رہا اور بالآخر طویل خون خرابے کے بعد یہاں پر ابدالیوں کا قبضہ ہو گیا۔ اس کے بعد شاہِ افغانستان نے شاہ رخ کے دارالحکومت مشہد کا رخ کیا اور ایک جنگ کے بعد اس پر قابض ہو گیا، اور یہاں شاہ رخ کو حکمران ہی چھوڑ کر اس نے نیشاپور کا رخ کیا۔ لیکن یہاں ابدالیوں کو شکست ہوئی اور احمد شاہ کو واپس ہرات لوٹنا پڑا۔ ۱۷۵۱ء میں احمد شاہ نے زیادہ تیاری کے ساتھ نیشاپور پر حملہ کیا۔ ۵۰۰ پونڈ وزنی گولا پھینکنے والی توپ نے احمد کے حق میں فیصلہ کن کردار ادا کیا اور نیشاپور پر اس کا دوبارہ قبضہ ہو گیا واپس قندھار لوٹنے سے پہلے احمد شاہ نے ہندوکش کے شمالی علاقوں کو اپنی سلطنت میں شامل کرنے کے لئے ایک فوج بھیجی۔ استر آباد کے ترکمانوں، میمانا کے ازبکوں، بلخ، قندز، خان آباد اور بدخشان کے تاجکوں کے علاوہ بامیان کے ہزارہ جات نے درانی شاہ کی حاکمیّت تسلیم کر لی۔ ۱۷۵۱ء میں تیسری مرتبہ احمد شاہ نے ہند پر لشکر کشی کی اور پنجاب کے باغی میرمانو کو شکست دے کر علاقے میں اپنی برتری ثابت کر دی۔ میر مانو نے احمد شاہ کی فارس کے علاقوں میں معروضات کے علی الرغم تخت دہلی سے اپنی وفاداریاں جوڑ کر احمد شاہ درانی کو ٹیکس ادا کرنے سے انکار کر دیا تھا، جس کا بدلہ لینے کے لئے احمد شاہ نے میرمانو پر حملہ کیا تھا۔ مغل بادشاہ نے بھی پنجاب کے علاقوں پر احمد شاہ کی حاکمیّت تسلیم کر لی تھی۔ یہاں سے قندھار واپسی پر احمد شاہ نے ایک فوج کشمیر کی طرف بھیجی تاکہ اسے بھی اپنی سلطنت میں شامل کر سکے۔

تھوڑے ہی عرصے بعد جب ۱۷۵۳ء میں میرمانو کا انتقال ہوا تو مغل بادشاہ نے اپنے تین سالہ بیٹے کو پنجاب کا گورنر مقرر کر دیا اور میرمانو کے ۲ سالہ بیٹے کو اس کا نائب۔ میرمانو کی بیوہ مغلانی بیگم نے سلطنت کے معاملات اپنے ہاتھ میں لے لئے۔ یہ عورت ذہنی طور پر عیاش تھی اس لئے سلطنت کے معاملات بہتر طور پر نہ چل سکے۔ احمد شاہ درانی نے چوتھی مرتبہ ہندوستان کا رُخ کیا۔ لاہور فتح کرنے کے بعد دہلی کا رُخ کیا اور ۱۷۵۷ء میں اس پر قبضہ کیا۔ مغل بادشاہ عالمگیر ثانی نے پنجاب، کشمیر اور سندھ پر احمد شاہ کی عمل داری کو تسلیم کر لیا، جس کے بدلے میں

اس نے عالمگیر ثانی کی تخت دہلی پر حکمرانی قائم رہنے دی۔ گرمیوں کی آمد سے قبل احمد شاہ نے مرہٹوں اور جاٹوں کی کمر توڑنے کے لئے ایک فوج آگرہ کی طرف بھیجی۔ اپنے ایک بیٹے تیمور کو لاہور کا حاکم مقرر کیا اس کے بعد احمد شاہ واپس افغانستان لوٹ گیا۔

احمد شاہ کا بیٹا تیمور اپنی سلطنت کے معاملات ٹھیک طرح نہ نبھا سکا۔ شمالی ہند اور پنجاب کے علاقوں میں بغاوت پھوٹ پڑی جسے ایک افغان جرنیل جہان خان نے وقتی طور پر دبا دیا' لیکن سکھوں نے مرہٹوں کی ابھرتی ہوئی قوت کے ساتھ سازباز کر کے افغانوں کو یہاں سے نکالنے کا پروگرام بنانا شروع کر دیا تھا۔ اپریل ۱۷۵۸ء میں ہندو جنگجو مرہٹوں اور سکھوں کی ایک فوج رگوناتھ راؤ کی قیادت میں مہاراشٹر سے روانہ ہوئی' لاہور پر حملہ آور ہو کر وہ افغانوں کو یہاں سے نکالنا چاہتے تھے۔ دوسری طرف ریاست قلات میں ناصر خان' بر ھوائی بلوچ نے احمد شاہ کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر دیا۔ احمد شاہ نے اپنی ساری قوت کو مرہٹوں سے مقابلہ کرنے کے لئے مجتمع رکھا اور ناصر خان کو اپنے علاقے پر حکمرانی کرنے کا حق دے دیا۔ اس کے بدلے میں اس سے وعدہ لیا کہ وہ کسی بھی جنگ کے دوران احمد شاہ کو مطلوبہ جنگجو مہیا کرے گا۔ اس طرف سے مطمئن ہو کر احمد شاہ نے اکتوبر ۱۷۵۹ء میں پانچویں دفعہ ہندوستان کا رخ کیا اور ۱۷۶۱ء تک مختلف جنگی معرکوں میں مرہٹہ قوت کا سر کچل کر رکھ دیا۔ ۱۷۶۱ء میں وطن واپسی سے پہلے یہاں مغل شاہی کو مضبوط بنانے کی کوشش کی۔ پھر ایک سال تک پنجاب اور قندھار کے درمیان معاہدہ امن قائم رہا' لیکن پھر سکھوں کی قوت اُبھرنی شروع ہوئی۔ احمد شاہ نے محسوس کیا کہ علاقے میں طاقت کا توازن ایک بار پھر بگڑنے لگا ہے اس لئے فروری ۱۷۶۲ء میں چھٹی مرتبہ احمد شاہ ہندوستان پر لشکر زن ہوا' اور لاہور کا محاصرہ کر کے یہاں سکھوں کی قوت کو پاش پاش کرنے کی کوشش کی۔ امرتسر کا "شہرِ مقدّس" بھی اسی محاصرے کی زد میں آیا اور وقتی طور پر سکھ دب گئے۔ یہی وجہ ہے کہ احمد شاہ ۱۷۶۴ء میں ساتویں مرتبہ یہاں آیا اور سکھوں پر کاری ضرب لگائی لیکن اب سکھوں نے براہِ راست مقابلہ کرنے کی بجائے وقتی طور پر دب جانے کی پالیسی پر عمل کیا' لیکن شاہ کی واپسی کے بعد ایک بار پھر انہوں نے سرکشی اختیار کی بالآخر ۱۷۶۶ء میں آٹھویں مرتبہ احمد شاہ بڑے طمطراق سے یہاں وارد ہوا اور لاہور پر قبضہ کرنے کے بعد امرتسر کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ لیکن عملاً سکھ ۱۸۴۹ء تک اپنی سرزمین کے حکمران رہے' حتّٰی کہ انگریزوں نے ان کی قوت پاش پاش کر دی۔ ویسے ۱۷۶۹ء میں دو مرتبہ احمد شاہ نے پنجاب پر اپنا کنٹرول بحال کرنے کی کوشش کی لیکن اسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ احمد شاہ کی ساری زندگی جنگ وجدل میں گزری۔

قندھار اور بخارا کے حصول کے لئے اسے جنگ نہیں کرنی پڑی کیونکہ بخارا کے امیر مراد بیگ نے اسے "خرقہ" پیش کیا اور اس کے نام ایک مسجد بھی تعمیر کی۔ یہ خرقہ اور مسجد اب بھی بخارا میں موجود ہے اور احمد شاہ ابدالی کی یاد دلاتی ہے۔ اسی دور میں دریائے آمو کو ایک سرحد کے طور پر شہنشاہِ افغانستان اور امرائے بخارا و دیگر وسط ایشیائی سرحدی ریاستوں نے مان لیا تھا۔ ۱۷۷۳ء میں عظیم سلطنت کا بانی اپنے خالقِ حقیقی سے جاملا۔ اس کے بعد احمد شاہ کے جانشینوں میں چپقلشیں شروع ہو گئیں۔ احمد شاہ نے درانی قبیلے کی ۹ شاخوں کے سدوزئی لیڈروں کے ساتھ مل کر بڑے بہترین انداز میں حکومت کی تھی چھوٹے چھوٹے قبائلی سرداروں کو بڑے باوقار انداز میں ساتھ ملایا اور پھر اپنے زور آور اقتدار کی لہریں ہندوستان، کشمیر، وسط ایشیا اور ایرانی صفوی بادشاہی کے ایوانوں تک پہنچائیں۔ افغانوں کو ایک مربوط و مضبوط قوم کی لڑی میں پرویا، لیکن اس کے انتقال کے بعد درانی سلطنت بکھرنی شروع ہو گئی۔ قد آور شخصیت کی عدم موجودگی کے سبب مرکز گریز قوتوں نے سر اٹھانا شروع کر دیا حتیٰ کہ ۱۷۹۳ء میں تیمور شاہ کی وفات کے بعد سے لے کر ۱۸۸۰ء تک جب امیر عبدالرحمٰن نے اقتدار سنبھالا تو درانی سلطنت کئی ٹکڑوں میں بٹ رہی تھی بارک زئی اور محمد زئی قبیلے آپس میں علاقائی اقتدار کے لئے لڑنے لگے دونوں پشتون قبیلے درانی تھے۔ کابل، قندھار، ہرات اور شمالی ازبکی علاقوں پر کنٹرول حاصل کرنے کے لئے رسہ کشی نے درانی سلطنت کی چولیں ہلا دی تھیں۔ امیر عبدالرحمٰن نے اپنے دور میں ڈیورنڈ لائن کے ذریعے افغانستان کو ایک جغرافیائی وحدت کے طور پر منوالیا۔ ۱۹۰۱ء میں اس کا انتقال ہوا اور اس کا بڑا بیٹا حبیب اللہ افغانستان کا امیر بنا۔ گو امیر عبدالرحمٰن کی کئی بیویاں تھیں اور بہت سی اولادیں بھی تھیں لیکن اس نے سب کو کابل میں اپنے پاس ہی رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی وفات کے وقت بڑا بیٹا تخت نشین ہوا اور دوسروں کو سازشیں کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ اس کے بعد عبدالرحمٰن نے ایک ایسی پالیسی بنائی تھی جس کی وجہ سے اس کے خلاف سازشوں کو پھلنے پھولنے کا موقع نہ مل سکا۔ اس کے فرمان کے مطابق کسی افغان کو افغانستان سے باہر آزادانہ سفر کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ جس کسی نے افغان سرحدوں سے باہر جانا ہوتا تھا اسے سرکار کی اجازت لینی پڑتی تھی۔ یہ قانون ۱۹۶۴ء تک روبہ عمل رہا۔ امیر عبدالرحمٰن نے علماء کو بھی قانون کا پابند بنانے کی کوشش کی تھی۔ اس مقصد کے لئے تمام اوقاف بھی سرکاری کنٹرول میں لے لئے گئے تھے۔ اس کے بڑے بیٹے اور نئے امیر حبیب اللہ نے اپنے باپ کی پالیسیوں پر عمل پیرا ہوتے ہوئے داخلی طور پر استحکام حاصل کرنے کی جدوجہد جاری رکھی۔ اس نے انگریزوں کو اپنی سرحدوں سے دور رکھنے

میں ہی عافیت محسوس کی۔ اپنی اس پالیسی میں وہ کافی حد تک کامیاب بھی رہا۔ اپنی مملکت میں اس نے سماجی اور سیاسی شعبوں میں ترقی کے علاوہ لوگوں کی معاشی حالت بہتر بنانے کے لئے بھی پالیسیاں وضع کیں جو ظاہر شاہ کے دور تک جاری رہیں۔ ۱۹۱۹ء میں اپنی وفات تک امیر حبیب اللہ نے افغانستان کو برطانوی عمل داری سے آزاد کروالیا تھا اور وہ آزادانہ خارجہ پالیسی پر عمل پیرا ہو چکا تھا۔ اور یہی بات انگریزوں کو سخت ناگوار گزر رہی تھی۔ ۲۰؍ فروری ۱۹۱۹ء میں دو نامعلوم افراد نے امیر حبیب اللہ کو قتل کر دیا۔ اس کے قتل کے بعد امان اللہ نے اقتدار پر قبضہ کیا کیونکہ حبیب اللہ کے ایک بھائی نصر اللہ نے امان اللہ کے دوسرے بھائیوں کے ساتھ مل کر اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا تھا لیکن امان اللہ نے اپنی لیاقت اور شجاعت ثابت کر دی اور تخت شاہی پر قبضہ کر لیا۔ اس نے اپنے باپ حبیب اللہ کے قتل اور غداری کے الزام میں اپنے چچا اور دیگر کئی افراد کو قید بھی کر دیا۔ اس کے بعد بڑے پُراعتماد طریقے سے حکمرانی کا آغاز کیا۔ اپنے والد کی اختیار کردہ آزاد خارجہ پالیسی کو جاری رکھنے کے عزم کا اظہار کیا۔ داخلی یورشوں پر ابتدا میں ہی قابو پا کر نئے امیر نے پُراعتماد طریقے سے حکمرانی کا آغاز کیا۔ ۱۸۵۷ء میں برصغیر کی جنگ آزادی نے امیر افغانستان کی عسکری اہمیت میں اور بھی اضافہ کر دیا۔ اگر اس وقت امیر افغانستان دوست محمد صرف انگریزوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیتا تو قبائلیوں کی لہریں اٹھ اٹھ کر ہندوستان کی طرف جاتیں اور جنرل بخت خان کی طرح انگریزوں کے اکھڑتے ہوئے قدم بالکل ہی اکھاڑ دیتیں۔ پھر انگریزوں کو شاید ایک صدی اور انتظار کرنا پڑتا۔ "ہندی چڑیا" پر قبضہ کرنے کا خواب پریشان ہو جاتا لیکن امیرِ افغانستان نے ایسا نہ کیا۔ وائسرائے ہند لارڈ لارنس نے اپنی پیشہ وارانہ زندگی میں پنجاب اور قبائلی سرحدی علاقوں کے لوگوں کے بارے میں براہ راست سبق سیکھا اور نتیجہ نکالا کہ ان لوگوں کے معاملات میں دخل اندازی برطانوی راج کے لئے نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔ لارنس کی اسی پالیسی کی وجہ سے دہلی اور کابل پر بڑے عرصے تک امن کی حکمرانی قائم رہی، لیکن ۱۸۶۳ء میں امیر افغانستان دوست محمد کے انتقال کے بعد اس کے سولہ بیٹوں کے درمیان حصولِ اقتدار کی جنگ شروع ہو گئی۔ دوسری طرف روسی حکمرانوں کی دلچسپیاں بھی اس علاقے میں بڑھنی شروع ہو گئیں۔ لارڈ لارنس نے برطانوی پارلیمینٹ کو مشورہ دیا کہ وہ روسیوں کو پیغام بھجوا دے کہ "ہندوستان کی طرف ایک خاص نکتے سے آگے پیش قدمی سلطنتوں کے درمیان جنگ" ہو گا لیکن برطانوی سرکار نے اس طرف توجّہ نہ دی کہ روس اور برطانیہ و علاقے میں اپنا اپنا دائرۂ اثر مقرر کر کے عدم جارحیّت کے اصول کو مان لینا چاہئے۔ لیکن جب ایسا

نہ ہوا تو لارنس نے مزید کہا کہ ہمیں روسیوں کو پیغام دے دینا چاہئے کہ "ایک خاص نکتے سے آگے ہندوستان کی طرف پیش قدمی کا مطلب دونوں سلطنتوں کے درمیان جنگ" ہو گا لیکن برطانیہ روس کے ساتھ کسی قسم کا جھگڑا مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ ۱۸۰۹ء میں لارنس کے ہندوستان چھوڑنے کے ایک برس قبل سر ہنری رالنسن (۹۵-۱۸۱۰ء) نے برطانوی حکومت کو "اپنے اثرات کابل تک پہنچانے" کا مشورہ دیا۔ حتیٰ کہ حکومتِ برطانیہ کو متنبہ کرتے ہوئے لارنس نے لکھا۔ "امن کی خاطر، تجارت کی خاطر، مادی و اخلاقی ترقی کی خاطر .... افغانستان میں براہِ راست مداخلت انتہائی ضروری ہو چکی ہے۔" لیکن برطانوی پارلیمینٹ میں اس آواز کو پذیرائی نہ مل سکی۔ اس کے اگلے سال روسیوں نے تاشقند پر قبضہ کر لیا اور اسی سال کے آخر میں دریائے آمو کے شمال میں پیش قدمی شروع کر دی۔ اس وقت کابل پر دوست محمد کے بڑے بیٹے شیر علی کی حکمرانی تھی اور وہ بھی انگریزوں کو اپنی سلطنت سے باہر رکھنے کی پالیسی پر گامزن تھا۔ لارڈ لارنس کے بعد لارڈ میو کو ہند میں برطانوی مفادات کی نگرانی سونپی گئی۔ اس نے شیر علی کو روپیہ واسلحہ وافر مقدار میں مہیا کیا اور کسی بھی غیر ملکی جارحیت کے وقت مدد کا وعدہ بھی کیا۔ لارڈ میو افغانستان کو برطانوی دائرہ اثر میں خیال کرتا تھا اس لئے دل کھول کر امداد مہیا کی جا رہی تھی۔ ۱۸۷۲ء میں اس ہندی وائسرائے کو جزائر انڈیمان کی ایک جیل میں دورے کے دوران قتل کر دیا گیا۔ اگلے سال روسیوں نے خیوا پر چڑھائی کر دی اور پھر ایسا محسوس ہونے لگا جیسے ان کا اگلا قدم افغانستان کی طرف بڑھے گا۔ امیرِ افغانستان شیر علی نے برطانیہ کی طرف اور امداد کے لئے دیکھنا شروع کر دیا۔ لیکن لارڈ میو کے بعد آنے والے وائسرائے نے سرد مہری کا مظاہرہ کیا کیونکہ وہ اخراجات کم کرنے کی پالیسی اختیار کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس لئے سابق لارڈ لارنس کی عدم جارحیت کی پالیسی کو عملی جامہ پہنانے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس دوران روسیوں کو عسکری طور پر سبق سکھانے کا فیصلہ بھی ہوا کیونکہ شیر علی نے برطانوی سرکار کو آنکھیں دکھانی شروع کر دی تھیں۔ اس نے روسی مشن کو خوش آمدید کہہ کر انگریزوں کو چڑا دیا تھا نومبر ۱۸۷۸ء میں افغانوں کو سبق سکھانے کے لئے لارڈ لٹن نے دوسری اینگلو افغان جنگ شروع کر دی۔ ۲۰ ہزار سپاہ کابل پر حملہ آور ہوئیں۔ ۷۰ توپوں اور دیگر ہتھیاروں سے مسلح یہ فوج بالا حصار تک جا پہنچیں لیکن ۱۸۷۹ء ۲ ستمبر کابل میں موجود تمام فوجی و غیر فوجی افراد کو قتل کر دیا گیا۔ اس طرح افغانوں کو سبق سکھانے کا خواب ادھورا رہ گیا۔

شیر علی کے بھتیجے عبدالرحمان خان کے اقتدار میں آتے ہی برطانیہ نے اسے خوب امداد

دیناشروع کر دی۔ دوسری افغان جنگ کے دوران ہتھیائے گئے علاقے بھی نئے امیر کے حوالے کر دیئے گئے اور یہ سارے معاملات اس طرح طے کئے گئے کہ کابل برطانوی ہند کے نئے قبائلی علاقے سے ۵۰ میل دور رہ گیا مہمند اور آفریدی قبائل اس علاقے کے نگران ور کھوالے بنے جنہیں برطانوی سرکار " سالانہ ادائیگیاں " کرتی تھی تاکہ وہ یہاں امن قائم رکھیں روس نے ۱۸۸۱ء میں خیوا پر اور ۱۸۸۴ء میں مرو پر قبضہ کر کے برطانوی پالیسی کو چیلنج کرنا شروع کر دیا۔ برطانیہ نے محسوس کرنا شروع کر دیا کہ اس طرح روس کا مقابلہ ممکن نہیں ہو گا اس لئے برطانوی سرکار نے روسی قیادت کو افغانستان کی سرحدیں طے کرنے کے لئے ایک بین الاقوامی سرحدی کمیشن قائم کرنے کی تجویز پیش کر دی۔ امیر عبدالرحمٰن خان ۱۸۹۳ء تک اس طرح کی سرحد بندی کے خلاف رہا لیکن پھر بالآخر اسے سرحدی کمیشن کی تجاویز سے اتفاق کرنے کے علاوہ کوئی چارہ کار دکھائی نہ دیا کہ برطانوی ہند اور افغانستان کے درمیان واضح سرحدیں قائم کر دی جائیں برطانوی ہند کے خارجہ سیکرٹری سر مورٹیمر ڈیورنڈ SIR MORTIME DURAND نے کابل کا دورہ کیا تاکہ ہند افغان سرحدات کے متعلق معاملات طے کئے جائیں سر ڈیورنڈ نے امیر عبدالرحمٰن کو دی جانے والی امداد بھی دگنی کر دی اور دیگر کئی ایسی مراعات دینے کا وعدہ بھی کیا جس کی وجہ سے امیرِ افغانستان سر ڈیورنڈ کی سرحد بندی کی تجاویز رد نہ کر سکا۔ یہی سرحدات اب پاک افغان بارڈر یا ڈیورنڈ لائن کہلاتی ہیں اور پاک افغان تنازعے کی بنیادی وجہ ہیں۔ انگریزوں کا ڈیورنڈ لائن کھینچنے کا ایک مقصد تو بلوچی اور شمال مغربی سرحدی قبائلی علاقوں کو قانوناً برطانوی عملداری میں لانا تھا دوسرا اس کے ذریعے روسی قیادت کے ساتھ اس علاقائی تنازعے کو طے کرنا تھا۔ ڈیورنڈ لائن کھنچتے ہی افغانستان تاریخ میں پہلی دفعہ ایک جغرافیائی وحدت کے طور پر سامنے آیا ایک نقشہ تیار ہوا جس میں افغانستان برطانوی اور روسی سلطنت کے درمیان ایک (BUFFER ZONE) کے طور پر ابھرا۔ اس علاقائی تقسیم نے صدیوں پرانے افغانوں کو تقسیم کر دیا تھا یہ قبائل رزق کی تلاش میں اِدھر اُدھر حرکت کرتے تھے کبھی ہندوکش کے پہاڑوں میں اور کبھی ہندوکش کے اس طرف ڈیورنڈ لائن کے اس طرف میدانوں میں خیمہ زن ہوتے تھے لیکن ڈیورنڈ لائن نے ان کی " حرکت کی آزادی " کو محدود کر دیا تھا اس لئے انہوں نے اسے قبول نہ کیا۔ اس تقسیم سے برطانیہ 'روس کی GREAT GAME عظیم کھیل تو وقتی طور پر ختم ہو گیا لیکن ایک "چھوٹا کھیل " MINI GAME شروع ہو گیا جس سے بچنے کے لئے برطانیہ کو ایجنسیاں قائم کرنی پڑیں جواب تک قبائلی علاقوں میں کام کر رہی ہیں یورشوں اور ان پر قابو پانے کا یہ سلسلہ جنگِ عظیم دوم تک جاری رہا۔

جنگِ عظیم کے دوران گوافغانستان نے اپناعدمِ وابستگی کا تاثر قائم رکھااور جرمن سے امداد قبول نہ کی لیکن ظاہر شاہ نے جنگ کے دوران ہی یہ محسوس کر لیا تھا کہ اب برطانوی راج یہاں ہند میں قائم نہیں رہ سکے گااس لئے ظاہر شاہ نے ڈیورنڈ لائن کے ذریعے برطانوی ہند میں شامل کئے جانے والے قبائلی علاقوں کو واپس افغانستان میں شامل کرنے کا فیصلہ کیا۔ جنگ میں ''غیر وابستہ'' رہنے کے انعام کے طور پر اپنے علاقوں کی واپسی کی سوچ فطری تھی۔ کچھ علاقے دوسری اینگلو افغان جنگ کے دوران بھی ہتھیائے گئے تھے اب انہیں بھی واپس لیا جاسکتا تھا۔ ''پشتونستان'' کا نعرہ اسی سوچ کا عکاس ہے کابل نے اسی سوچ کے ساتھ پٹھانوں/پشتونوں کی سرزمین کا نعرہ بلند کیا تاکہ شمال مغربی سرحدوں پر بسنے والے پشتونوں یا پٹھانوں کو اکٹھا کیا جاسکے۔

خدائی خدمت گار تحریک کے بانی عبدالغفار خان نے انگریز دشمنی میں اس نعرے کو اپنالیا اور پھر قوم پرست لیڈر کے طور پر شہرت پائی ۱۹۴۷ء میں برطانوی ہند کی تقسیم کے وقت یہ مسئلہ حل نہیں کیا گیا افغان حکمرانوں کو اس بات پر غصہ تھا کہ انگریزوں نے یہاں سے نکلتے وقت ان کے علاقے ان کے حوالے کیوں نہیں کئے بلکہ انہیں پاکستان کے سپرد کر دیا ہے پاکستانی حکمران یا مسلم لیگی لیڈر ان علاقوں کو دو قومی نظریئے کے مطابق اپنا سمجھتے ہیں ویسے بھی ریفرنڈم کے ذریعے پٹھانوں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ دو قومی نظریئے کے تحت بننے والی مسلم ریاست پاکستان میں شامل ہوں گے غفار خان کی قوم پرست تحریک ۱۹۴۷ء میں تقسیمِ ہند کے وقت اس حد تک فعال تھی کہ قیامِ پاکستان کے بعد افغانستان کے ساتھ تجارتی روابط ختم کر دیئے گئے تھے شمال مغربی درّے بھی بند کر دیئے گئے تھے اور معنوی اعتبار سے جنگ کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی یہ پاک افغان تنازعہ اس حد تک بڑھ گیا تھا کہ اقوامِ متحدہ میں پاکستان کی شمولیّت کے خلاف ڈالا جانے والا واحد ووٹ حکومتِ افغانستان کا تھا۔ حکومتِ افغانستان نے جون ۱۹۴۸ء میں پاکستان کو تسلیم کر لیا اور تجارت شروع ہو گئی پاکستان نے افغانستان کو تجارتی سہولیات کی فراہمی کے علاوہ امداد دینے کا وعدہ بھی کیا پھر ایک سال بعد ظاہر شاہ نے ڈیورنڈ لائن کو ''فرضی لائن'' قرار دے کر ''پشتو پشتونستان'' کے مسئلے کو ایک بار پھر ہوا دینی شروع کر دی ۱۹۵۰ء میں پشتونستان کے مسئلے پر پاکستان اور افغانستان حالتِ جنگ میں آ گئے حکومتِ افغانستان نے قبائلیوں کو اسلحہ و پیسہ دے کر پاکستان میں بھیجنا شروع کر دیا پاکستان نے سینکڑوں قبائلیوں کو ''دہشت گرد'' قرار دے کر ہلاک بھی کیا۔ افغان حکمران پشتونستان کو پٹھانوں کا جائز اور قانونی مطالبہ قرار دے کر اس علاقے کو اپنے ساتھ ضم کرنا چاہتے تھے اگر ایسا ممکن نہ بھی ہو تا تو ان کی خواہش تھی کہ شمال مغربی سرحدی علاقہ

اور بلوچستان کا قبائلی علاقہ کم از کم ان کے زیرِ اثر ہی آ جائے پاکستان نے پشتونستان کے مطالبے کو کبھی بھی تسلیم نہیں کیا بلکہ اسے لسانی و گروہی اخلاقیات کے برعکس قرار دیتے ہوئے علاقے میں بسنے والے لوگوں کے گروہی مفادات کے خلاف سمجھا کیونکہ پاکستان کے بقول ان علاقوں میں پٹھان ہی نہیں بستے بلکہ براھوی، جاٹ، بلوچی اور دیگر کئی اقوام کے لوگ بھی بستے ہیں اس لئے پشتونستان کا مطالبہ ان کے مفادات کے خلاف ہے دوم اس علاقے کے لوگوں نے خود ریفرنڈم کے ذریعے پاکستان میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا تھا اس لئے اب حکومتِ کابل کا "پشتونستان" کے مسئلے کو ہوا دینا قطعاً "غیر اخلاقی ہے" لیکن افغان حکمران اس مسئلے کو ہمیشہ پاکستان پر دباؤ ڈالنے کے ایک حربے کے طور پر استعمال کرتے رہے ہیں ۱۶/ اکتوبر ۱۹۵۱ء میں لیاقت علی خان وزیر اعظم پاکستان کے قتل کی سازش کو بھی پشتونستان کے مسئلے کے ساتھ ملانے کی کوشش کی گئی کیونکہ مبیّنہ قاتل سید اکبر SAED AKBAR کا تعلق بھی پشتون قبیلے سے تھا جسے لیاقت علی خان کے قتل کی اس واردات کے دوران ہی پاکستانی پولیس نے قتل کر دیا تھا۔ اس کے بعد ایک بار پھر پشتونستان کا مسئلہ زور شور سے منظر پر آنا شروع ہوا۔ لیکن امریکہ و برطانیہ نے ڈیورنڈ لائن کی اہمیّت کے پیشِ نظر اس مسئلے کے حل کے لئے پاکستان اور افغانستان پر دباؤ ڈالنا شروع کیا اسی دباؤ کے تحت ۱۹۵۸ء میں افغانستان کے ظاہر شاہ نے پاکستان کا دورہ کیا پاکستان نے افغانستان کے ساتھ تجارت بھی بحال کی اور افغانستان کو راہداری کی سہولیات بھی مہیا کیں اس طرح وقتی طور پر پاک افغان تنازعہ دب گیا قبائلیوں کو دورِ برطانیہ کے انداز میں دی جانے والی امداد / رشوت بھی بحال ہو گئی۔ یاد رہے ڈیورنڈ لائن کا تنازعہ اور پشتونستان کا مسئلہ حل نہیں ہوا تھا بلکہ فریقین نے وقتی طور پر خاموشی اختیار کرنے پر رضامندی کا اظہار کیا تھا۔ ۱۹۱۹ء میں حبیب اللہ کے قتل کے بعد نئے امیرِ افغانستان امان اللہ خان نے جس انداز میں حکمرانی کا آغاز کیا تھا وہ انگریزوں کے لئے خطرے کی گھنٹی تھی۔ رواں صدی کے آغاز میں برطانیہ کو اس بات پر شک ہونے لگا کہ امان اللہ خان قبائلی پٹھانوں کو مسلّح کر کے ہندوستان بھجوا رہا ہے جو یہاں باغیوں کی مدد کرتے ہیں ۱۹۲۱ء میں حکومتِ ہند نے امیر امان اللہ سے مذاکرات کرنے کے لئے ایک وفد کابل بھیجا۔ ہند برطانوی سرکار امان اللہ کو روسی قیادت سے دور رکھنا چاہتی تھی، اس لئے اگر اسے بالکل بے یار و مددگار چھوڑ دیا جاتا تو اس بات کا امکان موجود تھا کہ امیر روسی قیادت کے ساتھ اپنے روابط بڑھا لے تعمیر و ترقی کے لئے سرکار نے امان اللہ کو ۴۰ لاکھ روپے پیش کئے ۱۹۲۲ء میں امیرِ افغانستان نے برطانیہ کے ساتھ ایک معاہدے پر دستخط کئے جس کی رو سے افغان سرکار کو پہلی مرتبہ پشاور سے اڑ کر آنے والے دو جنگی طیارے بھی حاصل ہوئے ان طیاروں کو جرمن پائلٹ اڑا رہے تھے حالات کی ستم

ظریفی دیکھئے جو شخص وسط ایشیا اور ہندی مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی کر کے رہنمائی کا فریضہ سرانجام دے سکتا تھا اپنے ہی بھائی بندوں کے قہر و غضب میں گھر گیا ۱۹۲۴ء میں خوست کے مینگل قبائل نے امان اللہ کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر دیا علاقائی ملاؤں نے امان اللہ کی حکمرانی کے خلاف جہاد کا فتویٰ دے کر اس بغاوت کو مزید ہوا دی امیر افغانستان ان دنوں نیا نیا برطانیہ کے حصار میں آیا تھا برطانوی جہازوں اور اسلحہ کی بنیاد پر اس نے وقتی طور پر اس بغاوت کو دبا دیا اس کے بعد امان اللہ نے اپنی بیوی کے ساتھ سرکاری محفلوں میں آنا شروع کر دیا اس سے افغانوں میں اور بھی بے چینی پھیلی اور امان اللہ کے "مغرب زدہ" ہونے کا تاثر پختہ ہوا اس سے اگلے سال وہ اپنی بیوی کو لے کر یورپ کے سرکاری دورے پر روانہ ہو گیا۔ لیکن اندرونِ ملک اس کی ہوا خاصی اکھڑ چکی تھی۔ ۱۹۲۷ء میں وہ اپنی مغرب زدہ بیوی کو لے کر یورپ کے دورے پر روانہ ہو گیا اس کے ساتھ ہی امان اللہ کے خلاف بغاوت پھوٹ پڑی کابل میں برطانوی وزیر خارجہ کے نمائندے سر فرانس ہیمفرے نے اپنے ایک افغان ایجنٹ بچہ سقہ کو ہری جھنڈی دکھائی اور اس نے علم بغاوت بلند کر دیا اس دور میں برطانوی ایئرفورس کا ایک شاندار فضائی مستقر میران شاہ میں بھی تھا یہاں برطانوی شہریوں اور اہلکاروں کی ایک بستی بھی قائم تھی مشہور زمانہ برطانوی جاسوس کردار لارنس آف عریبیا (ٹی۔ ای۔ لارنس) بھی یہیں مقیم تھا۔ لارڈ ہیمفرے نے خانہ جنگی شروع ہونے سے قبل تمام برطانوی باشندوں کو یہاں سے نکالا جب یہاں بغاوت پھوٹی تو امان اللہ روم میں تھا اس نے اپنا اگلا سفر ملتوی کر کے مسولینی سے ملاقات کرنے کا پروگرام بنایا حکومت سنبھالنے کے بعد "بچہ سقہ" نے وہ کردار ادا کرنے سے انکار کر دیا جو انگریز اس سے ادا کروانا چاہتے تھے بچہ سقہ نے بذاتِ خود حکمران بننے کی کوششیں شروع کر دیں۔ برطانوی ریاستی اہلکاروں کو بچہ سقہ سے معاملات کرنے میں دقت پیش آنی شروع ہو گئی تو انہوں نے ایک بار پھر سازشوں کے جال بننے شروع کر دیئے ۱۹۲۹ء کے اختتام سے تھوڑا عرصہ پہلے امیر امان اللہ خان کے کزن نادر خان (۱۹۳۳۔ ۱۸۸۳ء) نے بچہ سقہ کی حکومت کا تختہ الٹ کر درانی پایۂ تخت کا دوبارہ احیاء کر دیا وزیریوں اور محسودیوں نے بھی نادر خان کا ساتھ دیا اس کے بدلے میں نادر شاہ نے انہیں برطانوی اسلحہ اور روپیہ پیسہ عطا کیا۔ اس کے بعد برطانوی اہلکار اور شہری دوبارہ یہاں آبسے کابل میں امن و امان قائم ہو گیا۔ نئے امیر نے سابقہ معاہدوں کی پاسداری کا عہد کیا اور شہنشاہِ برطانیہ کو یقین دلایا کہ وہ ہر حالت میں غیر جانبدار رہے گا اس کے ساتھ ہی نئے امیر کو برطانوی امداد ملنی شروع ہو گئی اور یہاں ایک نئے دور کا آغاز ہو گیا۔

نادر خان کا تعلق (ARISTOCRATIC FAMILY) شاہی خاندان سے تھا وہ مذہبی ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے محتاط انداز میں جدیدیت اپنانے کا قائل بھی تھا اور سب سے اہم بات اس کی " بالشیوازم " دشمنی تھی وہ پیشے کے اعتبار سے فوجی جرنیل تھا ان تمام خصوصیات نے اسے انگریزوں کی آنکھوں کا تارا بنا دیا۔ اس نے ۱۹۳۱ء میں روس کے ساتھ ایک عدم جارحیت کے معاہدے پر دستخط بھی کئے لیکن روسیوں کی نظر میں وہ "جاگیردار اور جارح" (FEUDAL & REACTIONARY) تھا روسی اسے "برطانوی سامراجیت کا ایجنٹ" بھی قرار دیتے تھے نومبر ۱۹۳۳ء میں اسے کابل یونیورسٹی کے ایک طالبعلم محمد خلق نے قتل کر دیا۔ بعد میں اسی طالبعلم کے نام پر ماسکو نواز پیپلز ڈیموکریٹک پارٹی آف افغانستان کا خلقی دھڑا قائم ہوا۔ نادر خان کے قتل کے بعد اس کے ۱۹ سالہ بیٹے ظاہر خان کو برطانوی آشیرباد سے کابل کے تخت پر بٹھادیا گیا اور ظاہر خان کے انکل ہاشم خان نے وزارتِ عظمیٰ کا منصب سنبھال لیا۔ یہ وہی ظاہر شاہ ہے جسے حالیہ مسئلہ افغانستان کے حل کے لئے اپنا کردار ادا کرنے کے لئے روم سے افغانستان واپس لانے کی کوشش کی جارہی ہے یہی وہ ظاہر شاہ ہے جسے انجینئر حکمت یار قبول نہیں کر رہا ہے بلکہ افغانوں کو درپیش مسائل کا ذمہ دار قرار دے دیا ہے۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران ظاہر خان نے داخلی استحکام پیدا کرنے کی کوشش کی اور امیرِ افغانستان کی بجائے "شاہ افغانستان" کا لقب اختیار کر لیا۔ گو دوسری جنگِ عظیم کے دوران ظاہر شاہ کے افغانستان کا کردار غیر جانبدارانہ رہا لیکن افغانستان کی اہمیت میں اضافہ بھی ہوا۔ جرمنی نے افغانستان کے ساتھ دوستی گانٹھنے کے لئے مؤثر کوششیں بھی کیں حتیٰ کہ برطانیہ سے مقابلہ بھی کیا اور ظاہر شاہ کو افغانستان کے لئے معاشی و عسکری امداد بھی پیش کی ہٹلر کے وزیر خارجہ JOACH VON RIBBEN TROP ربن ٹراپ نے سوویت رہنما سٹالن کے ساتھ مذاکرات میں انہیں مشورہ دیا کہ وہ شمال کی طرف سے افغانستان پر حملہ کر دے یہ ۱۹۳۹ء کے آخر اور ۱۹۴۰ء کے ابتدا کی بات ہے سوویت قیادت اس بات پر کسی حد تک تیار بھی ہو گئی تھی لیکن اچانک انہیں ہٹلر کی افواج کا سامنا کرنا پڑا۔ جو ماسکو میں سٹالن گراڈ اور لینن گراڈ تک آن پہنچی تھیں اس طرح افغانستان اشتراکیوں کے پنجہ استبداد میں آنے سے بچ گیا لیکن دسمبر ۱۹۷۹ء تک۔ افغان عرصہ طویل سے سپر طاقتوں سے حرب و ضرب میں مصروف رہے ہیں انہوں نے برسرِپیکار رہنے کو "معاہدہ امن" پر ہمیشہ ترجیح دی ہے۔ افغانوں کی ۱۴ سو سالہ تاریخ اس بات پر گواہ ہے کہ انہوں نے ہمیشہ بندوق کی نالی پر ہی معاملات طے کئے۔ یہی ان کی تاریخ رہی ہے اور یہی ان کا قبائلی معاشرتی انداز۔ یہی وجہ ہے ۱۹۷۹ء میں روسی افواج کی یہاں آمد کے بعد سے لے کر ۱۹۸۸ء میں روسی افواج کے انخلاء تک ہر افغان لیڈر

روسیوں کو "بندوق کی نالی" پر ہی لے کر نکالنے کے مشن پر گامزن رہا کیونکہ افغان معاشرے میں "جارح کے ساتھ صلح" کو بزدلی سمجھا جاتا ہے۔ پھر ظاہر ہے کہ کوئی افغان "بزدلی کے طعنے" کی بجائے مرنا زیادہ پسند کرتا ہے شاہ امان اللہ کا دور (۲۹۔ ۱۹۱۹ء) اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس دور میں پہلی مرتبہ مجموعی طور پر تعمیر و ترقی کا کام شروع ہوا اور اس کے ساتھ ہی مغربیت نے یہاں راستے بنانے شروع کر دیئے تھے۔ لیکن کیونکہ افغان معاشرے کا مجموعی چلن "مذہب پرستی" اور "اینٹی سامراجی" رہا ہے اس لئے یہ مہم جلد ہی افغانوں کی مخالفت کا شکار ہو گئی۔ محمود ترمذی (وزیر خارجہ اور امان اللہ کا سسر) جنرل محمد نادر خان (ظاہر شاہ کا والد) اور دیگر موثر لوگوں کے کہنے پر امان اللہ نے مئی ۱۹۱۹ء میں تیسری اینگلو افغان جنگ کا آغاز کر دیا۔ جنرل نادر خان کی سربراہی میں افغان آرمی نے برطانوی فوج کے خلاف پاراچنار میں بڑا کامیاب آپریشن کیا۔ دوسری طرف جنرل صالح محمد کی قیادت میں افغان فوج نے خیبر کی طرف انگریزوں کے خلاف کامیاب آپریشن کیا۔ یہ سلسلہ جاری تھا کہ نیم عسکری پشتون سکاؤٹوں نے برطانوی افواج کا حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ ڈیورنڈ لائن کے اطراف میں بسنے والے پشتونوں نے برطانوی عساکر سے الگ ہو کر افغانوں کے ساتھ ملنا شروع کر دیا۔ دوسری طرف رائل ایئر فورس نے مشرقی افغانستان کے شہروں کابل و جلال آباد پر بمباری شروع کر دی۔ اس علاقے میں یہ ہتھیار پہلی مرتبہ استعمال کیا گیا تھا دونوں فریقین جنگ سے گریزاں ہونے لگے۔ انگریز افغانستان کے دشوار گزار راستوں کا مشاہدہ کر چکے تھے اس لئے وہ بھی خونریزی کا خاتمہ چاہتے تھے۔ برطانوی فوجی بھی واپس اپنے وطن روانہ ہونے کے لئے بے تاب تھے اس لئے مذاکرات کے دو راؤنڈ ہوئے۔ ایک راولپنڈی میں اور دوسرا میسوری میں۔ راولپنڈی میں ہونے والے مذاکرات کا مقصد "جنگ بندی" اور "پائیدار امن" کے قیام کے لئے تفصیلات طے کرنا تھا۔ لیکن انگریزوں نے اس گفتگو کو "معاہدہ راولپنڈی" کا نام دے کر افغانوں کو اپنے خارجہ معاملات طے کرنے کی آزادی دے کر جان چھڑالی۔ اگست ۱۹۱۹ء میں معاہدے پر دستخط ہو گئے اور انگریزوں نے یہاں سے بھاگنے میں ہی عافیت سمجھی۔

اس معاہدے کے فوراً بعد ایک تاجک جنرل محمد ولی کی قیادت میں ایک افغان وفد نے ماسکو کا دورہ کیا۔ اکتوبر ۱۹۱۹ء میں اس دورہ ماسکو کا مقصد آزادانہ خارجہ پالیسی کا عملی مظاہرہ کرنا تھا۔ بالشویک پارٹی کے نمائندے مائیکل برلون نے کابل پہنچ کر پنجدہ کے مسئلے پر شاہ افغانستان سے پہلے ہی مذاکرات کر لئے تھے۔ بالشویک چاہتے تھے کہ افغان وسط ایشیا کی خانہ جنگی میں روسیوں کی مدد کریں، اس کے بدلے میں انہوں نے برطانیہ کے خلاف افغان بادشاہ کی مدد کرنے کی پیشکش

بھی کی تھی۔ بالشویک مشن کی کابل آمد افغان روس تعلقات کا نقطہ آغاز ثابت ہوئی۔ اس کے بعد یہ تعلقات بڑھتے بڑھتے اس قدر زیادہ ہو گئے کہ دسمبر ۹ ۷ ء میں ایسے ہی ایک "معاہدہ دوستی" کی آڑ میں روسی افواج افغانستان میں داخل ہو گئی تھیں۔ یہ الگ بات ہے کہ افغان مجاہدین نے انہیں ذلیل و خوار کر کے اپنے ملک سے نکلنے پر مجبور کر دیا۔

اس دور میں بالشویکی برطانیہ کے ساتھ کسی قسم کی مخاصمت پیدا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ روسیوں نے افغانوں کی عملاً مدد کرنے کے بجائے صرف زبانی جمع خرچ پر ہی قناعت کی۔ برطانوی حکومت شمال مشرقی ایران کے علاوہ شمال مغربی ایران میں بھی عسکری مہمات جاری رکھے ہوئے تھی۔ روسیوں نے برطانیہ سے اپنی "عدم مخاصمت" کی پالیسی کی وجہ سے ان مہمات سے صرفِ نظر کیا۔ اس دور میں افغان بھی بالشویکوں سے دشمنی مول لینے کے موڈ میں نہیں تھے۔ حالانکہ بالشویک وسط ایشیا میں مسلم حکمرانوں کی آزادی سلب کرنے کے چکّر میں تھے۔ لیکن افغانوں نے بھی پنجدہ اور مرو کے علاقوں میں رسوخ حاصل کر لیا۔ اس وقت روسی وسط ایشیا میں مسلم ریاستوں پر قبضہ کر رہے تھے اس لئے انہیں اس طرف توجّہ دینے کی فرصت نہیں تھی۔ اس کے ساتھ ہی محمود ترنذی نے اینگلو افغان بات چیت کے اگلے مرحلے پر میسوری کا سفر کیا اسی دور میں قبائلیوں نے برطانوی ہند میں گھس کر امن کو خراب کرنا شروع کر دیا تھا۔ ایسی صورت حال میں برطانیہ نے افغانوں کو اپنے خارجہ معاملات میں مکمل آزادی دینے کا عندیہ بھی دے دیا۔ جب میسوری میں یہ بات چیت جاری تھی تو افغانوں نے روس کے ساتھ ایک معاہدہ دوستی پر دستخط کئے۔ روس نے اس کا اعلان ۲۶ ر مئی ۱۹۲۱ء میں کیا جبکہ ۱۳ ر اگست ۱۹۲۱ء میں افغان حکومت نے اس کی توثیق کر دی بالشویک حکومت کی طرف سے کسی بیرون ملک حکومت کے ساتھ پہلا معاہدہ تھا۔ افغانوں نے حقیقتاً آزاد خارجہ پالیسی اختیار کرنی شروع کر دی تھی۔ محمد ولی خان کی قیادت میں ایک وفد نے جرمنی، اٹلی کے علاوہ برطانیہ اور امریکہ کا دورہ کیا اور ان ممالک کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم کر کے آزاد خارجہ حکمتِ عملی کی بنیاد رکھی اس کے بعد ترکی، فرانس اور اٹلی کے ساتھ مختلف شعبوں میں معاہدے بھی کئے گئے۔ برطانوی سرکار نے اس آزادانہ انداز کو ناپسند کیا لارڈ کرزن نے افغان وفد کے سربراہ محمد ولی خان کو اس ناپسندیدگی کے بارے میں بتا بھی دیا لیکن افغان اس معاملے میں جس آزاد روی پر چل نکلے تھے انہیں واپس لانا آسان کام نہیں تھا امان اللہ کی بادشاہت اور محمود ترنذی کی ڈپلومیسی کے تحت وہ آزاد خارجہ پالیسی اپنانے کی راہ پر رواں دواں تھے ترنذی نے فرانس جا کر افغان فوج کے لئے جدید اسلحہ بھی خریدا اسی دور میں جنگِ عظیم اوّل کے بعد یونانیوں نے ترکوں پر حملہ کر دیا تھا پھر برطانوی ہند میں خلافت کے

حق میں تحریک چلی اور اس کے ساتھ ہی ”ہجرت موومنٹ“ کا آغاز ہو گیا ہزاروں نہیں لاکھوں ہندی مسلمان اپنے اسبابِ زندگی سمیٹ کر افغانستان کی طرف مہاجر ہو گئے کچھ عرصہ تو امان اللہ حکومت نے انہیں برداشت کیا لیکن پھر اسے نجانے کیوں یہ احساس ہونے لگا کہ شاید برطانوی حکومت اس کے خلاف ان مہاجروں کی صورت میں تخریب کار بھیج رہی ہے یا اس کی معیشت تباہ کرنے کا پروگرام بنائے ہوئے ہے اس کے بعد افغان حکومت نے ان مہاجروں کو خوش آمدید کہنے کا سلسلہ روک دیا اور یوں ہندی مسلمانوں کی عظیم الشّان تحریک ناکامی سے ہم کنار ہو گئی۔
امان اللہ خان نے ترک لیڈر غازی انور کمال پاشا سے بھی راہ ورسم بڑھانے کی کوشش کی جو وسط ایشیا میں انقلابی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے تھا۔ لیکن اگست ۱۹۲۲ء میں اسے قتل کر دیا گیا اور اس کے ساتھ ہی وسط ایشیا میں پنپنے والی ”پاسمچی“ تحریک بھی کمزور پڑنی شروع ہو گئی۔ افغان افواج سرحدوں پر کھڑی صورتِ حال کا مطالعہ کر رہی تھیں روسی حکمرانوں نے امان اللہ سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنی فوجیں بارڈر سے ہٹالے لیکن امان اللہ اس بات پر راضی نہ ہو، ۱۹۲۵ء میں ایک سرحدی جھڑپ کے دوران روسیوں نے دریائے آمو پر واقع ایک چھوٹے سے جزیرے پر قبضہ کر لیا۔ لیکن حکومتِ افغانستان کے شدید احتجاج پر یہ علاقہ افغانوں کو واپس ملا اور ۱۹۲۶ء میں ایک افغان روس معاہدہ دوستی کے ذریعے تاشقند۔ کابل ہوائی سفر کا آغاز ہوا۔
برطانیہ نے امان اللہ کے خلاف سازشیں جاری رکھیں اور اس کی ”جدیدیّت کی تحریک“ کو بہانہ بنا کر ایک بغاوت پھیلا دی۔ مشرقی پہاڑیوں میں واقع علاقے خوست میں ”ملائے لنگ“ کی زیرِ قیادت ایک بغاوت پھوٹی جو مارچ ۱۹۲۴ء تا جنوری ۱۹۲۵ء تک جاری رہی اس بغاوت کے خاتمے کے بعد بھی امان اللہ خان کو ایک آزاد منش تاجک محمد ولی خان اور افغان آرمی چیف جنرل نادر خان کے علاوہ اس کے پانچ بھائیوں بشمول محمد نادر خان، محمد عزیز خان، محمد ہاشم خان، شاہ ولی اور شاہ محمود کی اپوزیشن کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ جنرل نادر خان نے امان اللہ کے خلاف قبائل میں پائی جانے والی بے چینی اور نفرت کو بھانپ لیا تھا۔ امان اللہ نے اپنی کابینہ میں ردوبدل کی اور کمانڈر ان چیف جنرل نادر خان کو پیرس بھیج دیا۔
امان اللہ خان نے روس کے ساتھ زیادہ بہتر تعلقات قائم کرنے کی کوشش کی۔ روس نے بھی بدلے میں امان اللہ کو ۱۹۲۸ء میں ۱۳ ہوائی جہاز بمعہ پائلٹ، مکینکس اور دیگر مواصلاتی ماہرین سمیت تحفے میں دیئے۔ اس دوران تاشقند، کابل، ماسکو ہوائی سفر بھی شروع کر دیا گیا۔ ۱۹۲۸ء میں ہی امان اللہ نے یورپ کا دورہ کیا اس دورے کے متعلق افغانستان میں کئی باتیں پھیلا دی گئیں ملکہ ثریّا کی یورپ میں بے پردگیوں کے متعلق کہانیاں مشہور ہو گئیں سال کے آخر میں

شنواری پشتونوں نے جلال آباد میں بادشاہی محل اور برطانوی سفارتی دفتر کو آگ لگا دی۔ یہ بغاوت بڑی تیزی سے دوسرے علاقوں میں بھی پھیل گئی اسی دوران ایک قبائلی لشکر نے "بچہ سقہ" کی قیادت میں کابل پر قبضہ کر لیا۔ امان اللہ اپنے تخت پر قبضہ کرنے میں ناکام رہا۔ امان اللہ کو یقین تھا کہ ازبک' تاجک اور ترکمان قبائل کے علاوہ روسی بھی اس کی مدد کو آئیں گے لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ اس موقع پر حضرت شور بازار نے ایک لشکر جمع کر کے غزنی کی طرف بھیجا جبکہ ایک دوسرے لشکر کو مشرقی افغانستان بھیجا تاکہ وہ نادر خان کی بچہ سقہ کے خلاف مدد کرے۔ ابھی امان اللہ غزنی کی طرف بڑھ ہی رہا تھا کہ قندھار میں رضا شاہ پہلوی کا بھیجا ہوا ایک جنگی طیارہ امان اللہ کو لینے کے لئے پہنچا۔ امان اللہ نے اسی میں اپنی عافیت سمجھی اور ہندوستان کی طرف چل نکلا۔ یہاں سے اٹلی کی طرف عازم سفر ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی "آزاد خارجہ پالیسی" اور افغانوں کا بالشویکوں کی طرف بڑھنے کا رجحان وقتی طور پر رک گیا' اور افغانستان پر جنرل نادر خان کی صورت میں ایک بار پھر برطانوی مفادات کے نگرانوں کی حکومت قائم ہو گئی۔ یاد رہے نادر خان کو ستمبر ۱۹۳۰ء میں ۲۸۶ معززافراد کے "لوئے جرگے" نے افغانستان کا بادشاہ بنایا تھا۔ اس نے افغانستان کو حنفی سنی ریاست بنانے کا وعدہ بھی کیا تھا۔ لیکن اسے وعدہ ایفا کرنے کا موقع نہ مل سکا' کیونکہ ۱۹۳۳ء میں اسے قتل کر دیا گیا۔ قبائلی جھگڑوں میں "پشتون ولی" قائدے کے تحت نادر شاہ کو قتل کر دیا گیا تھا۔ جس کے بعد اس کا انیس سالہ بیٹا محمد ظاہر خان تخت نشین ہوا اور اس نے شہنشاہ محمد ظاہر شاہ کے نام سے بادشاہت شروع کی جو ۱۹۷۳ء تک جاری رہی۔

کابل.....ماسکو اور دہلی کے سائے میں

انگریزوں، ہندوؤں اور روسیوں کی افغان دشمن پالیسیوں کی حقیقت

مسئلہ افغانستان میں ہندوستان کے مسلم کش اور منفی کردار کو سمجھنے کے لئے افغانستان کے ساتھ اس کے طویل تاریخی روابط پر ایک نظر دوڑانا ضروری ہے۔ ہمارے ہاں عام شہری تو دور کی بات ہے ' دانشور طبقہ بھی اس بات کو گہرائی سے نہیں سمجھتا کہ ہندوستانی حکمران ہمیشہ پاکستان دشمن افغان حکمرانوں کے اتنے مداح و مددگار کیوں رہے ہیں۔ کیا پاکستان دشمنی اس خوشگوار تعلق کی اوّلیں وجہ رہی ہے یا مسلم دشمنی اس تعلق کی بنیاد ہے؟ مسلم دشمنی ہندوستانی حکمرانوں کے لئے افغانستان کے پاکستان دشمن حکمرانوں کے ساتھ دوستی کی وجہ تو ہو سکتی ہے ' لیکن افغانستان کے مسلمان حکمرانوں کے لئے ہندوستان دوستی کی بنیاد نہیں بن سکتی ہے۔ پاکستان دشمنی بھی افغانستان کے حکمرانوں کے لئے بذاتِ خود وجہ تفاخر نہیں بن سکتی ' بلکہ ایسا لگتا ہے کہ ہندوستان دوستی نے ہی پاکستان دشمنی کی بنیاد رکھی ہے۔ اس نظریئے کی تاریخی بنیادیں تلاش کی جا سکتی ہیں۔ اس مقصد کے لئے ہمیں افغانستان اور اس علاقے کی تاریخ کے گہرے خزانے کو کھنگالنا ہو گا۔ افغانستان کی اسلامی تشخص سے پہلے قبل از مسیح تاریخ میں جھانکنا ہو گا تاکہ ان بنیادوں کو تلاش کیا جا سکے جن پر ہندو دوستی اور پاکستان دشمنی کی عمارت تعمیر کی گئی۔ ویسے تو افغانستان کے بارے میں ایک بات بڑی عام ہے کہ افغانستان میں آپ دور تک نہیں دیکھ سکتے۔ حالات اور واقعات کے بارے میں بہتر انداز میں پیش گوئی نہیں کی جا سکتی ہے۔ اگر دور تک دیکھنے

کی خواہش ہو تو آسمان کی طرف دیکھنا پڑتا ہے۔ سربکف پہاڑ نظروں کو دائیں بائیں دیکھنے ہی نہیں دیتے۔ بلندوبالا پہاڑ دیواروں کی مانند نظروں کو محدود کرنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن کہیں کہیں فاصلے دکھائی دیتے ہیں۔ پگھلتی ہوئی برف کے بہتے پانی کے بنائے ہوئے راستے دشوار گزار ہیں۔ یہ جغرافیہ "کوہِ سلیمان کے بیٹوں" کو ایک عظیم الشان طاقت پر ایمان لانے پر مجبور کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ افغانوں میں ایمان حد سے بڑھا ہوا ہے اور بعض اوقات یہ انہیں دیوانگی کی حد تک لے جاتا ہے، لیکن ایسا اسلام کے یہاں آنے کے بعد ہی ہوا۔ افغان قبائل ایک اتحاد و یگانگت کی لڑی میں پروئے گئے لیکن افغانستان ابھی تک قبائلی نظام کے تحت چل رہا ہے۔ پہلے تجارتی کاروان باہر دنیا کی خبریں یہاں لاتے تھے تو افغانوں میں باہر کی دنیا کے بارے میں ایک عجیب و غریب جذبہ پیدا ہوتا تھا۔ لیکن جب کبھی ان کاروانوں کی نقل و حرکت میں گڑبڑ ہو جاتی تو اس سرزمین کے لوگوں میں پہاڑوں کے اس پار دیکھنے کی تمنا بھی دم توڑ دیتی۔ غزنی کے صوبے میں جو پتھر کے اوزار ملے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ سرزمینِ افغانستان پر انسانی زندگی کے آثار اتنے ہی قدیم ہیں جتنی انسان کی معلوم تہذیب و تمدن۔ یہاں کے انسان کا ارتقائی عمل وسط ایشیا کے باسیوں جیسا ہے۔ زمین کی زرخیزی، کاشتکاری اور فطری اندازِ زندگی ایک جیسا ہی دکھائی دیتا ہے۔ زمین کی قدرتی زرخیزی کے باعث یہاں انسان غذا اکٹھا کرنے کی معاشی زندگی سے جلد ہی غذا پیدا کرنے کی معاشی زندگی تک پہنچ گیا۔ سکونت پذیری نے تہذیب کو فروغ دیا۔ ۳ ہزار قبل مسیح کے قندھار میں واقع منڈی گھاک اس دور کی جدید ریاست کا نقشہ پیش کرتی ہے۔ ماہرین کے مطابق زرعی معاشرے میں بننے والی پہلی شہری آبادی یہی تھی۔ افغانستان کے علاقوں سے آثار قدیمہ کی کھدائی کے دوران ملنے والے کوزہ گری کے نمونے قدیم ہندوستانی تہذیبی مرکز ہڑپہ سے ملنے والے برتنوں سے ملتے جلتے ہیں۔ ہندو ماہرین ارضیات و آثار قدیمہ اپنے طور پر یہ ثابت کر چکے ہیں کہ ان شہری تہذیبوں کے درمیان نہ صرف ثقافتی تعلقات تھے بلکہ تجارتی لین دین بھی تھا۔ افغانستان ہڑپہ والوں کو تانبا اور لیرز روائٹ مہیا کیا کرتا تھا۔ اس تحقیق سے وہ یہ ثابت کرتے ہیں کہ ہندوستان سے افغانستان کے تعلقات بہت قدیم ہیں۔ دونوں تہذیبوں کے سوتے ایک ہی طرح کے ہیں۔ اس تحقیق کو مزید تقویت اس بات سے بھی ملتی ہے کہ افغان و ہڑپہ کی قدیم تہذیب دونوں کو بیرونی حملہ آوروں نے تباہ و برباد کیا۔ یہ بیرونی حملہ آور آریہ تھے جو شمال مغرب کی طرف سے ٹڈی دل کی طرح آئے اور یہاں کی تہذیب کو چٹ کر گئے۔ افغانستان وہ دروازہ تھا جس سے حملہ آور بار بار گزر کر نہ صرف وادیٔ سندھ بلکہ پاک و ہند کے علاقوں تک پہنچتے رہے۔ انہوں نے آگے چل کر گنگا کے میدانوں اور وندھیاچل کے نیچے بھی تہذیب کو تاراج کیا۔

ہندوستانی مؤرّخین آریاؤں کے ان اقدامات کو رجعت پسندانہ قرار دیتے ہیں، کیونکہ انہوں نے ایسی تہذیبوں کو تباہ و برباد کیا جو اپنے زمانے کی ترقی یافتہ تہذیبیں تھیں اس کی معقول وجہ بھی سمجھ میں آتی ہے کہ آریاؤں نے ہندو تہذیب کو تباہ و برباد کرنے کی کوشش کی۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اس مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔ دوسری طرف معروف افغانی محقق و مؤرّخ محمد علی کے بقول "آریاؤں کے قدیم منتر اور رگ وید کا بڑا حصّہ افغانستان میں لکھا گیا" یعنی اگر آریہ قوم موجودہ تہذیب کو برباد کر رہی تھی تو دوسری طرف ایک نئی تہذیب کی بنیاد بھی رکھ رہے تھے۔ ایران کے ریاستی مذہب زرتشت ازم کے بانی زرتشت بھی ساتویں صدی قبل مسیح افغانستان میں پیدا ہوئے۔ زرتشت ام البلاد باختر میں پیدا ہوئے تھے جو افغانستان کے شمال مغربی علاقے میں واقع تھا جس کو اب بلخ کہا جاتا ہے یہ جگہ تاریخ میں کئی ایسے عظیم مردوں اور عورتوں کی جائے پیدائش ہے جنہوں نے عظیم کارنامے سرانجام دیئے۔ کئی عالم اور مفکّر اسی شہر میں پیدا ہوئے۔ یہ مردم خیز علاقہ بار بار بیرونی حملہ آوروں کے قہر و ستم کا نشانہ بھی بنا چنگیز خان نے اس علاقے کی شان و شوکت کو ۱۲۲۰ میں تہس نہس کر دیا تھا۔

چھٹی صدی قبل مسیح میں برّصغیر کی سولہ وفاقی ریاستوں میں سے دو موجودہ افغانستان میں شامل تھیں۔ یعنی ریاست بوج اور گندھار۔ انہیں مہاجن پد کہا جاتا تھا کورو راجہ دھرت راشٹر کی بیوی گندھاری اسی ریاست گندھار کی تھی۔ ہندو تاریخ نویسوں کے مطابق کئی اور بھی قدیم رشتے قائم تھے۔ ہندو دیومالائی کردار گنیش کا تعلق بھی اسی علاقے سے بتایا جاتا ہے، لیکن ابھی تک اس بارے میں واضح ثبوت نہیں مل سکے کہ گنیش واقعتاً افغانی تھا یا یہاں ہجرت کر کے آیا تھا۔ گنیش کا ایک قدیم بت افغانستان سے ملا ہے۔ اس بُت کی اہمیّت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ ۲۴ اپریل ۱۹۸۳ء کو کابل کے پاس واقع ایک پہاڑی اشامائی پر ایک مندر کی بنیاد ڈالی گئی تاکہ اس بُت کو اس میں عزت و احترام سے رکھا جا سکے۔ افغانستان کے اس وقت کے صدر ببرک کارمل نے اس مندر کی تعمیر پر خرچ ہونے والے سات لاکھ روپے کے فنڈ میں بھی گرانٹ دی اور سرکاری سہولیات کا وعدہ بھی کیا۔ اس وقت کابل میں بھارتی سفیر جے این ڈکشت کے مطابق "اس بت کو افغانستان کے کسی دُور دراز مقام سے کافی عرصہ پہلے کچھ ہندو کابل لائے تھے۔ افغانستان کے پچھلے حکمران افغانسان کے ہندوستانیوں اور ہندوستانی نسل کے افغان شہریوں کے اس مطالبے کو نظر انداز کرتے رہے کہ اس بت کے لئے ایک مندر تعمیر کیا جانا چاہیئے، لیکن انقلابِ ثور کے بعد ببرک کارمل کے دور میں مندر کی تعمیر کی اجازت مل سکی" اس بات سے موجودہ حکمرانوں (نور محمد ترکئی، حفیظ اللہ امین، ببرک کارمل، نجیب اللہ) کی سیکولر اور ہندو نواز

سوچ کے متعلق معاملات کو سمجھنے میں آسانی ہو سکتی ہے۔ اس سے پہلے (انقلابِ ثور سے) بھی حکمران ہندو اور بھارت نواز تھے لیکن افغان معاشرے کی اسلام پرستی اور کفر گریز رجحان کی بدولت کوئی بھی ایسا کام کرنے سے گھبراتے تھے' جس سے افغانوں کے دینی جذبات کو ٹھیس پہنچ سکے۔ یہی وجہ ہے کہ افغانستان میں روسی افواج کے داخلے سے پہلے تک کوئی بھی دوسری عبادت گاہ تعمیر نہیں کی گئی تھی۔ پورے افغانستان میں صرف اور صرف مسجد ہی عبادت گاہ ہوتی تھی انگریز یہاں اپنی حکمرانی کو مؤثر اور مضبوط کرنے کا خواب دیکھتے دیکھتے یہاں سے رخصت ہو گئے۔ انہیں بھی گرجا گھر تعمیر کرنے کی جرأت نہ ہو سکی۔ لیکن روسی افواج کے داخلے کے بعد مسلم کش پالیسیوں کے عملی نفاذ کے ساتھ ساتھ مندروں کی تعمیر کا آغاز بھی ہو گیا تھا۔ کابل لائے جانے والے گنیش کے بت کے متعلق ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ مہابھارت کے ہیرو بھیم جی اس بت کو ہمیشہ اپنے پاس رکھتے تھے۔ انہیں نصیحت کی گئی تھی کہ وہ اس بت کو کبھی اپنے آپ سے علیحدہ نہ کریں۔ اگر انہوں نے اسے کبھی علیحدہ کر دیا تو پھر دوبارہ اسے حاصل نہیں کر سکیں گے۔ ایک دن دریا پر پانی پیتے ہوئے بھیم جی نے غیر ارادی طور پر اسے علیحدہ کیا اس لئے اسے دوبارہ اٹھا نہیں سکے۔ یہ بت صدیوں اس دریا کے کنارے پڑا رہا پھر اچانک اسے ہندوؤں نے دریافت کیا اور اسے کابل لے آئے جہاں اسے مندر تعمیر کر کے نصب کرنے کی اجازت حاصل کی گئی۔

تیسری صدی قبل مسیح میں تجارتی کاروانوں کے ذریعے بدھ مذہب افغانستان پہنچا۔ موریہ راجہ اشوک نے جو پہلے ہی بدھ مت کی ترویج کے لئے کوشاں تھا' اس علاقے میں بھی بدھ مت کی تشہیر کے لئے کام کیا۔ افغانستان میں بدھ مت نے جڑیں پکڑ لیں اور تقریباً ایک ہزار سال تک یہاں کسی نہ کسی صورت میں رائج رہا' گویہ مذہب یہاں بسنے والے قبائل کی فطرت کے برعکس تھا۔ قبائلی طبائع جنگجُو اور اکھڑ ہونے کے ساتھ ساتھ جاہ و حشمت کی دلدادہ بھی ہوتی ہے' جبکہ بدھ مت مزاجاً بے چارگی و لاچاری کا مذہب ہے اس لئے افغانوں کے پُرعزم و شجاع مزاج سے میل نہ کھا سکا۔ یہی وجہ ہے کہ چھٹی صدی عیسوی میں اسلام کی روشنی یہاں تک پہنچی تو افغان قبائل نے بحیثیتِ مجموعی دینِ حنیف کو قبول کر کے بدھ مت اور دیگر مذاہب کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ دیا۔ اس وقت سے لے کر اب تک ہندوستان کے تہذیبی و ثقافتی رشتے تو موجود نہیں ہیں' لیکن معاشی اور تجارتی مفادات کے حصول کے لئے سیاسی تعلقات ابھی تک قائم ہیں۔ ہندوستان کے سیکولر اور ہندو حکمرانوں نے یہاں کے حکمرانوں کو ہمیشہ پاکستان اور اس کے باشندوں کے علاقائی مفادات کے خلافِ استعمال کیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد افغانستان ہی واحد مسلم ملک تھا جس نے

پاکستان کے اقوامِ متحدہ کا ممبر بننے کی مخالفت کی اور اسے تسلیم بھی نہیں کیا۔ اینگلو افغان جنگوں میں ناکامی کے بعد جب افغانستان کی سرحدیں دریائے آموتک آن پہنچیں تو کمیونسٹوں نے گرم پانیوں تک پہنچنے کے لئے "افغانستان کے دروازے" کو کھٹکھٹانے کے لئے منصوبے بنانا شروع کر دیئے۔ دوسری طرف کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا نے بھی اس عالمی تحریک کے پرچم تلے افغانستان کے معاملات میں دلچسپی لینا شروع کر دی۔ جواہر لعل نہرو کے سوشلسٹ نظریات نے بھارت کی خالق وبانی جماعت کی صفوں میں بھی راہیں بنا ڈالیں۔ اسی تحریک کے زیرِ اثر ہندوستانی اور افغانستان کے حکمرانوں کے درمیان تعلقات استوار ہوتے ہوتے یہاں تک پہنچے کہ پاکستان کے خلاف اٹھنے والی تحریکوں کے مراکز کابل اور دہلی میں قائم ہونے لگے۔ "پشتونستان کی ڈمی" ہو یا "سندھو دیش کا نعرہ" ہر دو کی تخلیق اور پرداخت میں جہاں ہندوستان کی پروردہ نیشنل عوامی پارٹی نے کردار ادا کیا' وہاں افغانستان کی حکومتیں بھی ہندوستان کے ساتھ قدم بقدم چلتی رہیں۔ ظاہر شاہ کے دور کے بعد جب سردار محمد داؤد نے افغانستان کی زمامِ اقتدار سنبھالی تو ہندوستان کی کانگریس نے اس سے بھی بہتر تعلقات قائم کرنے شروع کر دیئے۔ اس کی ہر قسم کی امداد بھی جاری کی' لیکن سردار داؤد نے جونہی پاکستان کے ساتھ تعلقات استوار کرنے کی پالیسی پر عمل پیرا ہونا شروع کیا تو کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا نے داؤد حکومت کے خلاف کام کرنا شروع کر دیا۔ پاکستان کے ساتھ تعلقات کا خاطر خواہ فائدہ تو نہ ہوا لیکن انہیں ہندوستان کی دشمنی کا سامنا کرنا پڑ گیا۔ ظاہر شاہ کے بعد سردار داؤد کے دورِ حکومت میں افغانستان میں کمیونسٹوں کی پیپلز ڈیموکریٹک پارٹی کے دو دھڑے ہو گئے' تھے پرچم اور خلق۔ ایک دھڑا سردار داؤد کی حمایت کے حق میں تھا جبکہ دوسرا اس کے خلاف تھا۔ سوویٹ یونین کی کمیونسٹ پارٹی بھی ان دونوں دھڑوں کو متحد نہ کر سکی' لیکن کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے مشیر' یہاں افغانستان میں بھارتی حکومت کی ہدایات کے مطابق سرگرم عمل رہے۔ اور جونہی سردار داؤد نے "پاکستان دشمنی" ترک کرنا چاہی یہاں کام کرنے والے بھارتی ایجنٹوں نے پرچم خلق کو اکٹھے ہونے پر مجبور کر دیا۔ گو پی ڈی پی اے کے ان دونوں دھڑوں کو متحد کرنا آسان کام نہیں تھا لیکن پاکستان دشمنی کی پالیسی ترک کرنے کے خطرات کو بھارتی حکمرانوں نے اپنے لئے خطرناک محسوس کر لیا تھا۔ اگر افغان حکمران پاکستان سے بہتر تعلقات استوار کر لیتے تو پھر اس خطے سے بھارتی عنصر یکسر غائب ہو جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ بھارتی کمیونسٹوں نے افغان کمیونسٹوں کو داؤد کے خلاف متحد کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ اپریل ۱۹۷۷ء میں داؤد نے معاشی و سماجی ترقی کا سات سالہ منصوبہ بنایا۔ اس منصوبے میں داؤد نے صرف روس سے امداد حاصل کرنے کی بجائے امریکہ اور

دیگر ممالک سے بھی امداد حاصل کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا' جو بھارت اور روس کو ناپسند تھا۔ اس لئے انہوں نے داؤد کے خلاف کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ اسی سال ہندوستان میں پانچ پارٹیوں پر مشتمل اتحادی جماعت بھارتیہ جنتا پارٹی نے طاقت پکڑ لی ۔ یہ جماعت سخت اینٹی کانگریس نظریات کی حامل تھی۔ جنتا پارٹی نے پرائے معاملات میں ٹانگ اڑانے کی پالیسی ترک کر دی۔ اپنے ملکی مفادات کے تناظر میں انہوں نے بین الاقوامی معاملات میں سرد مہری اختیار کر لی۔ اس طرح وقتی طور پر افغانستان کے کمیونسٹ ہندوستانی حکومت کی معاونت و مدد سے محروم کر دیئے گئے۔ تقسیمِ ہند کے بعد تیس سال میں پہلی مرتبہ ایسا ہوا تھا کہ بھارتی حکمرانوں نے افغانستان کے "اینٹی پاکستان" عناصر کی حمایت نہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ پاکستان کی حکومت کے ساتھ سردار داؤد کے بڑھتے ہوئے تعلقات اشتراکی روسی حکمرانوں کے لئے باعثِ تشویش ضرور تھے' لیکن سرِدست وہ کچھ کرنے پر قادر بھی نہیں تھے اسی دوران جولائی ۱۹۷۷ء میں ذوالفقار علی بھٹؔو کی حکومت کا تختہ اُلٹ دیا گیا اور پاکستان کے سیاسی افق پر جنرل ضیاءالحق کی صُورت میں ایک ایسی شخصیّت طلوع ہوئی جس نے مستقبل میں پیش آنے والے واقعات کی تہذیب و ترتیب میں اہم کردار ادا کرنا تھا۔ ضیاءالحق دور میں پاکستان کی خارجہ پالیسی کا جھکاؤ امریکہ کی طرف رہا۔ مارشل لاء کے ابتدا ہی میں یہ بات واضح ہوتی چلی گئی کہ عالمی محاذ پر مستقبل میں بننے والی نئی صف بندیوں میں پاکستان کس کے ساتھ ہو گا۔ اسی دور میں سردار داؤد نے پاکستان 'لیبیا اور یوگوسلاویہ کے علاوہ ہندوستان کا دورہ بھی کیا۔ بھارت کے اس دورے کا مقصد بھارت سے روایتی تعلقات کا احیاء تھا۔ داؤد نے اپنا اینٹی پاکستان تاثر زائل کرنے کے ساتھ ساتھ بھارت دوست تاثر کو بھی نئے سرے سے قائم کرنے کی کوشش کی۔ ان ممالک کا دورہ کرنے کی ایک وجہ یہ بتائی گئی کہ صدر افغانستان ان مسائل پر تبادلہ خیال کرنا چاہتے ہیں 'جن کا تعلق ناوابستہ تحریک سے وابستہ ممالک کے وزرائے خارجہ کی اس کانفرنس سے تھا' جو مئی ۱۹۷۸ء میں کابل میں منعقد ہونے والی تھی۔ سردار داؤد ان ممالک کے دورے سے اپنے سات سالہ معاشی منصوبے کے لئے امداد بھی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ انہیں اس سلسلے میں کسی حد تک کامیابی بھی ہوئی اور ہندوستان سے تعلقات میں بہتری کی امید بھی پیدا ہوئی 'لیکن کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا اور پیپلز ڈیموکریٹک پارٹی آف افغانستان کے دونوں دھڑے سردار داؤد کے خلاف سرگرم عمل رہے حتّٰی کہ پی ڈی پی اے نے سردار داؤد حکومت کا تختہ الٹنے کی تیاریاں بھی کرنی شروع کر دی تھیں۔ پارٹی کے جنرل سیکرٹری نور محمد ترکئی نے کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کی گیارہویں کانگرس منعقدہ بھٹنڈا کو ۲۷ فروری ۱۹۷۸ء میں اپنی جماعت کی مرکزی کمیٹی کی طرف سے ایک پیغام بھیجا جس میں تحریر تھا کہ

"خارجہ اور داخلہ رجعت پسندی کی بہیمانہ سازشیں اور اشتعال انگیزیاں اور حکومتِ افغانستان کے دائیں بازو کے حکمران حلقے ہماری پارٹی کو کمزور اور مفلوج کر دینے کی سازشیں کر رہے ہیں۔ ہماری پارٹی نے بادشاہت کا خاتمہ کرنے کی قومی جدوجہد میں ایک تاریخ ساز کردار ادا کیا ہے۔ جمہوری حکومت کے قیام و بقا کی جدوجہد کے علاوہ تاریک دور کی رجعت پسندی اور سامراج کی سازشوں کو بے نقاب کرنے اور انہیں غیر مؤثّر بنانے میں بھی ہماری پارٹی کا کردار قابلِ ذکر ہے۔ سوویت یونین اور دیگر سوشلسٹ ممالک کے ساتھ دوستانہ تعلقات کے قیام اور ناوابستگی کی بنیاد پر تشکیل پانے والی جمہوری ریاستوں کے ساتھ برادرانہ تعلقات قائم کرنے کی راہیں ہماری جماعت نے ہی تلاش کیں۔" آگے چل کر مزید لکھا کہ "موجودہ حکومت (داؤد حکومت) گفتار کی حد تک تو ترقی پسند ہے لیکن عملاً وہ جمہوریت کش پالیسیوں پر گامزن ہے۔ ملک کی معاشی ترقی اور ہماری پارٹی کی قانونی سرگرمیوں کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کی جارہی ہیں دوسری طرف حکومت دائیں بازو کے اخوان اور بائیں بازو کے ماؤ وادی عناصر اور رجعت پسند عناصر کی پشت پناہی کر رہی ہے۔"

اس پیغام کے مندرجات سے ظاہر ہوتا ہے کہ افغان کمیونسٹوں کا بھارتی کمیونسٹوں سے براہِ راست رابطہ تھا اور وہ انہیں رہنمائی بھی فراہم کرتے تھے۔ جب اپریل ۱۹۷۸ء میں داؤد حکومت کا تختہ الٹا گیا اور انقلابی حکومت قائم ہوئی تو کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے دباؤ پر بھارتی حکومت نے نور محمد ترکئی کی حکومت کو تسلیم بھی کر لیا۔ اس میں کسی کو شک نہیں ہونا چاہئے کہ افغانستان کی معاشی و سماجی ترقی کا پہلا سات سالہ منصوبہ (۱۹۷۶ء - ۸۳) داؤد کی قوتِ متخیّلہ اور تنظیم کا کھلا ثبوت تھا۔ یہ بھی طے شدہ تھا کہ وہ افغانستان کو کمیونسٹوں کے جال سے نکال کر عدم وابستہ ملک کا روپ دینا چاہتا تھا اس سلسلے میں انہوں نے پاکستان، سعودی عرب اور ایران جیسے برادر اسلامی ممالک کی طرف دوستی کا ہاتھ بھی بڑھایا اس سلسلے میں انہیں کامیابی بھی ملی لیکن افغانستان اور انڈیا کے کمیونسٹوں نے انہیں اس راہ پر چلنے نہیں دیا، اور خونی انقلاب کے ذریعے نور محمد ترکئی کی حکومت قائم کر دی گئی جسے بھارت نے فوراً تسلیم کر لیا۔ اس کے بعد حفیظ اللہ امین، ببرک کارمل اور نجیب اللہ حکومت کے قیام تک بھارتی حکمرانوں کا رویّہ ہمیشہ یہی رہا ہے کہ پاکستانی مخالف حکومتوں کو نہ صرف تسلیم کر لیا جائے بلکہ ان کی اخلاقی و فوجی مدد بھی کی جائے۔ افغان مجاہدین کے خلاف برسرِپیکار روسی و کابل افواج کے ساتھ بھارتی فوجی مشیران کے علاوہ ہندوستانی پائلٹ بھی ہوائی جنگی معرکوں میں حصّہ لیتے رہے ہیں۔ پکڑے جانے کے ڈر سے بھارتی پائلٹوں کو صرف ایسی پروازوں میں شامل کیا جاتا تھا جو افغانستان کے اندر، ڈیورنڈ لائن کے اس

طرف موجود افغان مجاہدین کے ٹھکانوں پر حملہ آور ہونے کے لئے ترتیب دی جاتی تھیں۔ پاک افغان ہوائی سرحدوں کی پامالی کرتے ہوئے پاکستان میں داخل ہونے والے روسی ۲۹۔ مگ طیارے یا تو افغان پائلٹ اڑاتے تھے یا روسی ہوائی افواج میں شامل تاجک ' ازبک یا ترکمانی روسی ' تاکہ پکڑے جانے کی صورت میں عالمی پریس میں "غیر ملکی مداخلت" کا پروپیگنڈہ مؤثر نہ ہو سکے۔ افغانستان کے معاملات میں بھارتی مداخلت کا ثبوت اینگلو افغان جنگوں کے دوران بھی ملتا ہے ' جب بھارتی سکھوں اور ہندوؤں نے انگریزوں کے ساتھ مل کر افغانوں کے قومی مفادات کے خلاف کام کیا ' بالکل اس طرح جیسے خدائی خدمت گار تحریک کے بانی غفار خان نے مسلمانوں کے مفادات کے خلاف کانگریس کے ساتھ مل کر کام کیا اور تقسیمِ ہند کے بعد پاکستان کے قومی مفادات کے برعکس ہندوستانی اور افغان حکومتوں کے ساتھ مل کر سازباز کی ' اور یہ سازباز ولی خان اور ان کی اے این پی اب بھی کر رہی ہے۔ اینگلو افغان جنگوں کے دوران برطانوی ایجنٹ مک نائن نے ہندو اور سکھ گماشتوں کے ذریعے افغانوں کی تحریکِ حریّت میں رخنہ ڈالنے کی کاوشیں کیں۔ ۱۸۳۸ء میں ہونے والے معاہدے "شملہ منشور" کے تحت انگریزوں نے افغانوں کی تاریخ کو مسخ کرنے کی کوشش کی۔ افغانوں کے ساتھ اپنے تعلقات کو بڑے غلط رنگ میں پیش کیا جسے افغانوں نے کلی طور پر مسترد کرتے ہوئے ان کے خلاف اپنی جدوجہد کو اور بھی تیز کر دیا۔ انگریزی افواج نے ۱۹۳۹ء میں قندھار پر قبضہ کر کے کٹھ پتلی شاہ شجاع کو تخت پر بٹھایا۔ اس کے بعد غداروں کے ایک وسیع و عریض جال کے ذریعے غزنی اور کابل پر بھی قبضہ کر لیا اور شاہ شجاع کی عملداری ان علاقوں تک پھیلا دی گئی۔ افغان مزاحمت اور بھی تیز ہوتی چلی گئی۔ افغانوں نے برطانوی رسد لانے والوں کے لئے عرصہ حیات تنگ کرنا شروع کر دیا۔ ۱۸۴۱ء میں کابل میں بغاوت پھوٹ پڑی۔ قبائلی سرداروں نے "باغی افغان" لیڈروں کا ساتھ دیا۔ بہت سے انگریز افسر مارے گئے۔ شاہ شجاع اور اس کا سالار دستہ بالاحصار کے قلعے میں بند ہو گیا۔ افغانوں کی تحریکِ مزاحمت نے انگریزوں کو شکست پہ شکست دینی شروع کر دی۔ شجاع کی فوج میں بھی پھوٹ پڑ گئی برطانوی پولیٹیکل ایجنٹ مک نائن نے ایک بار پھر سیاسی چالبازیاں شروع کر دیں۔ اس دور میں ایک ہندوستانی تاجر موہن لال نے برطانوی ایجنٹ کے ساتھ مل کر قبائلی سرداروں میں پھوٹ ڈلوانے کی مہم شروع کی لیکن انہیں زیادہ کامیابی نہ ہو سکی ' بلکہ افغانوں نے مک نائن کو قتل کر دیا۔ تحریک مزاحمت کو بڑھتے ہوئے دیکھ کر انگریزوں نے ۱۸۴۲ء میں ہتھیار ڈال دیئے اور جلال آباد کے راستے واپسی کا سفر شروع کر دیا۔ لیکن افغانوں نے ' جوان کے مظالم کا بدلہ لینا چاہتے تھے ' ہر موڑ پر ان پر حملے کئے۔ کابل سے روانہ ہونے والے پندرہ ہزار انگریز سپاہیوں میں

سے صرف ایک ہی جلال آباد پہنچ سکا۔ "۱۳ر جنوری ۱۸۴۲ء کو جلال آباد کی شہرپناہ پر تعینات سنتریوں نے ایک شخص کو دیکھا جو پھٹی ہوئی انگریزی وردی پہنے ایک ٹٹو پر سوار تھا۔ گھوڑا اور سوار دونوں بُری طرح زخمی تھے۔ وہ ڈاکٹر برائیڈن تھا جو ان پندرہ ہزار میں سے اکیلا بچا تھا جو تین ہفتے پہلے کابل سے روانہ ہوئے تھے۔ وہ بھوک سے مر رہا تھا" کتنی حیرانگی کی بات ہے کہ پچھلی صدی میں جب افغان اکیلے ہی اس وقت کی سپر طاقت برطانیہ سے برسرِپیکار تھے تو ہندوؤں نے غداریاں کر کے، انگریزوں کے ساتھ مل کر افغانوں کو غلام بنانے کی کوششیں کیں، لیکن انہیں کامیابی نہ ہو سکی۔ حتّیٰ کہ افغانوں نے نہ صرف حملہ آور افواج کو مکمل طور پر ختم کر کے اپنی قوم پر ہونے والے ظلم و ستم کا بدلہ لے لیا بلکہ غدّاروں کو بھی کیفرِ کردار تک پہنچایا۔ سکھ و ہندو وہاں سے یا تو مار بھگائے گئے یا پھر حوالۂ جہنّم کر دیئے گئے۔ اس وقت افغانوں کو کسی بھی ہمسایہ طاقت، مسلم یا غیر مسلم کی تائید و حمایت حاصل نہیں تھی۔ کوئی اقوامِ متحدہ حملہ آور کے خلاف مذمّتی قرار دادیں پاس کرنے والی بھی نہیں تھی۔ کوئی مغربی یا اسلامی طاقت ان کی تحریکِ حرّیت کی تائید و حمایت کرنے والی نہیں تھی۔ کوئی جنرل اختر عبدالرحمان افغانوں کے لئے میدانِ جنگ ترتیب دینے والا نہیں تھا، لیکن اس کے باوجود انہوں نے حملہ آور سُپر طاقت کو نہ صرف اپنے ملک سے نکلنے پر مجبور کر دیا بلکہ ان سے اپنے اوپر ہونے والے ایک ایک ظلم کا نقد حساب بھی لیا۔ کوئی حملہ آور سپاہی زندہ بچ کر نہ جا سکا، لیکن اب رواں صدی کے آخر میں جبکہ پوری اسلامی دنیا ہی نہیں بلکہ اشتراکیت دشمن مغربی ممالک کی پوری تائید و حمایت بھی افغان تحریکِ مزاحمت کی پشت پر تھی، اقوامِ متحدہ کی اخلاقی امداد بھی تحریکِ مزاحمت کو ملتی رہی، افغانوں نے قربانیاں بھی دیں، انہوں نے ہجرت و شہادت کے شاندار باب بھی رقم کئے، لیکن اس کے باوجود دشمن بخیر و خوبی بچ کر ان کی سرزمین سے نکل گیا۔ آخر کیوں۔؟ ہندوستانی حکمرانوں کا کردار بھی تبدیل نہیں ہوا وہ شروع سے ہی مسلم کش پالیسی کے تحت افغان حکمرانوں کے ساتھ صرف اس لئے رہے تاکہ سازشیں کر سکیں۔ افغان عوام کو رسوا کر سکیں۔ عدمِ مرکزیّت کے سبب افغانستان میں ہمیشہ سازشوں کے لئے سازگار ماحول رہا یہی وجہ ہے کہ بیرونی طاقتوں کو یہاں اپنے ایجنٹوں کے ذریعے بار بار طغیانی برپا کرنے کے مواقع ملتے رہے۔ لیکن افغانوں کی فطری حمیّت و غیرت اور شجاعت کے سبب جب کبھی بھی یہ سازشیں دشمن کی ننگی جارحیّت بن کر افغانوں کے سامنے صف آرا ہوئیں تو انہیں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ سوشلسٹ روس کی ننگی جارحیّت کو بھی عسکری محاذ پر افغانوں کی قومی حمیّت و غیرت نے اس شدّت سے شکست دے دی ہے کہ سوشلسٹ ریاستوں کا اتحاد (سوویت یونین) ریت کی دیوار کی طرح زمین بوس ہو گیا ہے۔ لیکن دیگر سازشوں کے

علاوہ ہنود کی سازشیں ابھی تک جاری ہیں وہاں قیامِ امن کے راستے میں دل کھول کر رکاوٹیں ڈالی جارہی ہیں۔

جہادِ افغانستان کے دوران جب کبھی بھی مجاہدین کی کامیابیاں ایک خاص حد سے آگے بڑھنے لگتیں' سندھ میں گڑبڑ شروع ہو جاتی۔ یہ گڑبڑ کبھی سیاسی شورشوں کی صُورت میں ظاہر ہوتی اور کبھی ڈاکہ زنی اور لوٹ مار کی صورت میں۔ ضیاء الحق دور میں سندھ میں آپریشن کلین اپ کے دوران کئی ایسے تخریب کار پکڑے گئے جنھیں بھارتی ایجنسی "را" نے تربیّت دی ہوئی تھی۔ انہی تخریب کاروں کی زبانی بھارت کے پاکستان کے خلاف کئی منصُوبوں کا علم ہوا۔ اندرا گاندھی کے دورِ حکومت میں بھی اور پھر راجیو دورِ اقتدار میں بھی بھارت سرکارِ پاکستان کے خلاف افغان حکمرانوں کی مویدو حمایتی بنی رہی۔ تحریک عدم وابستہ کا ممبر ہونے کے باوجود بھارت سرکار نے انقلابِ ثور کے متعلق اور اس کے بعد روسی افواج کے افغانستان میں داخلے کے بارے میں مسلم کش پالیسی اختیار کی۔ افغانوں کی دوستی کا دعوے دار ہونے کے باوجود افغانوں کو قتل کرنے والوں کی حمایت کی' ان کے ساتھ دوستی کے رشتے استوار کئے' انہیں معاشی واسلحی امداد فراہم کی۔ لاکھوں افغانوں کو بے گھر کرنے والے حکمرانوں کی اخلاقی و مالی امداد بھی جاری رکھی اور یہ امداد اب تک جاری ہے۔ ہندوستان کے ساتھ افغانوں کے قدیم و تاریخی تعلقات اس لحاظ سے بھی اہم ہیں کہ ان کے ڈانڈے موجودہ مزاحمتی تاریخ سے بھی مل جاتے ہیں۔ پہلے افغانوں نے برطانوی استعمار کو للکارا اور دورِ حاضر میں اشتراکی سامراج افغانوں کے جذبۂ حریّت کے سامنے چاروں شانے چت ہو چکا ہے۔ امیر حبیب اللہ خان کا دورِ حکومت اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ اس نے یہاں تعمیر و ترقی کی کوششیں کیں' لیکن افغانستان میں ترقیاتی کاموں کی اس قدر اہمیّت نہیں ہے جتنی امن وامان کے قیام اور بدیشی اثرات و حکمرانی کے خلاف جراُت مندانہ اقدامات کی۔ افغان قبائل نے امت مسلمہ کے لئے ہمیشہ نرم گوشہ رکھا کچھ حکمران ایسے بھی گزرے ہیں جنھوں نے برّصغیر پاک وہند کی طویل تاریخ میں صرف اپنی جراُتِ رندانہ کی وجہ سے نام کمایا۔ محمود غزنوی' افغانی ہونے کے باوجود تاریخ پاک وہند کا ایک روشن باب ہے۔ یہاں پاکستان میں ہی نہیں بلکہ ہندوستانی مسلمان بھی اپنے بیٹوں کے نام اسی کی یاد میں رکھتے ہیں' اور یہ صرف اس لئے ہے کہ محمود غزنوی نے ہندوؤں کے مرکز سومنات کو فتح کرنے کے لئے ستائیس مرتبہ لشکر کشی کی اور بالآخر کامیاب ہوا۔ احمد شاہ ابدالی نے بھی شاہ ولی اللہؒ کی دعوت پر ہندوستان پر لشکر کشی کی اور اس کا مقصد مسلمانوں کے خلاف مرہٹوں کی ظالمانہ کارروائیوں کا خاتمہ تھا۔ احمد شاہ ابدالی نے مرہٹوں کی قوّت پر ایسی کاری ضرب لگائی کہ ایک صدی گزرنے کے بعد بھی انہیں دوبارہ ویسی

عسکری طاقت حاصل نہیں ہو سکی جو انہیں احمد شاہ ابدالی کے حملے سے پہلے حاصل تھی۔ ۱۸۵۷ء میں جب ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف معرکہ آزادی برپا تھا تو جنرل بخت خان کی صورت میں افغانستان سے ایک سورما یہاں آیا تھا جس نے جنگِ آزادی لڑنے والے مسلمانوں کی پشت مضبوط کرنے کی کوشش کی تھی، لیکن مغل دربارِ شاہی کی سازشوں نے جنرل بخت کو یہاں رنگ جمانے اور انگریزوں کے چھکّے چھڑانے کا موقع نہیں دیا۔ لیکن جب بھی جنگِ آزادیٔ ہند ۱۸۵۷ء کا ذکر آئے گا تو افغان جنرل کا نام بھی ضرور لیا جائے گا۔

امیر حبیب اللہ خان نے بھی امیرِ افغانستان بننے کے بعد نہ صرف قومی اتحاد قائم رکھنے کا وعدہ کیا بلکہ بدیسی حکمرانوں کے خلاف مزاحمت کا بھی اقرار کیا تھا۔ ۳ر اکتوبر ۱۹۰۱ء میں امیر حبیب اللہ خان نے پہلا سرکاری فرمان جاری کیا جس میں افغانستان کی تعمیر و ترقی کے علاوہ امیر عبدالرحمان کے دورِ حکومت میں ہجرت کرنے والے افغانوں کو عام معافی کا اعلان بھی شامل تھا۔ یہ لوگ سابق امیر کے ظلم و ستم سے تنگ آکر مہاجر ہو گئے تھے۔ امیر حبیب اللہ خان نے نئی صدی کے آغاز میں فراخدلی کے ساتھ اپنے دورِ حکومت کا آغاز کیا اس کے ساتھ ہی برطانوی سرکار نے امیر پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔ اسی سال ۱۰ر اکتوبر کو نئے امیر نے برطانوی ہند کے لارڈ کرزن کو تحریراً یقین دہانی کروائی کہ وہ امیر عبدالرحمٰن کی طرح انگریزوں کا وفادار رہے گا اور اس کی جاری کردہ پالیسیوں میں ردّوبدل نہیں کرے گا۔ یہ اس وقت امیر کی ''ڈپلومیسی'' تھی، جس کا مقصد ''متحاربت'' کی بجائے ''موافقت'' اختیار کر کے افغانستان میں تعمیر و ترقی کے نئے دور کا آغاز کرنا تھا لیکن لارڈ کرزن نے نئے امیر سے سرد مہری کی پالیسی اختیار کی۔ لارڈ نے امیر سے کہا کہ سابق امیر کے ساتھ جو معاہدے ہوئے تھے اور اسے جو رقم بطور امداد دی جاتی تھی 'وہ ''ذاتی نوعیت'' کی تھی۔ اس لئے نئے دور میں نئے حکمران کے ساتھ ان معاملات پر ''نظرِ ثانی'' کرنا ضروری ہے ظاہر ہے یہ شرائط افغان قبائلی مزاج کے بالکل برعکس تھیں۔ امیر نے اپنے مزاج کے برعکس ''نرم رویّہ'' صرف اس لئے اختیار کیا تھا کہ اسے تاجِ برطانیہ کی نُصرت و حمایت مل سکے۔ لیکن جب اس نے دیکھا کہ سرکارِ برطانیہ نرم رویّہ اختیار نہیں کر رہی تو اس نے بھی سخت رویّہ اختیار کر لیا' اور گفتگو کے لئے ہندوستان آنے کے دو دعوت ناموں کو رد کر دیا۔ کیونکہ امیر نے اپنی قوم سے ''غیر ملکی دباؤ کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے'' کا وعدہ بھی کیا تھا' اس لئے سرکار کے دعوت ناموں کو قبول نہ کر کے اس نے بہادری کا ثبوت دینے کی بھرپور کوشش کی، لیکن اس کے ساتھ ساتھ انگریزوں کے ساتھ بھی سلسلہ جنبانی جاری رکھا۔ دسمبر ۱۹۰۴ء میں امیر نے اپنے سب سے بڑے بیٹے عنایت اللہ خان کو کلکتہ بھیجا تاکہ لارڈ کرزن سے مذاکرات کرے۔ جوابی

طور پر لارڈ کرزن نے بھی اپنا نمائندہ کابل بھیجا۔ ۲۱ مارچ ۱۹۰۵ء کو ایک اجمالی سے معاہدے پر دستخط بھی ہو گئے۔ اس معاہدے سے انگریزوں کو نئے امیر پر اپنا دھونس جمانے کا موقع بھی مل گیا۔ انہوں نے امداد روک کر اپنی اہمیت جتانے کی کوشش کی تھی۔ پھر امداد بحال کر کے امیر کو اپنے دامِ الفت و دوستی میں پھنسانے کی مہلت بھی مل گئی۔ اس معاہدے کے نتیجے میں امیر عبدالرحمان کے ساتھ کئے گئے تمام معاہدوں کی تجدید ہو گئی اور امداد بھی بحال ہو گئی۔ انگریزوں نے یہ سارا کھیل اس لئے کھیلا تھا کہ وہ نئے امیر کو مکمل طور پر اپنے دامِ دوستی میں پھنسا سکیں۔
انگریز افغانستان میں ایک ایسی ریلوے لائن تعمیر کرنا چاہتے تھے جو ہندوستان کو افغانستان سے اس طرح ملا دے کہ دونوں ممالک میں نقل و حمل انتہائی آسان ہو جائے۔ امیر حبیب اللہ نے اس ریلوے لائن کی عسکری اہمیّت سمجھ لی تھی۔ اسے انگریزوں کے طویل مدّتی منصوبوں کی بھنک بھی پڑ گئی تھی۔ اس لئے امیر نے انگریزوں کی یہ بات رُد کر دی اور طویل ریلوے لائن کی تعمیر کا یہ منصوبہ کھٹائی میں پڑ گیا۔ امیر حبیب اللہ نے افغانستان کو غیر ملکی اثرات سے بچانے کے لئے کئی اور کام بھی کئے لیکن افغانستان کی معاشی ترقی کے لئے وہ تاج برطانیہ سے مدد بھی حاصل کرنا چاہتا تھا' اس لئے اس نے ایسی ڈپلومیسی اختیار کی جس کا محور و مرکز "افغانستان کی ترقی" اور اس سے آگے بڑھتے ہوئے خود امیر کی حکمرانی کا استقرار و استحکام تھا۔ ۱۹۰۶ء میں لارڈ کرزن کے بعد لارڈ منٹو کی ہندوستان آمد سے حالات کسی حد تک بدلے دکھائی دینے لگے۔ امیر حبیب اللہ نے نئے لارڈ سے ملاقات کرنے کے لئے ہندوستان کا دورہ کیا۔ اس دورے کے دوران برطانوی ہند سرکار نے اسے بڑے شاندار انداز میں خوش آمدید کہا۔ امیر افغانستان پر موٹر کاروں کے جلوس اور جدید سائنسی ٹیکنالوجی کا بہت اثر ہوا۔ برطانوی سرکار کی دعوتوں میں امیرِ افغانستان نے بچگانہ رویّہ بھی اختیار کیا اس کے برطانوی میزبانوں اور سرکاری اہلکاروں نے اس کے بارے میں اچھی رائے قائم نہ کی۔ دورانِ گفتگو جب امیر حبیب اللہ کا دل چاہتا کہ لوگ / میزبان ہنسیں تو وہ کہتا "اچھا اب میں ایک لطیفہ سناتا ہوں"۔ برطانوی ہند سرکار کو اس لحاظ سے بھی خوشی ہوئی کہ کابل اپنا نمائندہ بھیجنے اور نئے امیر سے معاملات کرنے میں آسانی پیدا ہو گئی تھی۔ انگریزوں کی اس علاقے پر اپنی بالادستی' مکمل بالادستی کا خواب پورا کرنے کا شاید وقت قریب آ رہا تھا یا شاید انہوں نے اپنے تئیں ایسا سوچنا شروع کر دیا تھا۔
انگریزوں نے اپنے مقبوضات کی بنیاد شمالی ہند کی مشرقی سرحدوں پر ڈالی تھی۔ وہ وادیٔ سندھ کی طرف بڑی احتیاط اور آہستگی سے بڑھنا چاہتے تھے کیونکہ جُوں جُوں ان کے قدم اس وادی کے قریب ہوتے جاتے تاجِ برطانیہ اور زار شاہی کے درمیان فاصلے بھی کم ہوتے چلے جا رہے تھے اس

لئے برطانوی سرکار کو اس علاقے میں اپنی سرحدوں کی پوزیشن کا بڑا خیال رہا۔ وہ چاہتے تھے کہ سرحدیں مؤثر اور بڑی حد تک واضح ہوں۔ اسی نقطۂ نظر کے تحت یہاں ایک ایسے کھیل کا آغاز ہوا جس نے انیسویں صدی میں یورپ کی ایشیائی ممالک کے لئے خارجہ حکمتِ عملی کے خدوخال واضح کئے۔ جنوب ایشیا میں اس پالیسی کا خالق رچرڈ کولے ولزلی تھا۔ اس نے شاہِ فارس اور امیرِ افغانستان کے دربار میں اپنا نمائندہ بھیجا اور فرانسیسی خطرات سے آگاہ کرنے کے علاوہ شاہانِ فارس و افغانستان کو کہا کہ وہ برطانوی ہند کو فرانسیسی خطرات سے بچانے کے لئے ممکنہ اقدامات اٹھائیں۔ یاد رہے یہ اٹھارہویں صدی کے آخری سالوں کا واقعہ ہے جب نپولین بونا پارٹ نے ۱۷۹۸ء میں اپنی "عساکر نیل" (ARMY OF THE NILE) کو حرکت دی۔ پہلے قدم پر کامیابی کے بعد اس کا دوسرا قدم ہند پر یلغار تھا، لیکن بحیرہ روم میں ایڈمرل نیلسن کے جنگی بیڑے نے نپولین کی یہ خواہش پوری نہیں ہونے دی۔ وقتی طور پر تو خطرہ شاید ٹل گیا تھا لیکن نپولین شکست ماننے والا نہیں تھا۔ اس نے زار روس سے معاہدہ کیا اور ۱۸۰۱ء میں فرانکو، رشین مہم کا آغاز کیا، جس کے مطابق فرانس کی ۳۵ ہزار افواج کے ساتھ اتنی ہی کوساکس (روسی النسل) افواج شامل ہونا تھیں۔ پھر استراخان کے مقام پر اکٹھے ہونا قرار پایا تھا۔ طے شدہ منصوبے کے مطابق ان افواج نے افغانستان پر ہرات کے مقام سے حملے کا آغاز کرنا تھا۔ پھر قندھار سے ہوتے ہوئے درّہ بولان اور سندھ کی طرف پیش قدمی شامل تھی۔ اس سارے منصوبے کو شاہِ فارس کی مدد بھی حاصل تھی۔ اس منصوبے کے حتمی عمل در آمد سے پہلے زار پال کا انتقال ہو گیا۔ اس کی افواج ابھی دریائے والگا پار کر رہی تھیں اور وہاں انہیں فرانسیسی افواج کے ساتھ شامل ہونا تھا کہ نپولین کو ایبیریا (IBERIA) میں اہم معاملات در پیش آئے اور ان پر غور و فکر کے بعد اس کے نزدیک ہند اور افغانستان پر لشکر کشی کی اہمیت کسی حد تک کم ہو گئی۔ لیکن برطانیہ نے نپولین کی مجوّزہ مہم جُوئی کے خلاف بند باندھنے شروع کر دیئے تھے۔ رچرڈ کولے ولزلی کا شاہانِ فارس اور افغانستان کو پیغام اسی خطرے کی پیش بندی کا ایک حصّہ تھا۔

انگریزوں نے "تقسیم کرو" کے سنہری اصول پر عمل پیرا ہوتے ہوئے افغان قبائلی انداز معاشرت میں نفاق کے بیج بوئے۔ قبائلی چپقلشوں کو ہوا دی جو وقتی طور پر پھلنے پھُولنے بھی لگی۔ اسی قبائلی چپقلش نے ۱۸۱۲ء میں سدوزئی قبائلی حکمران شاہ شجاع کو تختِ کابل پر قبضہ جمانے کی ہمّت دی۔ اس کے سات سال بعد بارق زئی قبیلے کا دوست محمد خان امیرِ افغانستان بن گیا۔ یہ شخص تین سالہ وقفے کے علاوہ ۱۸۶۳ء میں اپنی وفات تک امیرِ افغانستان رہا۔ اپنے دورِ امیری میں اس کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ وہ برطانوی سرکار کے ساتھ دوستانہ مراسم قائم رکھتے اپنی اس

خواہش کاکھلااظہار اس نے گورنر جنرل لارڈ آک لینڈ کے نام ایک خط میں یوں کیا۔ "مجھے امید ہے کہ عالی جناب! مجھے اور میری مملکت کو اپنا ہی سمجھیں گے" ......

معزول شاہ شجاع لدھیانہ (ہندوستان) میں برطانوی سرکار کے نمک خوار کے طور پر رہ رہا تھا۔ گورنر جنرل کے نوجوان اور مہم جُو مشیروں نے اسے مشورہ دیا کہ دوست محمد خان کے خلاف مہم جُوئی کے لئے شاہ شجاع کو استعمال کیا جائے۔ انہی مشیروں کے مطابق مہاراجہ رنجیت سنگھ (۱۸۳۹۔ ۱۷۸۰ء) حاکم پنجاب کی عساکر کو ساتھ ملا کر ایک مؤثر فوج تیار کرنی تھی، جو امیرِ افغانستان دوست محمد کے خلاف معرکہ آرا ہو سکے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ سکھوں کو اکٹھا کر کے "جنگجُو قوم" (خالصہ) بنانے کا عزم لئے ہوا تھا وہ پورے پنجاب کو مسلمانوں کی عملداری سے نکالنا چاہتا تھا۔ اس نے ۱۸۰۶ء میں کمپنی کے ساتھ ایک دوستی کا معاہدہ کیا تھا۔ پھر ۱۸۳۹ء میں اپنی وفات سے پہلے برطانیہ نے شاہ شجاع کے ساتھ مل کر ایک معاہدہ کیا، جس کے مطابق افغانستان کو بارق زئی حکمرانی سے نجات دلا کر یہاں شاہ شجاع کی حکمرانی قائم کرنا تھی۔ دراصل روسی حکمران پیٹر اعظم (۱۷۲۵۔ ۱۶۸۲ء) سے ہی ایشیا کی طرف حرکت کرنے کے لئے بے تاب تھے ترک اور فارس کے سلاطین و خانوں کو روسی حلقۂ اثر میں لانے کا مشن شروع ہو چکا تھا یہ مشن خطرناک حد تک دیگر اقوام کے سامنے آیا تھا لیکن ۱۸۲۳ء میں جب فارس کے حکمران نے تہران کے دروازے روسیوں کے لئے کھولے تو "روسی ریچھ" کی یہاں موجودگی نے برطانوی پالیسی سازوں کو پریشان کر دیا برطانوی اہلکاروں نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا کہ وہ برصغیر پاک و ہند میں جس عظیم سلطنت کی تعمیر کر رہے ہیں، روس کی حریصانہ نظریں بھی اسی سرزمین پر گڑی ہوئی ہیں۔ انگریز جس سلطنت پر اپنا قبضہ جمانے کی کوششیں کر رہے تھے روسی کچھ عرصے بعد یہاں پہنچا چاہتے تھے۔ یہ بات تاریخی طور پر بھی ثابت ہے کہ ہندوکش کے پہاڑوں کی طرف سے درّہ خیبر کی طرف بڑھنے والے قدم یہاں آ کر کبھی رُکے نہیں، بلکہ آگے بڑھتے رہے۔ روسی استعمار تہران سے آگے خلیج اور درہ خیبر کی طرف آگے بڑھ سکتا تھا، اس لئے انگریزوں کو اسے وہیں پر روکنا قرینِ مصلحت دکھائی دیا۔ ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب کی وفات کے بعد مغلیہ سلطنت جب کسی حقیقی اور قد آور قائدانہ شخصیّت سے محروم ہو گئی اور شاہی درباری سازشوں نے سلطنت کو کمزور کرنا شروع کر دیا تو یہاں ایسٹ انڈیا کمپنی کے اہلکاروں نے سازشوں کے تانے بانے زیادہ گہرے بننے شروع کر دیئے تھے۔ دوسری طرف افغانستان میں "قندھاری اور ہراتی" حکمرانوں کے درمیان قبائلی منافرت نے ایک بار پھر سر اٹھانا شروع کر دیا قندھار ابدالیوں کا مرکزِ حکمرانی تھا۔ جبکہ ہرات پر غلزئی پشتون حکمران تھے ابدالیوں کے عروج

تک قندھار فارس کے صفویوں کے ہاتھ میں تھا' لیکن ۱۷۱۶ء میں ہرات پر ابدالیوں نے اپنا قبضہ جمالیا۔ مغلوں اور صفویوں کے درمیان لڑائیوں کے دوران غلزئیوں نے ہمیشہ ایک دوسرے کے خلاف کام کیا۔ اپنے قبائلی مفادات کے لئے وہ کبھی ایک کا ساتھ دیتے اور کبھی دوسرے فریق کے حمایتی بن جاتے لیکن غلزئی بنیادی طور پر فارس کے حکمرانوں کے ساتھ تھے اور مغلوں کے خلاف قندھار پر حملہ آوری کے دوران صفویوں کے ساتھ تھے۔ اس کے بعد صفوی حکمران کے خلاف ابدالیوں نے معرکہ آرائی کی۔ صفوی حکمران سلطان حسین نے انہیں بُری طرح شکست بھی دی پھر ابدالیوں میں ایک کے بعد دوسرا حکمران بننے لگا۔ ہرات اور فرح میں پے در پے حاکموں کی تبدیلیوں نے بچی کھچی سلطنت کو کمزور تر کر دیا تھا۔ انگریزوں نے ایسے ہی مواقع کی تلاش جاری رکھی ہوئی تھی تاکہ وہ آگے بڑھ کر افغان معاملات پر مؤثر کنٹرول حاصل کر سکیں۔ پھر یہاں قبائلی چپقلشوں اور ذاتی عروج کی خواہش میں جنم لینے والی محلّاتی سازشوں اور افتراق کی داستانوں کے زیرِ سایہ برطانیہ نے ایک عظیم منصوبہ بنایا جس کا مقصد روس کو سلطنتِ شاہی سے دُور رکھنا بھی مطلوب تھا' اور افغانستان کی سرزمین پر اپنی مؤثر موجودگی کا اظہار بھی پیشِ نظر تھا۔ اپنی اس پالیسی کا اظہار پہلی مرتبہ برطانوی وزیرِ خارجہ لارڈ پالمرسٹون (UNI POLAR SYSTEM) نے ۱۸۳۷ء میں ان الفاظ میں کیا۔ "ہم عرصہ طویل سے افغانستان کو اپنے ساتھ شامل کرنے سے رُکے رہے ہیں۔ ہم نے انہیں جان بوجھ کر آزاد چھوڑ رکھا ہے' لیکن اگر روس نے انہیں روسی بنانے کی کوشش کی تو ہم انہیں برطانوی بنانے کی کوشش سے باز نہیں رہیں گے۔" برطانوی منصوبہ ساز اس بات پر متفق ہو چکے تھے کہ تہران کے ساتھ تعلقات بنا کر درحقیقت روس آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا ہے اس لئے اسے وہیں پر روکنا ضروری ہو گیا تھا' لیکن سر ہینری ڈیورینڈ نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی کہ "روسی پیش قدمی کا خوف" ضرورت سے زیادہ طاری کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ حتیٰ کہ ڈیورینڈ نے اس طرح کے خطرات کی بات کرنے والوں کو "خبطی" اور "نامعقول" قرار دیا۔ یہ سر ہینری ڈیورینڈ وہی ہے جس نے افغانستان اور برطانوی ہند کے درمیان سرحد بندی کا نقشہ بنایا۔ اب یہی سرحد ڈیورنڈ لائن کے نام سے پاکستان اور افغانستان کے درمیان سولہ سو کلومیٹر تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس وقت مقتدر انگریزوں نے ان کی تجویز کو رد کر دیا تھا اور حکومت برطانوی ہند نے ۱۸۳۰ء میں خلیج فارس میں جزیرہ کرک پر افواج اتار دیں۔ کلکتے سے شروع کئے جانے والے اس بحری حملے نے علاقے میں طاقت کے توازن میں بگاڑ پیدا کر دیا۔ یہ ابتدا تھی افغانستان میں غیر ملکی عسکری مداخلت کی۔ یکم اکتوبر ۱۸۳۹ء میں آک لینڈ نے شملہ میں "اعلانِ جنگ" جاری کیا جس کے تحت "سندھ کی

فوج" (ARMY OF INDUS) حملے کے لئے روانہ کر دی گئی۔ اس "اعلانِ جنگ" میں افغان حکمران دوست محمد پر یہ الزام لگایا گیا کہ "اس نے دولتِ برطانیہ کے پرانے دوست مہاراجہ رنجیت سنگھ پر دست درازی کی کوشش کی ہے۔" اسی اعلان میں دوست محمد پر یہ الزام بھی لگایا گیا کہ "وہ فارس کے حکمرانوں کے ساتھ مل کر برطانیہ کے مفادات کے خلاف سازشیں کر رہا ہے۔"

برطانوی اہلکاروں نے دریائے سندھ کے اس پار حملہ آور ہونے کو افغانستان پر قبضے کی پہلی کڑی قرار دے رکھا تھا ان کے طے شدہ منصوبوں کے مطابق ایک بار جب برطانوی عساکر پنجاب اور پشاور سے گزر کر دریائے سندھ کو پار کر جائیں گی تو پھر دنیا کی کوئی طاقت انہیں اس مفلوک الحال سرزمین پر قبضہ جمانے سے نہیں روک سکے گی یہی وجہ ہے کہ انہوں نے پنجاب کے سکھ حکمران مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ساتھ ساتھ افغانستان کے معزول حکمران شاہ شجاع کے ساتھ دوستی کا معاہدہ بھی کیا تھا اب اعلانِ جنگ کے بعد برطانوی سرکار کابل میں حکمران تبدیل کر کے شاہ شجاع کی صورت میں اپنا وفادار حاکم مقرر کرنے کی پالیسی پر چل نکلی تھی انہیں یقین تھا کہ جونہی برطانوی عساکر کابل میں فاتحانہ انداز میں داخل ہوں گی شاہ شجاع کے حامی دیوانہ وار گلیوں میں نکل آئیں گے اور اپنے سابقہ شاہ کی بحالی پر اس کا والہانہ استقبال کریں گے لیکن ایسا نہ ہو سکا برطانوی افواج کے کابل میں داخلے کے بعد دوست محمد وہاں سے بھاگ نکلا اس نے مقابلہ کرنے کی بجائے راہ فرار اختیار کی کابل کی گلیاں اور بازار سونے ہو گئے کوئی شاہ شجاع کے استقبال کے لئے نہ نکلا برطانوی عساکر "ناراض" قبائل کے درمیان گھر گئیں اب ان کا مقصد شاہ شجاع کو اس کی قوم کے لوگوں کے غیض و غضب سے بچانا تھا۔ افغانوں کو یہ بات انتہائی ناروا لگ رہی تھی کہ ایک بھائی بند کے مقابلے پر غیر ملکی افواج کو لا کر اقتدار پر قبضہ کیا جائے۔ جہاں انہیں دوست محمد کی بزدلی پر غصہ تھا وہاں شاہ شجاع کی "انگریز دوستی" پر بھی قلق تھا دوست محمد تو کیونکہ بھاگ کر انگریزوں کا قیدی بن چکا تھا اس لئے اسے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا لیکن شاہ شجاع تو اب ان کے درمیان حاکم کے طور پر موجود تھا افغانوں کا قہر اور غضب کسی وقت بھی بجلی بن کر اس پر نازل ہو سکتا تھا اس لئے انگریز فوج اس کی حفاظت کے لئے کابل میں براجمان تھیں۔

ڈیڑھ صدی بعد (۱۹۷۹ء) یہی کچھ روسی افواج نے کیا اشتراکی دانشوروں اور منصوبہ سازوں نے جب افغانستان کو اشتراکیت کے دامِ فریب میں الجھانے کی منصوبہ بندی کی تو نور محمد ترکئی، حفیظ اللہ امین اور ببرک کارمل کی صورت میں کئی "شاہ شجاع" پیدا کئے۔ جس طرح دریائے سندھ پار کرتے وقت برطانوی افواج نے یہ سمجھا تھا کہ بس اب کابل ان کا ہو جائے گا

بالکل اسی طرح روسی افواج نے دریائے آمو پار کرتے وقت افغانستان کو "اپنا" سمجھنے کی حماقت کی۔ انگریزوں کو بھی امید تھی کہ افغان انہیں خوش آمدید کہیں گے اور ان کا والہانہ استقبال کیا جائے گا۔ اسی طرح اشتراکی بھی ایسا ہی سمجھ کر کابل میں داخل ہوئے تھے لیکن تاریخ نے اپنے آپ کو دونوں مواقع پر ایک ہی طرح دھرایا۔ افغانوں نے دریائے سندھ کی طرف سے درہ خیبر پار کر کے آنے والوں کو بھی ذلیل و خوار کیا اور دریائے آمو کی طرف سے آنے والی اشتراکی افواج کو بھی ذلیل و خوار ہونے پر مجبور کر دیا۔ انگریز افواج نے جب افغانوں کے قہر و غضب کو محسوس کیا تو کمانڈر نے شاہِ برطانیہ کو صورتحال لکھ بھیجی فیصلہ یہ ہوا کہ یا تو یہاں برطانوی افواج کی تعداد اتنی بڑھائی جائے کہ "باغیوں" کو سر اٹھانے کی ہمت نہ ہو وگرنہ وطن واپسی کا پروگرام فوری طور پر ترتیب دے دیا جائے کابل میں موجود برطانوی سپاہ اس قدر ڈری ہوئی تھیں کہ آک لینڈ نے وطن واپسی کو ترجیح دی۔ ۱۸۴۱ء کے موسم سرما تک واپسی کا پروگرام ترتیب دے لیا گیا دوسری طرف افغانوں نے "بھاگتی ہوئی فوج" کے استقبال کی تیاریاں کر رکھی تھیں جونہی یہ فوج مشرق کی طرف بڑھی ساڑھے سولہ ہزار افراد کو ہلاک کرنے کا آغاز ہو گیا جلال آباد تک پہنچتے پہنچتے پوری برطانوی آرمی ہلاک کر دی گئی تھی صرف ایک فرد کو زندہ چھوڑا گیا تا کہ وہ برطانوی ہند کے اہلکاروں کو جا کر برطانوی فوج کا انجام بتا سکے۔ برطانوی تجزیہ نگاروں کے مطابق جنگِ پلاسی میں نواب سراج الدولہ سے معرکہ آرائی سے لے کر ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند تک برطانوی سرکار کو اس قدر جانی و مالی نقصان نہیں اٹھانا پڑا تھا جتنا شاہ شجاع کی دوبارہ تخت نشینی کے لئے حکومتِ برطانیہ کو برداشت کرنا پڑا۔ اس معرکہ آرائی میں نہ صرف ساری فوج کا صفایا ہو گیا بلکہ ۲۰ ملین پونڈ کا مالی نقصان بھی اٹھانا پڑا اور سب سے بڑھ کر برطانوی رعب و دبدبے میں کمی کا رجحان پیدا ہوا۔ برطانوی افواج کے نکلتے ہی شاہ شجاع کو قتل کر دیا گیا۔ دوست محمد دوبارہ واپس آیا اور اس نے قومی ہیرو کے طور پر افغانستان کی تعمیر و ترقی کا آغاز بھی کر دیا۔ انگریزوں نے مستقبل قریب میں افغانستان میں کسی قسم کی مہم جُوئی سے توبہ کر لی اور اپنی پوری توجّہ ہندوستان کی طرف لگا دی۔ جہاں اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد کوئی ایسی قد آور شخصیّت موجود نہیں رہ گئی تھی جو اتنی بڑی سلطنت کا انتظام و انصرام سنبھال سکے انگریزوں نے قیادت کے اس خلا کو سازشوں کے ذریعے اور بھی گہرا کرنے کی کوششیں تیز کر دیں۔

افغانستان میں ایک بار ذلیل و خوار ہونے کے بعد فی الوقت انگریزوں نے اپنی پوری توجّہ سندھ اور پنجاب پر مبذول کر دی۔ سندھ پر انہیں کنٹرول کرنے میں زیادہ مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑا پنجاب میں سکھوں کے ساتھ ان کا پہلا معرکہ ۱۸۴۶ء میں ہوا جس کے نتیجے میں برطانوی

اقتدار دریائے ستلج تک پہنچ گیا یہاں انہیں ڈوگرہ مہاراجہ کشمیر کی صورت میں ایک ایسا دوست بھی ملا جس نے چاندی کے سکوں کے عوض اپنے سکھ دوستوں کو چھوڑ دیا اس طرح انگریزوں کو سکھوں کے خلاف معرکہ آرائی میں کافی سہولت پیدا ہو گئی ڈوگرہ مہاراجہ کی اس خدمت کے صلے میں برطانیہ نے ہندوستان سے اپنے انخلا تک ' کشمیر پر اسی کے حق حکمرانی کو تسلیم کئے رکھا ے ۱۹۴ء کے بعد اسی خطے پر پاک بھارت تنازعات کا آغاز ہوا جو ہنوز جاری ہے۔ ۱۸۴۸ء میں انگریزوں نے ایک بار پھر سکھوں سے معرکہ آرائی کی اور ۱۸۴۹ء میں اس جنگ کے خاتمے کے بعد برطانوی کمپنی کا اقتدار پشاور اور درہ خیبر کے مغرب تک پہنچ چکا تھا۔ پٹھانوں کی شمال مغربی سرحدوں پر یونین جیک لہرانا شروع ہو گیا۔ کابل کے حکمرانوں کا اس علاقے پر دعویٰ تھا اور آج بھی ہے کابلی سرکار آج بھی ڈیورنڈ لائن کو تسلیم نہیں کرتی کیونکہ افغان حکمرانوں کا دعویٰ ہے کہ افغانستان کی سرحدیں دریائے اٹک (پاکستان کے صوبہ سرحد میں شامل علاقہ) تک ہیں یعنی پاکستان کا صوبہ سرحد بھی اٹک کے پل تک افغانستان میں شامل ہونا چاہئے۔ افغانوں نے ۱۸۳۹ء میں کیونکہ انگریزوں کو خاصا سبق سکھا دیا تھا اس لئے پنجاب میں برطانیہ کے پہلے چیف کمشنر جان لارنس نے تجویز پیش کی کہ برطانوی افواج کو دریائے سندھ کے مشرقی کنارے تک واپس لے آیا جائے تاکہ برطانوی سرحدوں کی یہاں سے بہتر انداز میں دیکھ بھال کی جاسکے۔ لیکن سرکار نے ایسا نہ کیا کیونکہ اس وقت "واپسی" ایک مجرمانہ عمل تصوّر کی جانے لگی تھی جو برطانیہ کے ماتھے پر ذلت کا ایک دھبہ بن گئی تھی یہاں ٹھہر کر برطانیہ نے افغانستان میں اپنے رفیق حاکم دوست محمد کے ساتھ ایک بار پھر دوستی کا معاہدہ کیا ۱۸۵۵ء میں پشاور میں اس معاہدے پر باقاعدہ دستخط ہوئے جس کے مطابق "دوستوں کا دوست اور دوست کے دشمنوں کا دشمن" رہنے کا اقرار نامہ بھی شامل تھا یہاں "دوست کے دشمنوں" سے مراد "روسی استعمار" تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب اس معاہدے کے اگلے سال شاہ فارس نے ہرات پر حملہ کیا تو برطانیہ نے بھی اس کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ تین ماہ تک فارس کی سرزمین پر خون بہانے کے بعد شاہ نے واپسی کا فیصلہ کیا انگریز شاہ کو روسیوں کا دوست تصوّر کرتے تھے یہی وجہ ہے کہ ان کی شاہ سے دشمنی تھی اور انہوں نے اس کے خلاف دوست محمد کی مؤثر امداد کی۔ انگریز اس طرح افغان حکمران کی ہمدردیاں حاصل کر کے اپنی پشت محفوظ کرنا چاہتے تھے تاکہ وہ ہندوستان پر مؤثر کنٹرول کر سکیں اس وقت وہ ہندوستان پر اپنا سیاسی و عسکری کنٹرول مکمل طور پر لاگو کرنے کی پالیسی پر عمل پیرا تھے لیکن انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ محمود غزنوی سے لے کر احمد شاہ ابدالی تک افغان جرنیل برِّصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کے دشمنوں کی بیخ کنی کے لئے آتے رہے ہیں انہیں اب بھی ڈر تھا کہ

کہیں افغانستان سے کوئی مردِ حق اٹھ کر ہندوستان میں مسلمانوں کے زوال کو روکنے کے لئے نہ آ جائے اس مقصد کے لئے انہوں نے پیش بندی کے طور پر نہ صرف دوست محمد سے دوستی کا معاہدہ کیا بلکہ شاہ فارس کے افغانستان پر حملے کے وقت دوست محمد کی مدد کر کے اپنی مخلص دوستی کا ثبوت بھی مہیا کر دیا تھا حالانکہ اس سے پہلے وہ دوست محمد کے خلاف شاہ شجاع کو تخت نشین کروانے کی کامیاب کوشش بھی کر چکے تھے یہ بات دوست محمد کے ذہن میں قائم و پختہ رہی بلکہ یہ اندازِ فکر تمام قبائلی طرزِ معاشرت کا طرّۂ امتیاز رہا ہے کہ وہ نہ تو دوستیاں بھولتے ہیں اور نہ دشمنیاں۔ دوست محمد کا انگریزوں سے رویّہ اس تناظر میں دیکھنا چاہئے۔ دوست محمد نے وقتی مصلحت کے تحت انگریزوں کے ساتھ صلح بھی کر لی تھی اور اپنے دشمن شاہ فارس کے خلاف مدد بھی لے لی تھی لیکن جب ۱۸۵۷ء میں ہندوستان میں بغاوت پھوٹ پڑی (جسے "جنگِ آزادی" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے) تو دوست محمد نے وہی قبائلی انداز اختیار کیا اس نے پٹھانوں کے گروہ "باغیوں" کی مدد کے لئے روانہ کئے یہ گروہ لہروں کی صورت میں برطانوی افواج پر حملہ آور ہوئے اس طرح لارنس کی پنجاب میں تعینات افواج کو دریائے سندھ کے مغربی کناروں پر ہی محصور ہو کر رہنا پڑا۔ دوست محمد کی پالیسی یہ تھی کہ برطانیہ کی پنجاب میں تعینات فوج کو دہلی اور لکھنؤ کی طرف جانے کا موقع نہ مل سکے کیونکہ یہی وہ مراکز تھے جہاں تحریکِ آزادی کے متوالے شدید انداز میں برطانوی افواج کا مقابلہ کر رہے تھے۔ دوست محمد نے روایتی قبائلی رہنما کے طور پر برطانیہ سے بدلہ لینے کی بھرپور کوشش کی تھی اس طرح اس نے ہندوستان میں انگریزوں سے برسرِپیکار اپنے ہم مذہبوں کی مدد بھی کر دی اور اپنے پرانے دشمن سے بدلہ لینے کا موقع بھی نہیں گنوایا۔ ویسے اس سے پہلے افغان سالاروں کی ہندوستان پر یلغاریں ہندی مسلمانوں کے حقوق کے تحفّظ کے لئے تھیں کبھی انہیں جابروں کی بڑھتی ہوئی قوّت سے نجات دلانے کے لئے افغان لشکر ہندوستان پر چڑھ دوڑا کرتے تھے ہندوستان کے ساتھ افغانوں کے تعلقات کا محور و مرکز دینِ اسلام ہی ہوا کرتا تھا لیکن تاریخ میں ایسا بھی ہوتا رہا کہ ہندوستان پر حاکم غیر مسلم حکمرانوں کے ساتھ بھی افغان حکمرانوں کے تعلقات برادرانہ اور دوستانہ رہے ان تعلقات کی مجموعی نوعیّت ثقافتی و تہذیبی نہیں بلکہ تجارتی و معاشی ہوتی تھی۔ تاریخی اعتبار سے افغانستان کے مشرقی اور جنوبی علاقوں کی معاشی زندگی میں ہندوؤں نے خاصا اہم کردار ادا کیا ہے تیسری اور چوتھی صدی قبل از مسیح موریا سلطنت کی سرحدیں افغانستان تک پھیل چکی تھیں پھر چوتھی اور پانچویں صدی قبل از مسیح گپتاراج کی بھی افغانستان میں کچھ عملداری قائم ہوئی تھی۔ آٹھویں تا دسویں صدی قبل مسیح بھی کٹر ہندو بادشاہوں نے یہاں اپنی عملداریاں بڑھانے کی کوششیں کیں لیکن اسلام کی آمد کے بعد یہاں مجموعی طور پر اسلام ہی

غالب ہو گیا اب افغانستان میں ہندوستانی نژاد دو گروہ پائے جاتے ہیں جن میں ۲۰۰ کا تعلق اب بھی ہندوستان سے ہے جبکہ ۲۵۰۰ کے قریب افغان شہری بن چکے ہیں آج سے ۵۷ برس قبل دس ہندو تاجر یہاں وارد ہوئے تھے۔ ۱۹۴۷ء کی پاک و ہند تقسیم میں یہ گروہ خاصا متاثر ہوا لیکن اس کے بعد ان کی تعداد میں خاصا اضافہ ہوا۔ یہی ہندو (ہندوستانی اور افغان) ہند افغان تعلقات میں ایک ایسے پل کا کام دے رہے ہیں جو ابھی تک قائم بھی ہے اور پاکستان کے خلاف افغانستان میں مؤثر کردار بھی ادا کر رہا ہے یہی گروہ تاجروں اور کاروباری افراد کے رُوپ میں افغانستان میں نہ صرف ہندوؤں کے قومی مفادات کا محافظ اور نگران ہے بلکہ ہندوستانی حکومت کے ایجنٹ کے طور پر افغانستان میں پاک دشمن سرگرمیوں کی نگرانی بھی کرتا ہے پاکستان کے خلاف کام کرنے والے نام نہاد پاکستانیوں کی مالی و اخلاقی معاونت کا فریضہ بھی انہی کے ذریعے پایۂ تکمیل کو پہنچایا جاتا ہے یہ الگ بات ہے کہ یہ گروہ اپنی تمام سرگرمیاں زیرِ زمین رکھتا ہے اور آج تک یہ گروہ کبھی بھی سیاسی منظر پر ظاہر نہیں ہوا ہے

سوویت مداخلت سے پہلے

روس افغان تعلقات کی ارتقائی منازل کا بیان

93

افغانستان اور سوویت روس کے دوستانہ تعلقات کی ابتدا ۱۹۲۰ء میں ہوئی جب امیر افغانستان امان اللہ خان نے روسی رہنما لینن سے خط و کتابت کی اور پھر اپنے نمائندۂ خصوصی محمد ولی کو ماسکو بھیجا' جہاں اس کا بڑی گرمجوشی سے استقبال کیا گیا یہاں پہلے افغان سوویت یونین معاہدہ دوستی پر دستخط ہوئے۔ اس پر برطانوی محکمہ خارجہ نے ناراضگی کا اظہار بھی کیا۔ لیکن یہ دوستی زیادہ پائیدار ثابت نہ ہو سکی۔ جب ۱۹۲۱ء میں سوویت روس نے بخارا اور خیوا کی مسلمان ریاستوں پر قبضہ کر کے اپنے مسلم کش عزائم کو ایک بار پھر بے نقاب کر دیا۔ بخارا کے امیر نے کابل میں سیاسی پناہ طلب کر لی تھی۔ امیر کابل کے سوویت یونین کی طرف بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ برطانیہ نے کابل سرکار کو دی جانے والی امداد بڑھا دی۔ لیکن ۱۹۲۴ء میں ایک بار پھر روسی افغانستان آئے' انہوں نے امیر امان اللہ کو طیارے تحفے میں پیش کئے' لیکن لکڑی کے بکسوں میں بند یہ طیارے ۱۹۲۷ء میں ہی کھل کر سامنے آئے۔ ۱۹۲۷ء میں سوویت سرحدی علاقے ترمیز اور کابل کے دوران فضائی سروس بھی شروع ہو گئی تھی۔ اس کے بعد امیر کابل یورپ کے دورے پر چلا' لیکن اسے واپسی نصیب نہ ہوئی کیونکہ اسی دوران نادر شاہ نے حکومت پر قبضہ کر لیا تھا۔ نادر شاہ نے بھی ۱۹۳۱ء میں روس کے ساتھ عدم جارحیّت کا معاہدہ کیا۔ نادر شاہ بھی زیادہ دیر تک حکمران نہ رہ سکا' کیونکہ ۱۹۳۳ء میں امان اللہ کے ایک وفادار نے اسے قتل کر

دیا۔ اسی سال نادر شاہ کا نوجوان بیٹا ظاہر شاہ افغانستان کے سیاسی منظر پر نمودار ہوا۔ کیونکہ اس وقت ظاہر شاہ کی عمر تھوڑی تھی اس لئے اس کے چچا ہاشم خان نے وزیر اعظم کے طور پر امورِ مملکت سنبھالے۔ نادر شاہ انگریزوں کا کٹھ پتلی کہلاتا تھا۔ ظاہر شاہ کے دور میں بھی ایسی ہی پالیسی چلتی رہی ٗلیکن اس کے ساتھ ساتھ روس کے ساتھ تعلقات بھی بڑھتے رہے۔ ۱۹۳۶ء میں روس کے ساتھ ایک تجارتی معاہدے پر دستخط کئے گئے۔ جنگِ عظیم دوم کے دوران ظاہر شاہ نے غیر جانبدار رہنے کا اعلان کیا لیکن جب جنگ کا پانسہ اتحادیوں کے حق میں پلٹنے لگا تو ظاہر شاہ نے روس اور برطانیہ کے ساتھ مضبوط تعلقات قائم کرنے کے لئے اپنے خیالات ظاہر کرنے شروع کر دیئے اور "نام نہاد" غیر جانبداریّت کا لبادہ اتار پھینکا۔ جنگ کے بعد "بادشاہتوں کے خاتمے" اور "عوام کے حقوق" کی باتیں ہونے لگیں۔ وزیر اعظم ہاشم خان نے ۱۹۴۶ء میں بدلتے ہوئے حالات دیکھتے ہوئے اپنے بھائی شاہ محمود خان کو وزارت عظمیٰ کا قلمدان سونپا۔ شاہ محمود خان نے بین الاقوامی تعلقات قائم کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ اسی دور میں امریکی امداد یہاں پہنچی اور انہوں نے افغانستان کی صحرائی زمین کو لہلہاتے باغات میں تبدیل کرنے کے منصوبے پر عمل شروع کیا لیکن بنجر اور سیلابی زمین سے کچھ نہ نکلا۔ بلکہ اس علاقے کی موجودہ پیداوار میں بھی ۵۰ فی صد کمی آگئی۔ اس کے ساتھ ہی روسیوں نے امریکیوں سے مقابلے کے رجحان کے تحت ۱۹۵۲ء میں کابل میں اپنا پہلا کمرشل آفس قائم کیا۔ امریکیوں کے ناکام تجربے کو سامنے رکھتے ہوئے روسیوں نے چھوٹے چھوٹے منصوبے شروع کئے اور اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوانا شروع کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۵۳ء میں "نوجوان افغان" کے رہنماؤں نے محل میں ایک بغاوت کے ذریعے محمود کی معزولی اور فوجی کالج میں ظاہر شاہ کے ہم جماعت محمد داؤد خان کو وزیر اعظم بنانے کا مطالبہ کیا۔ سردار محمد داؤد خان کے زمانے کے ابتدائی سالوں میں افغانستان بڑی تیزی سے روسی حلقہ اثر میں چلا گیا۔ خروشیف اور بلگانن نے ۱۹۵۵ء میں کابل کا تاریخی دورہ کیا اور ۱۰۰ ملین ڈالر کی مزید امداد کی پیشکش کی۔ امریکیوں کی نسبت یہ امداد کم شرح سود اور آسان شرائط پر تھی۔ روسیوں نے باگرام کا نیا ہوائی اڈہ بھی تعمیر کیا اور کابل کے ہوائی اڈے کو وسیع کیا۔ یہی اڈے ۱۹۷۹ء میں روسیوں کے کام بھی آئے۔ ۱۹۵۵ء میں افغانستان کو کمیونسٹوں کے توسیعی منصوبوں کے مدّمقابل معاہدہ بغداد میں شامل کرنے کی کوشش کی گئی لیکن افغانستان نے اس میں شامل ہونے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ پاکستان کو اس معاہدے کے تحت امریکی فوجی امداد ملنی شروع ہو گئی تھی تاکہ کمیونسٹوں کے ممکنہ جارحانہ عزائم کے خلاف بند باندھا جا سکے۔ اس لئے داؤد

حکومت کی طرف سے "پشتونستان" کے مسئلے کو بڑے زور و شور سے اٹھایا گیا۔ افغانستان میں بسنے والے ۹۰ لاکھ اور پاکستان میں رہنے والے تقریباً ۲ کروڑ پشتونوں کے حقوق کے نام پر اس مسئلے کو کھڑا کر کے پاکستان کے خلاف باقاعدہ محاذ آرائی شروع کی گئی۔ پاکستان نے بھی جوابی کارروائی کر کے کابل انتظامیہ پر دباؤ ڈالنے کی کوشش کی کہ وہ اس مسئلے کی پشت پناہی سے ہاتھ کھینچ لے۔ یہ جوابی کارروائی تجارتی اور معاشی میدان میں تھی۔ داؤد حکومت پر دباؤ ڈالنے کے لئے پاکستان نے افغانستان کے تجارتی راستے بند کر دیئے اس سے "مسئلہ پشتونستان" کیا دبتا افغان حکومت نے روسی امداد پر زیادہ انحصار کرنا شروع کر دیا۔ ۱۹۵۰ء اور ۱۹۵۶ء کے دوران افغانستان کو ملنے والی روسی امداد میں ۳۰ فی صد اضافہ ہوا۔ مشرقی یورپ کے ممالک بشمول چیکوسلوواکیہ، پولینڈ اور بلغاریہ نے بھی افغانستان کی مدد کرنا شروع کر دی، تاکہ پاکستان کی طرف سے عائد پابندیوں کے منفی اثرات کا ازالہ ہو سکے۔ ۱۹۶۱ء تک روزانہ پندرہ روسی جہاز افغانستان سے تازہ پھل تربوز اور دیگر خشک میوہ جات لے کر مشرقی یورپ کی منڈیوں تک پہنچا رہے تھے۔ افغان حکومت ۱۹۵۶ء تک واشنگٹن سے امداد حاصل کرنے کی طلب گار رہی، لیکن مثبت جواب نہ پا کر داؤد حکومت نے روسیوں سے باقاعدہ امداد طلب کی۔ روسیوں نے اپنے طویل مدتی عزائم کے مطابق اس پکار کا بڑی فراخدلی سے جواب دیا اور بغیر شرائط کے امداد کا اعلان کیا۔ روسیوں نے افغانستان کی جنگی مشین کو "برطانوی ہتھیاروں پر انحصار" سے ہٹا کر "روسی اسلحے" پر لگانے کے منصوبے کو عملی شکل دینی شروع کی۔ مغربی ممالک نے کیونکہ داؤد حکومت کی عسکری امداد بالکل بند کر دی تھی اس لئے روسیوں نے اس خلا کو بڑی فراخ دلانہ امداد کے ذریعے پُر کیا۔ روسی مشیر کابل کی ملٹری اکیڈیمی میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کو بڑی آسانی سے اس بات پر راضی کر لیتے تھے کہ "مغربی دنیا افغانوں کی ترقی پر خوش نہیں ہے اور نہ ہی وہ ترقیاتی و تعمیراتی پروگراموں کے سلسلے میں افغانوں کی مدد گار ہو سکتی ہے۔" اسی دور میں روسیوں نے افغانستان میں نہ صرف فوجی اہمیت کے حساس زمینی آلات نصب کئے بلکہ مواصلات کے نظام کو بھی اسی نقطہ نظر سے ترتیب دیا۔ ایک طرف روسیوں نے نئی تعمیرات و تنصیبات کے ذریعے نظام کو جدید خطوط پر استوار کرنا شروع کر دیا تھا تو دوسری طرف معاشرتی و تہذیبی شعبہ ہائے زندگی میں بھی انقلاب لانے کی کوشش کی۔ بے پردگی اور ملحدانہ خیالات کی ترویج اسی دور کا خاصہ ہے۔ روسیوں کے سامنے، ازبکستان اور ترکمانستان کو سوویت جمہوریاؤں میں شامل کرنے کی مثالیں تھیں۔ انہوں نے ان مسلم ریاستوں کو جس انداز میں سوویت روس میں شامل کر کے ضم کر لیا تھا بالکل اسی انداز میں انہوں نے یہاں بھی کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ سابقہ کامیابیوں کے نشے میں

سرشار ہو کر روسی ظاہر شاہی اور محمد داؤد خان کی انتظامیہ کی سرپرستی میں اپنے منصوبوں کو عملی جامہ پہنا رہے تھے۔ امریکہ اور مغربی دنیا کی ترجیحات کچھ اور تھیں۔ انہوں نے اس بات پر ہرگز توجہ نہیں دی کہ ایک مسلم ریاست کو روسی حلقہ اثر میں جانے سے روکنے کے لئے انہیں کچھ کرنا چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ روسیوں کو آزادانہ طور پر اپنے طے شدہ اہداف حاصل کرنے کے لئے اپنے طے شدہ منصوبوں پر عمل در آمد کرنے کا موقع ملتا رہا۔ داؤد کے زمانے میں روسیوں کی جدّت نے صدیوں سے قائم افغان معاشرتی و سماجی ڈھانچے میں دراڑیں ڈالنی شروع کر دی تھیں۔ "جدیدیّت" اور "ترقی" کے نام پر "اسلامی عقائد" کی جگہ ملحدانہ افکار اور نظریات کو فروغ دینا شروع کیا تو ایک فطری مزاحمت ابھرنی شروع ہو گئی۔ بے پردگی اور مخلوط طرزِ معاشرت کی ترویج نے مزاحمتی جذبات کو اور بھی ابھارا۔ پاک افغان سرحد یعنی ڈیورنڈ لائن کے اطراف میں رہنے والے قبائل نے بھی شمال کی طرف سے آنے والی اس آندھی کے آثار محسوس کرنے شروع کر دیئے تو مزاحمتی جذبات اور بھی بھڑکنے لگے۔ ان جذبات کے بھڑکنے کی ایک وجہ ان تجارتی مفادات کا چھن جانا تھا جو افغان روس معاہدہ دوستی سے پہلے انہیں حاصل تھے۔ کیونکہ اس معاہدے کے بعد افغانستان میں پیدا ہونے والے پھل اور دیگر نقد اجناس اب براہ راست مشرقی یورپی منڈیوں میں جانے لگی تھیں۔ روسیوں کے صنعتی اور تجارتی میدان میں آنے سے یہاں قبائل اور حکومت کے مابین پائے جانے والے مفادات کا توازن بگڑنے لگا تو اس سے بھی روسیوں کے خلاف ایک نفرت سی پیدا ہونے لگی۔ اس کے علاوہ پاکستان کے خلاف گرم محاذ میں اور بھی گرمی پیدا ہونے سے ڈیورنڈ لائن کے آرپار حالات میں کشیدگی پیدا ہو گئی۔ نارمل زندگی کے مشاغل تناؤ کا شکار ہونے لگے۔ ان تمام باتوں کا اثر ظاہر شاہی پر منفی انداز میں پڑنے لگا۔ ظاہر شاہ مغرب کے ساتھ رہ کر تعمیر و ترقی کے پروگراموں کو جاری رکھنے کا حامی تھا جبکہ داؤد مشرق و مغرب دونوں کے ساتھ رہ کر تعمیر و ترقی کی منازل طے کرنا چاہتے تھے جو مغربی اقوام کو پسند نہیں تھا۔ انہی نظریات نے آگے بڑھتے بڑھتے شاہ اور اس کے وزیر اعظم کے درمیان اختلافات کو اس قدر شدید کر دیا کہ ۱۹۶۳ء میں محمد داؤد خان کو مستعفی ہونا پڑا اور ان کی جگہ ایک غیر معروف شخص ڈاکٹر محمد یوسف نے وزارتِ عظمیٰ کا قلمدان سنبھال لیا۔ ظاہر شاہ کا دورِ حکومت مجموعی طور پر مغربی استعماری قوتوں کے مفادات کا نگران اور محافظ سمجھا جاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ظاہر شاہ کا خاندان اور اس کے رابطے صرف مغربی ممالک سے ہی تھے لیکن سردار محمد داؤد خان کے دس سالہ وزارتِ عظمیٰ کے دور میں یہاں روسی اثرات پھیلے، کیونکہ محمد داؤد خان تعمیر و ترقی کے سلسلے میں جو امداد مغربی ممالک سے حاصل کرنا چاہتا تھا وہ اسے نہیں مل سکی پاکستان کے

خلاف "مسئلہ پشتونستان" کے حوالے سے پیدا ہونے والے تناؤ اور پھر ممکنہ عسکری مہم جوئی کے لئے انہیں اسلحے کی ضرورت تھی جو امریکہ' برطانیہ اور دیگر ممالک نے دینے سے انکار کر دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس خلا کو پُر کرنے کی آڑ میں روسیوں نے اپنا حلقہ اثر بڑھایا اور بڑی کامیابی سے اپنے مستقبل کے عزائم کے مطابق افغانستان کو ترقی کی شاہراہ پر لگا دیا۔ اس دور میں مغربی ممالک نے افغانستان کو کسی نہ کسی حد تک اقتصادی و ٹیکنیکی امداد فراہم کی۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں کئی جگہوں پر امریکی و روسی ماہرین شانہ بشانہ کام کرتے ہوئے بھی ملتے تھے' لیکن روسیوں نے اپنے طویل مدتی منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے جس تیزی کا مظاہرہ کیا یا داؤد انتظامیہ نے انہیں جو سہولیات فراہم کیں اس نے صورتِ حال میں ارتعاش پیدا کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ "پاکستان کے ساتھ دشمنی" اور "افغانستان کو روسی حلقہ اثر میں دھکیلنے" کے الزامات کے تحت سردار محمد داؤد کو مستعفی ہونا پڑا۔ اس کے فوراً بعد شہنشاہ ایران نے پاک افغان تعلقات میں پائی جانے والی کشیدگی کو ختم کرنے کے لئے دونوں ممالک کے نمائندوں کو اپنے ملک میں بلا کر مذاکرات کی دعوت دی۔ تہران میں ہونے والے ان مذاکرات کے نتیجے میں حالات نے ایک نئی کروٹ لی اور "معاہدہ تہران" کے نتیجے میں حالات بہتر ہوئے۔ ڈیورنڈ سرحد کھلی اور پاک افغان تجارتی تعلقات میں تیزی پیدا ہوئی۔ افغانستان کو بھیجی جانے والی لاکھوں ڈالر کی امریکی امداد جو کراچی میں پڑی گل سڑ رہی تھی اس معاہدے کے بعد وہ بھی افغانستان کی طرف روانہ کر دی گئی۔ ڈاکٹر محمد یوسف حکومت کو امریکی انتظامیہ نے کئی اور پروگراموں میں بھی امداد فراہم کرنے کا وعدہ کیا۔ ورلڈ بینک' بین الاقوامی مالیاتی فنڈ اور دیگر کئی ایجنسیوں نے یہاں ترقیاتی پروگرام شروع کرنے میں دلچسپی کا اظہار کیا۔ کروڑوں ڈالر کی امریکی اشیاء کابل میں آنے لگیں تو اس کے ساتھ ساتھ امریکی ماہرین کے چھوٹے چھوٹے گروپ بھی وارد ہونے لگے جنہوں نے افغانوں کو ان اشیاء کے استعمال کی تربیّت دینی شروع کی۔ اس طرح تعمیر و ترقی کا ایک نیا دور شروع ہوا' لیکن یہ دور بھی زیادہ دیر پا ثابت نہ ہو سکا۔

۱۹۶۴ء میں نیا آئین بنایا گیا جسے "لوئے جرگہ" میں منظور کیا گیا۔ اس لوئے جرگہ میں ظاہر شاہ کی بادشاہت کو آئینی طور پر سند جواز بھی عطا کر دی گئی۔ اسلام کو ریاست کا دین اور فقہ حنفی کو قانون سازی کے ماخذ کے طور پر تسلیم کیا گیا۔ پشتو کے ساتھ ساتھ اب دری کو بھی سرکاری زبان کا درجہ دے دیا گیا۔ کیونکہ پورے افغانستان میں حنفی مسلمانوں کی اکثریّت تھی اس لئے حنفی ماخذ قانون کو اعلیٰ حیثیّت دے کر اکثریّت کے جذبات کی ترجمانی کی گئی۔ دو ایوانی پارلیمینٹ کی منظوری دی گئی۔ اس نئے جمہوری دور میں کابل میں چالیس ہزار ووٹروں میں سے صرف ۱۵

ہزار نے اپنا حق رائے دہی استعمال کیا۔ امریکہ سے تعلیم یافتہ ڈاکٹر عبدالظاہر کو ایوانِ زیریں کا صدر منتخب کیا گیا اور اس طرح آئینی بادشاہت کے تحت "عوامی دور" کا آغاز ہوا۔ لیکن معاملات نے فوراً دوسرا رخ اختیار کرنا شروع کر دیا۔ نئے آئین کے تحت قائم ہونے والی حکومت بھی "امریکہ نواز" لگ رہی تھی۔ اشتراکیوں نے فوری طور پر اس نئے نظام کو خراب کرنے کے لئے نئی کابینہ کی نامزدگی کے خلاف مظاہرے کرنے شروع کر دیئے۔ ڈاکٹر محمد یوسف پر الزامات کی بارش شروع کر دی گئی۔ اس مہم کی قیادت کابل یونیورسٹی کا ایک شعلہ بیان مقرر ببرک کارمل کر رہا تھا۔ یونیورسٹی کے طلبہ نے نئی جمہوری آزادیوں کو اپنی مرضی سے استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔ وزیراعظم کو "بددیانت" قرار دے کر مظاہرے شروع کر دیئے گئے تھے۔ مظاہرین وزیراعظم کی رہائش گاہ تک جا پہنچے اور انتہائی غلیظ زبان استعمال کی۔ اکتوبر ۲۵ر ۱۹۶۵ء کو ایسے ہی ایک مظاہرے کے دوران پولیس نے گولی چلا دی، جس سے تین طلبہ ہلاک اور کئی شدید زخمی ہو گئے۔ چار دن بعد ڈاکٹر محمد یوسف نے استعفیٰ دے دیا۔ یہ اشتراکیوں کی بڑی کامیابی تھی کہ وہ نئے نظام کو ابتدائی مرحلے پر ہی کمزور کرنے میں بظاہر کامیاب ہوئے تھے لیکن ظاہر شاہ نے امریکہ اور برطانیہ میں اپنے سابق سفیر محمد ہاشم میوندوال کو نیا وزیراعظم مقرر کیا۔ اشتراکی ایک بار پھر پس منظر میں ہی رہے اور اقتدار کے ایوانوں تک ان کی رسائی نہ ہو سکی۔ اس سے ایک طرف مغربی حلقہ اثر کے مؤثر ہونے کا عملی مظاہرہ ہو گیا تو دوسری طرف اشتراکیوں کی فی الوقت ناکامی کھل کر سامنے آ گئی۔ لیکن طلباء پر گولی چلانے اور چند طالبعلموں کے مر جانے سے اشتراکیوں کے ہاتھ "شہیدوں کا خون" لگ گیا جس سے ان کی اینٹی حکومت تحریک میں جان پڑ گئی۔ پھر مظاہروں کا ایک سلسلہ چل نکلا۔ کابل میں تعلیمی ادارے "تااطلاع ثانی" بند کر دیئے گئے۔ جمہوریت، آزادی، خودمختاری جیسے نعروں سے کابل ایک بار جاگ اٹھا۔ ایسا لگنے لگا جیسے نوجوان افغانوں کو "غلامی سے آزادی" کی کسی لافانی تڑپ نے جگا دیا ہے اور وہ بیسویں صدی میں آن پہنچے ہیں۔ برصغیر پاک و ہند میں بھی کچھ عرصہ قبل ایسے جذبات نے سر اٹھایا تھا جس کی وجہ سے برطانوی ہند میں بیداری اور آزادی کی ایک لامتناہی لہر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ نئے دستور نے افغانستان میں بھی ایسا ہی ایک "پینڈورا بکس" کھول دیا تھا۔ نوجوانوں میں جذباتی نعرے مقبول ہونے لگے تھے نوجوان چاہتے تھے کہ ان کی بے لگام خواہشات کو جنہوں نے مطالبات کی صورت اختیار کر لی تھی فی الفور قبول کر لیا جائے۔ بھڑکے ہوئے عوامی جذبات کو روکنا مشکل ہوتا چلا جا رہا تھا۔ نور محمد ترکئی نے خود کو "عوام یا جمہور کی آواز" کے طور پر نمایاں کرنا شروع کر دیا۔ اس نے "خلق" کے نام سے ایک پرچہ بھی نکالا اور اپنے نظریات کو عوامی رنگ میں پیش

کرنا شروع کر دیا۔ گو یہ پرچہ تھوڑے ہی عرصے میں بند ہو گیا۔ نئے وزیراعظم نے پروگریسو ڈیمو کریٹک پارٹی قائم کر کے اپنی انتظامی صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کرنے کی کوشش کی اور ۱۹۶۷ء میں امریکی صدر جانسن سے ملاقات کی تاکہ ان سے اقتصادی امداد طلب کی جا سکے۔ امریکی انتظامیہ نے افغانستان میں تیسرے پنج سالہ منصوبے کے عملی نفاذ کے لئے اقتصادی امداد فراہم کرنے کا وعدہ کیا۔

اس وقت تک افغانستان کی برآمدات کا کثیر حصہ روس جاتا تھا۔ کل برآمدات کا ایک تہائی روس بھیجا جاتا تھا اور یہ امریکی برآمدات سے چار گنا زیادہ تھا۔ ۱۹۶۷ء میں روسی صدر نکولائی پوڈگورنی نے افغانستان کا دورہ کیا اور ناگلو میں روسی تعاون سے قائم کردہ ایک پاور پلانٹ کا افتتاح کیا۔ اس سال تک روسی حکومت یہاں ۵۶۸ ملین ڈالر کی سرمایہ کاری کر چکی تھی جبکہ امریکی سرمایہ کاری کا تخمینہ ۳۳۸ ملین ڈالر تھا۔ ۶۹۔ ۱۹۶۸ء کے دوران روس نے یہاں ۵ء۳۰ ملین ڈالر کی سرمایہ کاری کی جبکہ امریکہ ویتنام میں پھنسا ہونے کی وجہ سے یہاں صرف ۸ء۴ ملین ڈالر کی ہی سرمایہ کاری کر سکا۔ ۷۰۔ ۱۹۶۹ء میں امریکی سرمایہ کاری ۱۰۴ ملین ڈالر سے زیادہ نہ ہو سکی۔ ان سرمایہ کاریوں سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ امریکہ افغانستان کو کس قدر ترجیح دیتا رہا ہے۔ اکتوبر ۱۹۶۷ء میں طلبہ مظاہروں کی شدّت کو دیکھتے ہوئے میوندوال کابینہ مستعفی ہو گئی اور کابل یونیورسٹی کے ریکٹر نور محمد اعتماد ی نے وزارتِ عظمیٰ کی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ بدلتے ہوئے حالات میں روسیوں نے اپنے حلقہ اثر کو پھیلانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ جنوری ۱۹۶۸ء میں روسی وزیر خارجہ کوسیگن نے کابل کا دورہ کیا اور کابل انتظامیہ کو فراخدلانہ اقتصادی امداد کی پیشکش کی۔ ۱۹۶۹ء میں بھارتی وزیراعظم مسز اندرا گاندھی نے بھی کابل کا دورہ کیا اور اس کے فوراً بعد کابل سے بھارتی درآمدات کا حجم پانچ گنا زیادہ ہو گیا۔ مئی ۱۹۶۹ء میں کوسیگن نے ایک بار پھر کابل کا دورہ کیا اور کابل میں آزادی کی پچاسویں سالگرہ میں شرکت کی۔ اسی دوران پشتونستان کا مسئلہ ایک بار پھر زور شور سے منظر عام پر آنا شروع ہوا۔ بھارت اور روسی حکام نے افغانستان کے ذریعے پاکستان پر دباؤ بڑھانا شروع کر دیا تھا۔ کابل سرکار نے شمال مغربی علاقہ جات بشمول دیر، سوات اور چترال میں بسنے والے پشتونوں کے حقوق کے نام پر "علیحدگی پسند" تحریک کی پشت پناہی کرنی شروع کر دی تھی اور پاکستان کے ساتھ ان کے "زبردستی کے الحاق" کو چیلنج کرنا شروع کر دیا۔ اس کا نتیجہ کیا نکلنا تھا، پاک افغان تعلقات میں ایک بار پھر کشیدگی آنی شروع ہو گئی تھی۔ دوسری طرف روس نے ۱۲۵ میل لمبی گیس پائپ لائن مکمل کر کے افغانستان سے نکلنے والی گیس اپنے ملک پہنچانا شروع کر دی۔

اس گیس کی قیمت کا تعین بھی انہوں نے خود ہی کیا اور کہا کہ اس گیس کی روس بر آمد کے ذریعے افغانستان اقتصادی قرضوں کی واپسی کر سکے گا۔ افغانستان میں لگائے جانے والے الیکٹرک پلانٹ سے بننے والی بجلی کی ترسیل بھی روس کی طرف شروع کر دی گئی۔ دوسرے الفاظ میں' تعمیرات تو افغانستان میں ہو رہی تھیں لیکن اس کا فائدہ دونوں ملکوں نے اٹھانا ہوتا تھا۔ مواصلات کے نظام کے پھیلاؤ نے بھی ایسی ہی صورت اختیار کی۔ کابل سے روس تک جانے والی ایک سڑک کی تعمیر میں ۲۵ فٹ چوڑی سرنگ کا شمار دنیا کی بلند ترین سرنگوں میں ہوتا ہے۔ یہ سرنگ سطح سمندر سے گیارہ ہزار فٹ بلند کوہ ہندوکش کو کاٹ کر بنائی گئی ہے۔ اس سے پہلے بنائی جانے والی سالانگ ہائی وے ۱۹۶۴ء سے کام کر رہی تھی جس پر ۶۰۰ ٹرک روزانہ نقل و حمل میں مصروف رہتے تھے۔ ان ٹرکوں میں اقتصادی و معاشی نوعیت کی نقل و حمل ہوتی تھی لیکن روسی دراصل اپنے طویل منصوبوں کے تحت کام کر رہے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ۱۹۸۰ء میں انہوں نے یہاں لشکر کشی کا فیصلہ کیا تو انہیں نقل و حمل اور مواصلات کے حوالے سے کسی قسم کے مسائل کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ ۱۹۶۹ء میں نئے انتخابات ہوئے لیکن اشتراکیوں کے ہاتھ کچھ بھی نہ آیا۔ نئی پارلیمینٹ کے ۲۱۶ اراکین ظاہر شاہ کے وفادار تھے۔ ان میں ایک خاتون بھی شامل تھی لیکن اس کے باوجود نور احمد اقتدار میں رہا۔ اس کی کابینہ میں بھی "ہم خیال" لوگ شامل نہیں تھے لیکن وہ اس اعتبار سے ہم خیال ضرور تھے کہ وہ سب کے سب "شاہ کے ادنیٰ خادم" کا کردار ادا کرنے پر متفق تھے۔ ۱۹۷۰ء اور ۱۹۷۲ء کے دوران رونما ہونے والے واقعات نے نظامِ حکومت کی اندرونی کمزوریوں کو اجاگر کرنا شروع کر دیا تھا لیکن حیران کن حد تک "بادشاہت" مضبوط دکھائی دے رہی تھی۔ ۱۹۷۱ء کے وسط میں نور احمد نے استعفیٰ دے دیا اور پھر ظاہر شاہ نے روم میں اپنے سفیر عبدالظاہر کو دوبارہ واپس بلا کر وزیراعظم مقرر کیا۔ اقتدار کا یہ کھیل جاری تھا لیکن عوام کو بنیادی ضروریات زندگی ہی میسر نہیں تھیں۔ ایک سال بعد عبدالظاہر نے بھی استعفیٰ دے دیا۔ اس کے بعد محمد شفیق نے وزارتِ عظمیٰ کا قلمدان سنبھالا اور وقتی طور پر ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ ظاہر شاہی نظامِ حکومت برطانوی طرز کی آئینی بادشاہت میں تبدیل نہ ہو سکا کیونکہ اس نظام کے تحت ایوان زیریں میں بننے والی حکومتیں عوامی امنگوں کے مطابق امور مملکت نہ چلا سکیں۔ اس کی بنیادی وجہ کمیونسٹوں کی "شرارتیں" اور "سازشیں" تھیں۔ روس کی اقتصادی امداد کے ساتھ ساتھ یہاں انہوں نے اپنا حلقہ اثر بھی مؤثر بنانے کے لئے جو کاوشیں شروع کر رکھی تھیں ان کی کامیابی کا انحصار ہی اس بات پر تھا کہ "موجودہ نظام" کامیاب نہ ہو اور انارکی پھیلے تاکہ وہ اس انارکی سے فائدہ اٹھا کر اقتدار کے ایوانوں میں نقب لگا سکیں۔ اشتراکیوں کے اس

بڑھتے ہوئے اثرونفوذ کے خلاف علمائے کرام کے ساتھ ساتھ ''ملاؤں'' نے بھی ردِّعمل کا مظاہرہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ علما شہروں میں اور ''ملاّ'' دیہی علاقوں میں اپنے معاشرتی اثرونفوذ کے باعث حکمرانوں کی ''بدیشی پالیسیوں'' کے خلاف اپنا ردِّعمل ظاہر کرنے لگے تھے۔ کابل میں یہ کشمکش زیادہ شدید ہو گئی تھی کیونکہ اشتراکی سب سے زیادہ اسی جگہ پر فعال تھے۔ دارالحکومت اور ذرائع مواصلات کا مرکز ہونے کی وجہ سے کابل افغانستان کا عصبی مرکز تھا' اس لئے یہاں سے اٹھنے والی ہر آواز کی اثر پزیری بھی زیادہ تھی۔ ''نوجوانانِ اسلام'' کے نام سے اینٹی اشتراکیت تحریک کا آغاز ستر کی دھائی کے آغاز سے پہلے ہی ہو چکا تھا۔ جوں جوں اشتراکیوں کی سازشیں تیز ہو رہی تھیں اسی رفتار سے ان کی مزاحمتی تحریک بھی فعال اور منظم ہوتی چلی جا رہی تھی۔ موسیٰ شفیق کی بطور وزیرِاعظم نامزدگی اس مزاحمتی تحریک کی اثر پزیری کا منہ بولتا ثبوت تھا کیونکہ موسیٰ شفیق اپنے سیاسی و تعلیمی پس منظر کے حوالے سے ایسا مسلمان شخص تھا جس پر ''ملا'' اور کابل میں تحریکی کام کرنے والے ''نوجوانانِ اسلام'' اعتماد کر سکتے تھے۔ موسیٰ شفیق کا تعلق اخوان المسلمین سے تھا۔ اس نے جامعۃ الازہر سے دینی تعلیم بھی حاصل کی تھی اور وہ اینٹی کمیونسٹ ہونے کے ساتھ ساتھ اسلام اور اسلام پسندوں سے محبت بھی کرتا تھا۔ موسیٰ شفیق نے آ کر حالات کو سنبھالا دینے کی کامیاب کوششیں بھی کیں لیکن مضطرب حالات نے ایک بار پھر کروٹ لی۔ ظاہر شاہ اپنے خاندان کے ساتھ تفریحی دورے پر ملک سے باہر گیا ہوا تھا کہ اس کے چچازاد لیفٹیننٹ جنرل محمد داؤد خان نے بادشاہت کا خاتمہ کر کے اپنے آپ کو جمہوریہ افغانستان کا صدر اور وزیرِاعظم ہونے کا اعلان کر دیا۔ صدر کی نئی کابینہ میں جرنیلوں کی ایک کھیپ شامل تھی جنہیں مملکت کا نظم و نسق مؤثّر انداز میں چلانے کے لئے کابینہ میں شامل کیا گیا تھا۔ داؤد نے ۱۹۷۴ء میں ماسکو کا دورہ کیا اور اپنے پرانے تعلقات بحال کر لئے ۱۹۷۷ء میں لوئے جرگہ بلا کر نئے دستور کی منظوری لے لی۔ اس دوران داؤد نے اپنے اقتدار کو تحفّظ دینے کے لئے نہ صرف سوویت یونین سے تعلقات قائم کرنے میں پھرتی کا مظاہرہ کیا بلکہ افغانستان میں ابھرتی ہوئی ''اسلامی تحریک'' کو بھی کچلنے میں کمزوری نہیں دکھائی۔ پھر پاکستان ہجرتوں کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہوا جو دسمبر ۱۹۷۹ء میں اس وقت تیز ہو گیا جب روسی افواج نے کابل پر قبضہ کر لیا۔

جنرل داؤد نے تربیت یافتہ آرمی کے زور پر ریاستی نظم و نسق پر گرفت مضبوط کر لی تھی۔ طبقہ اشرافیہ بھی اس کا حامی تھا کیونکہ انہیں اس بات پر پختہ یقین تھا کہ جنرل داؤد جو کچھ مرضی بن جائے لیکن اس کی رگوں میں دوڑنے والا خون ''شاہی'' ہی رہے گا۔ اشتراکی اپنے طے شدہ منصوبوں کے عین مطابق سازشیں کرتے رہے۔ داؤد کی لبرل پالیسیوں کی وجہ سے اشتراکیوں کو

یہ گمان تھا کہ روس سے دوستی کے معاہدے کرنے کے باوجود داؤد "ان کا آدمی" نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جنرل داؤد پر کئی قاتلانہ حملے بھی ہوئے لیکن وہ بچ رہا۔ داؤد کی لبرل خارجہ پالیسی نے بھی اسے اشتراکیوں کی نظروں میں پہلے ہی مشکوک بنا دیا تھا۔ پاکستان اور سعودی عرب کے دوروں نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ بالاخر اپریل ۱۹۷۸ء میں داؤد کو اس کے خاندان کے سینکڑوں افراد سمیت موت کی گھاٹ اتار دیا گیا۔ اس خونی انقلاب کے بعد اقتدار کی زمام کار براہ راست اشتراکیوں کے ہاتھوں میں آ گئی۔ نور محمد ترکئی نے ۳۵ رکنی انقلابی کونسل کے سربراہ کے طور پر اقتدار سنبھال لیا۔ اس کا تعلق پیپلز ڈیموکریٹک پارٹی آف افغانستان کے خلق دھڑے سے تھا۔ اس نے آتے ہی نہ صرف ملک کا نام بدل دیا بلکہ جھنڈے کو بھی تبدیل کر دیا۔ ان تبدیلیوں سے اس نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ ملک میں حقیقتاً انقلاب آ گیا ہے۔ نئی انتظامیہ نے آتے ہی دستور سے کئی "غیر ضروری" قوانین کو "بوسیدہ" قرار دے کر نکال دیا۔ ان قوانین کا تعلق اسلامی نقطہ نظر سے تھا۔ نور محمد ترکئی نے انہیں "جاہلانہ" اور "بوسیدہ" قرار دے کر اپنے سچے اور مخلص اشتراکی کارکن ہونے کا اعلان کر دیا تھا "نوجوانانِ اسلام" کی سرگرمیاں بھی تیز ہونا شروع ہو گئیں۔ پہلے جو بالواسطہ تنازعہ تھا' اس نے اب براہ راست تصادم کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اشتراکی ایوانِ اقتدار میں داخل ہو کر اسلام کو دیس نکالا دینے کی پالیسی پر گامزن ہو چکے تھے۔ دسمبر میں نور محمد ترکئی نے ماسکو کا دورہ کیا اور ۲۰ سالہ معاہدہ دوستی پر دستخط کئے۔ نور محمد ترکئی کی طرف سے کئے جانے والے اس معاہدے نے افغانستان میں ہونے والی داخلی کشمکش کو اور بھی تیز کر دیا۔ کابل اور اس کے مضافات میں جاری مزاحمتی تحریک اور بھی تیز ہو گئی۔ شمالی افغانستان اور چند دیگر علاقوں میں پنپنے والی مزاحمتی تحریک بڑی تیزی سے دیگر شہروں میں بھی پھیل گئی۔ مغربی اور جنوبی افغانستان بھی مزاحمتی تحریک کے مراکز میں بدلنے لگے اس دور میں چھ ہزار اشتراکی روسی مشیر کابل پہنچے تاکہ افغان فوج کو بہتر انداز میں مزاحمتی تحریک کچلنے کے لئے استعمال کیا جا سکے۔ اس وقت افغان فوج ایک لاکھ باقاعدہ سپاہ' تین آرمڈ ڈویژن' دس انفنٹری ڈویژن اور ۱۴۴ جنگی طیاروں پر مشتمل تھی۔ ۱۰ ہزار آدمی ایئر فورس میں کام کر رہے تھے۔ اسی دور میں ۲۵ ہزار کے قریب فوجی بھگوڑے ہو گئے۔ کیونکہ جب بھی ان فوجیوں کو مزاحمتی گروپوں کے خلاف معرکہ آرائی کے لئے بھیجا جاتا یہ ان سے لڑنے کی بجائے خود بھاگ جاتے یا ان سے مل جاتے۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۶ ر ستمبر ۱۹۷۹ء میں نور محمد ترکئی کو قتل کر کے اس کے ڈپٹی وزیر اعظم اور وزیر خارجہ حفیظ اللہ امین کو کابل کی مسندِ اقتدار پر لا بٹھایا گیا۔ حفیظ اللہ امین اپنی نظریاتی وابستگی کے علاوہ جبر و ظلم میں بھی ایک خاص ملکہ رکھتا تھا' اس لئے اسے اقتدار دے کر روسی یہ توقع کر رہے تھے کہ

اب تحریکِ مزاحمت کو کچل دیا جائے گا۔ حفیظ اللہ امین نے روسی گن شپ ہیلی کاپٹروں ' بھاری ٹینکوں ' ۲۱ مگ طیاروں اور ایس یو ۲۰ بمبار طیاروں کی مدد سے مزاحمتی تحریک کا خاتمہ کرنے کی بھرپور کاوشیں شروع کر دیں۔ اشتراکی مشیروں میں ایک ایسا فوجی جنرل بھی شامل تھا جس نے ۱۹۶۶ء میں چیکوسلواکیہ پر روسی قبضے کے وقت افواج کی کمانڈ کی تھی۔ اب یہی جنرل ایلکسی یپی شیو کابل میں جاری خانہ جنگی کے دوران افغان دستوں کو ہدایات جاری کر رہا تھا۔ دسمبر ۱۹۷۹ء کے آغاز تک افغانستان کے دیہی علاقے مکمل طور پر گوریلوں کے قبضے میں آ چکے تھے جبکہ افغانستان کے شہری مراکز دن کے وقت حفیظ اللہ امین حکومت کے ہوتے لیکن رات کے وقت وہاں افغان گوریلوں کے حملوں کا خوف طاری ہوتا۔ اس لئے فوج "فل الرٹ" پوزیشن پر ہوتی۔ اس دوران افغان بھگوڑے فوجیوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا کیونکہ روایتی افغان معاشرے میں سوویت یونین کی پشت پناہی پر چلنے والی ایسی حکومت کو پذیرائی نہیں مل رہی تھی جو اپنے ہی ہم وطنوں کی قتل و غارت گری کے منصوبوں پر عمل پیرا ہو چکی تھی۔ پانچ لاکھ کے قریب افغان اپنے گھر بار چھوڑ کر پاکستان میں پناہ گزین ہو چکے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ افغان فوج کے ذریعے صورت حال پر قابو نہیں پایا جا سکے گا یہی وجہ ہے دسمبر ۷۹ء اشتراکی حکام نے افغانستان میں اپنی افواج داخل کرنے کا پروگرام بنایا۔ امریکہ کی اس وقت ساری توجّہ ایران میں بدلتی ہوئی صورتِ حال پر مرکوز تھی اس لئے روسیوں کو عالمی سطح پر کسی مؤثّر اپوزیشن کی توقع نہیں تھی۔ بر ژجمی کامریڈ ببرک کارمل کو ماسکو سے کابل لا کر اقتدار سونپا گیا اور اس کے ساتھ ہی ایک لاکھ روسی افواج بھی افغانستان میں داخل ہو گئیں تاکہ اسے بھی "سوویٹوں کی یونین" میں شامل کیا جا سکے۔ افغانستان میں عرصہ طویل سے جاری سرد گرم مسابقاتی جنگ نے ایک بھرپور کھلی جنگ کی صورت اختیار کر لی تھی۔ بلی تھیلے سے باہر آ گئی تھی۔ ظاہر شاہی دور حکومت سے لے کر حفیظ اللہ امین کے دور حکومت تک اشتراکی نہ صرف معاشی ترقی کے پروگراموں کی آڑ میں اپنا نظریاتی کام کرتے رہے تھے بلکہ افغان معاشرے میں پائے جانے والے بنیادی عملی اسلامی افکار و نظریات کے خلاف بھی بھرپور کام کرتے رہے تھے۔ ظاہر شاہ کے ۴۰ سالہ دور حکومت (۱۹۳۳ء ۔ ۷۳) تک بننے والی مختلف حکومتوں کی کارکردگیوں کا جائزہ لیں تو ان میں ایک بات بڑی واضح دکھائی دیتی ہے کہ تمام انتظامی حکومتیں افغان معاشرے کی مسلّمہ روایات اور اسلامی تشخّص کے لئے کام کرنے والوں کے لئے قہرِ خداوندی بنی رہیں۔ کبھی یہ حکمران مغربی دنیا کی طرف زیادہ جھک جاتے اور انہیں ترقیاتی و تعمیراتی پروگراموں کے لئے امداد ملنی شروع ہو جاتی ' دوسری طرف روسی بھی امداد کی آڑ میں اپنے پر پرزے نکالتے رہے۔ سردار محمد داؤد کا وزارتِ عظمیٰ کا دور بڑا دلچسپ ہے۔ انہیں وزارت عظمیٰ میں لانے والے اشتراکی نوجوان تھے۔ ۱۹۵۳ء سے لے کر ۱۹۶۳ء تک

انہوں نے ملی جلی پالیسی اختیار کی۔ کبھی مغرب پرستی اور کبھی اشتراکیوں کے اشاروں پر پالیسی سازی۔ ان کا دور مجموعی طور پر تعمیر وترقی کا دور تھا۔ مواصلات کا نظام جدید بنیادوں پر استوار ہوا اور افغان آرمی کو بھی جدید خطوط پر استوار کیا گیا۔ مغربی دنیا نے عسکری تنظیم نو پر تو زیادہ توجہ نہ دی لیکن تعمیر وترقی کے دوسرے کاموں میں ہاتھ بٹاتی رہی۔ افغان حکمرانوں کے دل ودماغ میں تعمیر وترقی کا بھوت جس قدر زیادہ سوار ہوتا چلا گیا' غیر ملکی قرضوں کا بہاؤ بھی اسی قدر بڑھنا شروع ہو گیا۔ محمد داؤد نے مغرب اور مشرق دونوں اطراف سے امداد حاصل کرنے کی پالیسی اختیار کئے رکھی۔ اشتراکی یہ سمجھتے تھے کہ کیونکہ سردار محمد داؤد کو ان کی کاوشوں کی وجہ سے اقتدار ملا ہے اس لئے انہیں یعنی وزیراعظم سردار محمد داؤد خان کو صرف روس اور مشرقی یورپ کے ممالک کے ساتھ ہی تجارتی وسیاسی تعلقات قائم رکھنے چاہئیں' دوسری طرف مغربی ممالک افغان حکمرانوں کے اشتراکی روس اور مشرقی یورپی ممالک کے ساتھ تعلقات کو زیادہ پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۵۳ء میں اشتراکیوں کی کاوشوں سے بر سرِاقتدار آنے والے سردار محمد داؤد خان کو ۱۹۷۸ء میں ان کے خاندان کے تمام افراد سمیت قتل کرنے والوں کا تعلق بھی اشتراکیوں سے ہی تھا۔ ۱۹۶۳ء میں جب داخلی دباؤ کی وجہ سے سردار محمد داؤد خان کو مستعفی ہونا پڑا تھا' دس سال بعد جب ۱۹۷۳ء میں سردار محمد داؤد خان دوبارہ بر سرِاقتدار آئے تو انہوں نے افغانستان کو ایک نئی راہ پر چلانے کی کوشش کی۔ درحقیقت افغان حکمرانوں نے امریکی پالیسی کو سمجھنے میں غلطی کی جس کی وجہ سے انہیں مغربی ممالک کی فراخدلانہ امداد نہ مل سکی۔ دوسری جنگِ عظیم (۱۹۳۹ - ۴۵) کے دوران امریکہ اور سوویت یونین "قریبی ساتھی" تھے۔ انہوں نے ہٹلر اور مسولینی کی افواج کے علاوہ جنرل ٹوجو کی ظالمانہ عسکری چالوں کا اکٹھے ہی مل کر مقابلہ کیا تھا لیکن جنگِ عظیم کے خاتمے کے بعد کل کے "حلیف" آج کے "حریف" بن گئے۔ روسیوں نے افغانستان کی تعمیر وترقی میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی لینی شروع کر دی۔ جنگِ عظیم کے دوران افغانستان نے اپنا "غیر وابستہ تشخص" برقرار رکھا۔ افغان امور کے ماہر لوئی ڈیپری نے ۱۹۵۹ء میں تاشکر گھان میں تیل کی تلاش میں مصروف ایک روسی ٹیم سے گفتگو کی جس سے روسیوں کے طویل مدتی منصوبوں کا علم ہوتا ہے۔ افغانستان میں تیل تلاش کرنے والی اس ٹیم کے سربراہ نے لوئی ڈیپری سے کہا "ہم طویل عرصے سے یہاں مصروف ہیں۔ افغانوں کو ہماری مدد کی ضرورت ہے تم امریکی اپنے گھر کیوں نہیں چلے جاتے ہو۔ افغان ہمارے ہمسائے ہیں' تمہارے نہیں' اس لئے تمہیں ان کے بارے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔" یہ گفتگو نہ صرف روسیوں کی طویل منصوبہ بندی کی غماز ہے بلکہ اس سے ان کی امریکہ کے ساتھ

حریفانہ جذبات کی عکاسی بھی ہوتی ہے۔ دوسری طرف افغانستان کے بارے میں امریکہ کی "غیرواضح اور بدلتی" خارجہ پالیسی نے بھی افغانوں کو پریشان رکھا۔ داؤد دور میں امریکیوں نے افغانوں کی شجاع تاریخ کے برعکس پالیسی اختیار کیئے رکھی وہ افغانستان کو روسی حلقہ اثر میں سمجھ کر مخاصمانہ پالیسی اپناتے حالانکہ افغانوں نے اس وقت تک روسیوں پر اس قدر زیادہ انحصار کرنا شروع نہیں کیا تھا۔ لیکن امریکہ اور دیگر مغربی ممالک کی بے رُخی نے افغان حکمرانوں کو بڑی تیزی سے روسی حلقہ اثر میں دھکیلنا شروع کیا حتّٰی کہ افغان حکمران حقیقتاً روسی امداد پر انحصار کرنے لگے۔ ویسے افغانوں کی اقوامِ مغرب سے بہت زیادہ اچھی یادیں بھی وابستہ نہیں تھیں۔ برطانوی سامراجی نظام کے چنگل سے انہوں نے طویل جدوجہد کے بعد جان چھڑائی تھی۔ اب وہ کسی دوسری مغربی قوم کے چنگل میں نہیں پھنسنا چاہتے تھے۔ دوسری طرف انہیں اشتراکی روسیوں کا تجربہ بھی نہیں تھا یایوں کہئے اشتراکیوں کی تاریخ سے انہیں کماحقہ آگاہی نہیں تھی۔ افغانوں کو وسط ایشیا کی مسلم ریاستوں کے ساتھ زار شاہی اور اشتراکی حکمرانوں کے ظالمانہ معاملات کے بارے میں بہت زیادہ پتہ نہیں تھا۔ اس لئے وہ بتدریج روسی دوستی کے چنگل میں آتے چلے گئے۔ یہ دوستی حقیقتاً ریچھ کی دوستی ثابت ہوئی۔ سردار محمد داؤد خان نے جب افغانستان کے آزاد، خود مختار اور غیروابستہ تشخّص کو برقرار رکھنے کی کوشش کی تو اپریل ۱۹۷۸ء میں اسے پورے خاندان سمیت منظر سے ہٹادیا گیااور نور محمد ترکئی نے زمامِ اقتدار سنبھال لی اس طرح ایک نئی خون آشامی کا آغاز ہوا۔

اپریل ۱۹۷۸ء سے لے کر دسمبر ۱۹۷۹ء تک افغانستان میں بائیں بازو کے عناصر کو کھل کر اپنا آپ دکھانے کا موقع ملااور ان میں پائے جانے والے اختلافات کھل کر سامنے آ گئے۔ بائیں بازو کی پیپلز ڈیموکریٹک پارٹی آف افغانستان میں ۱۹۶۷ء سے ہی اختلافات رونما ہونے شروع ہو گئے۔ نور محمد ترکئی کی پارٹی میں ببرک کارمل نے اختلافات کا بیج بویااور اس طرح پارٹی پرچم اور خلق دھڑوں میں تقسیم ہو گئی۔ پارٹی کی دھڑے بندی بنیادی طور پر نور محمد ترکئی اور ببرک کارمل کے پارٹی قیادت پر اختلافات کی وجہ سے ہوئی۔ اس کے بعد سردار محمد داؤد کے حق میں ہونے یا مخالفت کرنے کے موضوع پر بھی گروہ بندی ہوئی۔ سب سے اہم بات "مسئلہ پشتونستان" تھا۔ ببرک کارمل پشتونستان کے مسئلے پر پاکستان کے خلاف زیادہ سخت رویّہ اختیار نہیں کرنا چاہتا تھاجبکہ دوسرا دھڑااس مسئلے پر پاکستان کے ساتھ "فوجی تصادم" کی حد تک جانے کو تیار تھا۔ ۲۷/اپریل ۱۹۷۸ء کے انقلاب کا اعلان کرتے ہوئے نور محمد ترکئی نے "عوامی جمہوریہ افغانستان" میں عوامی دور کے آغاز کی نوید سنائی اور اپنے کمیونسٹ ہونے کی تردید کی۔ نئی قیادت

نے اعلان کیا کہ ''مملکت کی آئندہ پالیسیاں افغان نیشنل ازم کی بنیاد پر تشکیل پائیں گی۔ اسلامی اقدار کی پاسداری کی جائے گی' خارجہ پالیسی میں عدم وابستگی برقرار رکھی جائے گی' سابقہ حکومتوں کی طرف سے کئے گئے غیر ملکی معاہدوں کی بھی پاسداری کی جائے گی'' پرچمی اور خلقی دھڑوں نے مل کر ۳۵ رکنی انقلابی کونسل تشکیل دی اور پھر اس کونسل نے نور محمد ترکئی کو چیئرمین کونسل اور وزیراعظم مملکت چنا۔ اس کے علاوہ پی ڈی پی اے کی جنرل سیکرٹری شپ بھی نور محمد ترکئی کے پاس ہی رہنے دی گئی۔ یہ عہدہ یکم جنوری ۱۹۶۵ء میں پارٹی کے قیام کے وقت سے ہی اس کے پاس تھا۔ نئی کونسل میں ترکئی اور ببرک کارمل ہی پرانے اور تجربہ کار سیاستدان تھے جو چالیس اور پچاس کی دھائیوں کے دوران آزادی کی تحریکوں کے ساتھ چلتے رہے تھے جبکہ باقی ممبران ایسے تھے جو ۷۳۔ ۱۹۶۳ء کے داؤد دور کے دوران سیاسی عمل سے الگ رہے تھے۔ ان میں سے چھ ایسے تھے جو اپنی سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے طویل جیل بھی کاٹ چکے تھے۔ ببرک کارمل (ڈپٹی پرائم منسٹر) ' حفیظ اللہ امین (ڈپٹی پرائم منسٹر اور وزیر خارجہ) ' عبدالحکیم (وزیر قانون اور اٹارنی جنرل) ' دستگیر پنج شیری (وزیر تعلیم) 'سلیمان لائق (ریڈیو اور ٹی وی کے وزیر) اور ڈاکٹر صالح محمد زیری (وزیر زراعت و زمین) اس کونسل میں شامل تھے۔ اس کابینہ میں گیارہ ایسے افراد بھی شامل تھے جو اپریل ۷۸ء کے انقلابِ ثور کے وقت بھی وزیر تھے۔ ان میں سے تین کا تعلق فوج سے 'دو کا کابل یونیورسٹی 'ایک کا ریڈیو افغانستان اور پانچ مختلف وزارتوں میں افسروں کے طور پر کام کرنے والوں سے تھا۔ ان میں سے تین بے روزگار صحافی و شاعر تھے۔ دو بے روزگار ڈاکٹر ' دو وکیل ' دو استاد اور ایک زمیندار بھی تھا۔ پرچمی اور خلقی دھڑے داؤد کے اوّلین دور سے ہی فوج میں کام کر رہے تھے۔ ببرک کارمل نے ۱۹۷۳ء میں انقلاب کے وقت داؤد کا ساتھ دیا تھا جس سے وقتی طور پر اس کی اہمیّت میں کمی واقع ہوئی تھی لیکن افغان فوج میں اس کی حمایت نے یہ کمی پوری کر دی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۷۸ء کے انقلابِ ثور میں فوج نے داؤد حکومت کے خاتمے میں اہم کردار ادا کیا اور نور محمد ترکئی کی انقلابی کونسل میں بھی مختلف الانواع افراد شامل تھے سیاسی وابستگیوں کے حوالے سے کابینہ کے ۲۱ افراد میں گیارہ خلقی تھے ان میں سے دو افراد ایسے بھی تھے جنہوں نے حال ہی میں اپنے خلقی ہونے کا اعلان کیا تھا۔ اس سے پہلے وہ ''آزاد'' تھے۔ ایک انجینئر اور تین فوجی ماہرین جو اس کابینہ میں شامل تھے حال ہی میں روس سے تربیّت حاصل کر کے آئے تھے۔ وہ اپنے آپ کو ''قوم پرست'' کہتے تھے کیونکہ وہ اپنے آپ کو ''ماسکو نواز'' کہلانا پسند نہیں کرتے تھے کابینہ میں شامل تمام افراد انگریزی بولتے تھے۔ صرف چار افراد روسی زبان بولنا جانتے تھے۔ کابینہ کے نو افراد پشتون تھے' آٹھ فارسی بولنے والے

تاجک، دوفارسی بولنے والے ہزارہ اور دو ترکی بولنے والے ازبک بھی اس کابینہ میں شامل تھے۔ ان افراد کی خصوصیت یہ تھی کہ اپنی زبانوں کے علاوہ یہ سب افراد فارسی اور پشتو بھی بول لیتے تھے جو افغانستان کی بڑی زبانیں ہیں۔ نور محمد ترکئی نے "وسیع البنیاد" حکومت قائم کرنے کی کوشش کی۔ کابینہ میں مختلف لسانی گروہوں اور سیاسی ہمدردیاں رکھنے والے افراد کو شامل کر کے ترکئی نے اپنی انقلابی حکومت کو استحکام دینے کی کوشش کی، لیکن نئے حکمرانوں کو زیادہ دیر تک اقتدار کے مزے لوٹنے کا موقع نہ مل سکا۔ اس دور تک اسلامی تحریکِ مزاحمت کافی حد تک مؤثر ہو چکی تھی۔ چھ ہزار سے زائد روسی مشیر کابل میں موجود تھے تاکہ نور محمد ترکئی کو تحریکِ مزاحمت کچلنے کے بارے میں مشورے دے سکیں۔ انہی مشیروں میں کے جی بی کے ماہرین بھی شامل تھے۔ فروری ۱۹۷۹ء میں کابل میں امریکی سفیر اڈولف ڈب کو اغوا کر لیا گیا۔ کچھ دنوں بعد اس کی لاش ملی۔ نور محمد ترکئی حکومت کے بقول اسے مسلم بنیاد پرستوں نے اغوا کیا تھا۔ امریکی صدر جمی کارٹر نے کابل بھجوائی جانے والی امداد فوری طور پر بند کر دی۔ امریکی سفیر کے قتل کے بعد افغانستان کے نائب وزیرِاعظم اور وزیرِ خارجہ حفیظ اللہ امین نے بیان دیتے ہوئے کہا۔ "سوویت یونین افغان انقلاب کی حفاظت کرے گا۔" حفیظ اللہ امین کے بارے میں عام خیال تھا کہ وہ نور محمد ترکئی سے زیادہ قد آور اور مؤثر شخصیّت کا حامل ہے۔ سردار محمد داؤد کے قتل کا منصوبہ اسی کی نگرانی میں پایۂ تکمیل کو پہنچا تھا۔ حفیظ اللہ امین کے کہنے پر ہی نور محمد ترکئی نے ببرک کارمل اور دیگر پرچمی لیڈروں کو سفارتکار بنا کر مختلف ممالک میں بھیج دیا تھا۔ موجودہ صورتحال میں ان لوگوں کو جب واپس بلانے کی منصوبہ بندی کی گئی تو انہوں نے واپسی سے انکار کر دیا تھا۔ مارچ میں افغان حکومت نے ایران سرکار پر الزام لگایا کہ وہ ہرات میں اپنے فوجی بھجوا کر بغاوت پھیلا رہی ہے۔ ایسا ہی الزام پاکستان پر بھی لگایا گیا کہ وہ صوبہ کنڑ میں "باغیوں" کی مدد کر رہا ہے۔ کابل انتظامیہ کے بڑھتے ہوئے زمینی اور ہوائی حملوں کے باوجود گوریلا سرگرمیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔ اسی دوران افغان فوجیوں نے بھگوڑا ہو کر باغی گوریلوں سے جاملنا شروع کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ترکئی حکومت زیادہ دیر تک نہ چل سکی اور اسے ۱۴ر ستمبر کو ہلاک کر کے حفیظ اللہ امین کو کابل کے تخت پر بٹھا دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی سوویت فوجی مشیروں کے علاوہ بھاری اسلحہ بھی افغانستان پہنچنا شروع ہو گیا۔ حفیظ اللہ امین نے سوویت یونین کی طرف سے افغان معاملات کو اپنی مرضی کے مطابق سنبھالا دینے کی آخری کوشش تھی جو دسمبر ۱۹۷۹ء میں مکمل طور پر ناکام ہو گئی کیونکہ کمیونسٹوں کے داخلی انتشار کے ساتھ ساتھ "تحریکِ مزاحمت" بھی دن بدن جوان ہوتی جا رہی تھی۔ مضافاتی افغانستان دن کے وقت گوریلوں کے قبضے میں رہتا جبکہ رات کے وقت شہری مراکز

بھی فوج کی کڑی نگرانی میں ہی پُرامن رہتے وگرنہ فوج کی ذراسی غفلت ''گوریلوں'' کو گل کھلانے کا موقع فراہم کر دیتی تھی۔ بڑھتی ہوئی گوریلا سرگرمیاں اور فوج کا زیادہ سے زیادہ تعداد میں بھگوڑا ہونا اس بات کی غمازی کر رہا تھا کہ کمیونسٹ حکومت کے خلاف نفرت پائی جاتی ہے۔ حفیظ اللہ امین کی بظاہر موجودگی نے بھی اشتراکیوں کے خلاف عمومی نفرت کو کم نہیں کیا تھا۔ اس لئے اس حکومت کو ختم کر کے ببرک کارمل کو افغانستان کا نیا حکمران مقرر کر دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی اشتراکی لشکر افغانستان میں داخل ہونا شروع ہو گیا۔ بادشاہی دور ختم کرنے والے عوامی دور کے بانی (داؤد' نور محمد ترکئی' حفیظ اللہ) بھی منظر سے ہٹائے جا چکے تھے۔ اس کے ساتھ ہی اشتراکی فوج کے سائے میں ایک ایسا عوامی دور شروع ہوا جس میں رواں صدی کی سب سے بڑی خونی داستان لکھی گئی' جس میں ایک طرف لاکھوں افراد کی ہلاکت (شہادت) و معذوری کے ساتھ ساتھ کسی ایک قوم کی بہت بڑی ہجرت بھی ہے اور دوسری طرف دنیا کی عظیم عسکری طاقت کا خاتمہ بھی شامل ہے۔

امیر عبدالرحمٰن اوّل کے دور سے لے کر ظاہر شاہی دور کے خاتمے اور پھر سردار داؤد کے مسندِ اقتدار پر بیٹھنے تک کی داستان کا مطالعہ کرنے سے ایک بات بڑی واضح ہو کر سامنے آتی ہے اور وہ افغانوں کا قبائلی کردار ہے۔ عروج و زوال کی اس داستانِ طویل میں آنے والے نشیب و فراز کے پس پردہ افغانوں کی جنگجویانہ قبائلی فطرت بار بار اپنا رنگ دکھاتی ہے۔ اس کہانی میں جہاں ایک طرف غیر ملکی سامراجیت کے خلاف افغانوں کا مشترکہ لائحہ عمل سامنے آتا ہے جس کی وجہ سے برطانوی افواج کو ذلیل و خوار ہو کر افغانستان سے نکلنا پڑا تو دوسری طرف داخلی قبائلی چپقلشیں بھی ہیں جنہوں نے افغان پایہ تخت کو کبھی بھی مضبوط نہیں ہونے دیا۔ ظاہر شاہی دور کے خاتمے کے بعد نیم اشتراکی دور (داؤد سے لے کر ببرک کارمل تک) کے زمانہ عروج تک یہی اندازِ فکر و عمل پی ڈی پی اے کے عناصر میں بھی بڑا واضح رہا۔ کمیونسٹ ہونے کے باوجود افغانوں کا قبائلی اندازِ فکر و عمل بار بار اپنا اظہار کرتا رہا اور اس طرح حکومتوں کا الٹ پھیر ہوتا رہا۔ حتیٰ کہ حالات اس قدر دگرگوں ہو گئے کہ ایک لاکھ اشتراکی افواج کو آگے بڑھ کر براہِ راست ''قیادت'' کا فریضہ سرانجام دینے کے لئے یہاں آنا پڑا۔ کیونکہ بقول گلبدین حکمت یار اگر روسی فوج درمیان میں نہ آتیں تو حفیظ اللہ امین کے خاتمے کے ساتھ ہی ''مجاہدین'' کابل پر قابض ہو چکے ہوتے۔'' روسیوں نے اپنے طویل مدتی منصوبوں اور سرمایہ کاری کو خاک میں ملتا دیکھ کر جس راست اقدام کا فیصلہ کیا تھا' حالات اور واقعات اس کے بالکل موافق تھے۔ سوویت یونین کی بوڑھی قیادت (برژنیف) اس سے پہلے بھی پولینڈ میں جوان فیصلے کر کے خاصی معروف ہو چکی

تھی۔ جوان فیصلوں کی گرمی بوڑھی قیادت کے خون میں ابھی موجزن تھی اس لئے افغانستان میں فوجیں داخل کرنے کا جوان فیصلہ کر لیا گیا۔ پوری دنیا حیران رہ گئی تھی۔ رواں صدی کے بالکل ابتدائی دور میں روسی حکمرانوں نے برطانوی سامراجیوں سے مل کر دریائے آمو کو فطری سرحد مان لینے کا جو فیصلہ کیا تھا، ۱۹۷۹ء میں اشتراکی حکمرانوں نے اسے ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ دریائے آمو کو سرحد ماننے سے افغانستان ایک درمیانی مملکت یا بفر سٹیٹ کے طور پر دنیا کے نقشے پر ابھرا تھا۔ روسی سلطنت کی سرحدیں، برطانوی ہند کی سرحدوں سے دور رکھی گئی تھیں۔ افغانستان کی تخلیق نے دو ''عفریتوں'' کو ایک دوسرے سے دور کر دیا تھا کیونکہ اسی میں دونوں کی بھلائی تھی۔ لیکن دسمبر ۱۹۷۹ء میں جب اشتراکیوں نے دریائے آمو پار کر کے کابل پر قبضہ کر لیا تو افغانستان کی طے شدہ حیثیت میں یکلخت تبدیلی آ گئی تھی۔ اس تبدیلی نے نہ صرف علاقے کی جغرافیائی، سیاسی صورت حال کو بدل دیا بلکہ اب برطانوی سامراج کی بجائے، امریکی مفادات پر زد پڑنے کا امکان پیدا ہو گیا تھا۔ اس لئے عالمی سطح پر بھی ذرا سا ارتعاش پیدا ہوا۔ امریکی صدر جمی کارٹر ایران میں الجھے ہوئے تھے۔ ویسے بھی سی آئی اے اور پینٹاگون نے بھی انہیں ''افغانستان'' کو بھولی بسری داستان سمجھنے کا مشورہ دیا تھا، اس لئے روسی افواج کے افغانستان میں داخلے پر سفارتی انداز میں ردِ عمل ظاہر کرنے کے علاوہ کسی مؤثر جوابی کارروائی کے لئے کچھ نہیں کیا گیا۔ لیکن آنے والے تین سالوں میں ''تحریکِ مزاحمت'' کی ''اعصابی مضبوطی'' اور ''عسکری اٹھان'' نے عالمی منصوبہ سازوں کو دوبارہ سوچنے پر مجبور کیا۔ پھر اسی سوچ نے آگے بڑھتے ہوئے صدر ریگن کے دورِ حکومت میں پاکستان کو ۳ء۲ بلین ڈالر کی فوجی و اقتصادی امداد کی شکل اختیار کی۔



جلال آباد میں تباہی کا ایک منظر



ڈاکٹر عبداللہ عزام شہید ...... مولانا جلال الدین کے ساتھ



دشمن کے ہوائی جہازوں کے منتظر

کریملن سے کابل تک

روسی توسیع پسندی کی داستان

پندرھویں صدی کے آغاز پر روس ۱۴۰ مربع میل پر پھیلا ہوا ایک " گاؤں " تھا اور ماسکو اس کا مرکز ' جہاں یوری ڈولگور کی نے ایک قلعہ تعمیر کیا اور اسے اپنی مہمات کا مرکز بنالیا۔ پھر یہ ماسکووی ریاست آہستہ آہستہ پھیلنی شروع ہو گئی۔ اسے " تاریخی حادثہ " کہہ لیجئے یا " قدرت کی منصوبہ بندی " کہ " ماسکووی ریاست " کے روسی حکمرانوں نے اولاً جس زمین پر قبضہ کر کے اسے اپنے ساتھ شامل کیا وہ بھی مسلمانوں کی تھی ' اور پانچ صدی بعد سوویت روس نے جس آخری ملک کی سرزمین پر یلغار کی وہ بھی مسلمانوں کی ہی تھی۔ ۱۴۸۱ء میں مسلمانوں کی سب سے بڑی ریاست سائبیریا کو روس کا حصّہ بنا دیا گیا اور پھر ۱۹۸۰ء میں (دسمبر ۱۹۷۹ء) اشتراکی افواج نے افغانستان کو روند ڈالا۔ ۱۴۸۱ء تا ۱۹۸۰ء پانچ صدیوں پر پھیلی ہوئی " توسیع پسندی " اور " استعماریّت " کی یہ داستان نہ صرف مسلمانوں کی تاریخ کا ایک عظیم باب ہے بلکہ تاریخِ عالم کا بھی ایک ایسا سبق ہے جسے ہمیں صرف پڑھنا ہی نہیں چاہئے بلکہ سمجھ کر مستقبل کی منصوبہ بندی کرنی چاہئے لیکن۔ افسوس یہ ہے کہ ہم تاریخی حقائق پر نظریں جمانے کی بجائے جذبات کے بے لگام گھوڑے پر سوار ہو کر " لفظوں کے فاتح " بننا پسند کرتے ہیں ' حالانکہ دنیا کے سٹیج پر جہاں اقوام شطرنج کے مہروں کی طرح چالیں چل رہی ہوں " الفاظ و جذبات " کی نہیں " اعمال و کامیابیوں " کی پیمائش کے ذریعے ہی کسی بھی قوم کے قد کاٹھ کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

مسلمانوں کی تاریخ شاندار عسکری کامیابیوں سے مزین ہے۔ اس علاقے کی پانچ سو سالہ تاریخ بھی اس بات کی گواہ ہے کہ مسلمانوں نے ماسکووی حکمرانوں کے توسیعی منصوبوں سے لے کر اشتراکی حکمرانوں کے قہر وجبر تک ہر لمحہ اور ہر جگہ مزاحمت کی۔ مقابلہ کیا۔ اس مزاحمت کی ابتداء ۱۴۸۰ء میں ہوئی جب ایک مسلمان سالار خان احمد ماسکووی ریاست کی سرحد تک اپنے شہ سواروں کے ساتھ آن پہنچا۔ یہ وہ دور ہے جب ماسکووی حکمرانوں نے اپنے توسیعی منصوبوں پر عمل در آمد شروع کیا ہی تھا۔ خان احمد اسی توسیعی پس منظر کے حوالے سے یہاں آیا تھا کہ مسلم ریاستوں کی طرف بڑھتے ہوئے استعماری قدموں کو روک سکے لیکن دریائے اُگرا (UGRA RIVER) کے کنارے اپنے ہزاروں جانثاروں کے ساتھ آکر ٹھہر گیا۔ کافی دیر تک حالات کا جائزہ لیتا رہا لیکن اس نے دریا کے اس پار زار آئیوان سوئم کی افواج پر حملہ کرنے سے گریز کیا۔ یہ ایک تاریخی لمحہ ہے جہاں خان احمد کے ایک غلط فیصلے نے تاریخی دھارے کو توسیع پسندی کے ایک ایسے سیلاب میں بدل دیا جس کی لہریں پانچویں صدی کے بعد (۱۹۸۰ء میں) دریائے آمو کو پار کر کے ہندوکش کی وادیوں تک آن پہنچیں۔ اگر خان احمد اس وقت آگے بڑھ کر ماسکووی حکمران کے بڑھتے ہوئے قدم روک دیتا تو شاید ماسکو "ایک عظیم یونین" نہ بن سکتا۔ اس کے اگلے سال ۱۴۸۱ء میں مسلمانوں کی سب سے بڑی ریاست سائبیریا کو "ماسکووی ریاست" کا حصہ بنا دیا گیا در اصل ۱۳۸۰ء میں ہی روسیوں نے ایک اور فتح حاصل کر لی تھی جس کی وجہ سے ان کے حوصلے خاصے بلند ہو چکے تھے اور وہ خان مامائی کے مقابلے میں روسیوں کی عسکری فتح ہے۔ ان دونوں فتوحات سے حوصلہ پا کر روسیوں نے سائبیریا پر قبضہ کر لیا۔ خان مامائی پر غلبہ پانے کی یاد کی صورت میں کلشکی کے مقام پر چرچ آف آل سینٹس (تمام روحانی اکابر کا گرجا) تعمیر کیا گیا جو آج بھی موجود ہے۔ اس کے علاوہ سائبیریا کو فتح کرنے کی خوشی میں بھی ایک گرجا گھر تعمیر کیا گیا۔ اس کی تعمیر ۱۴۸۵ء اور ۱۴۹۵ء کی درمیانی مدت میں مکمل ہوئی۔ یہ ماسکووی روس کا اہم ترین گرجا تھا۔ اس روسی چرچ نے مسلم علاقوں کی طرف روسی حکمرانوں کی پیش قدمی میں صلیبی جنگوں کا سا جوش وخروش پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اسلام دشمنی اور مسلم کشی کے جذبات کو مہمیز دینے میں مشرقی قدیم چرچ - EASTERN ORTHODOX CHURCH کا کردار انتہائی اہم ہے۔ در اصل اس کی تاریخی جڑیں بھی ہمیشہ موجود رہی ہیں۔

پہلی عظیم رومی سلطنت کا خاتمہ خلفائے راشدین کے دور میں ہوا۔ یہ عیسائیوں کی ایسی عظیم الشان سلطنت تھی جس میں "ریاست وکلیسا" نے اتحاد ویگانگت قائم کر کے ایک طرف عیسائی عوام کو دبا رکھا تھا ذرائع پیداوار پر قبضہ کر کے ریاست اپنے لئے دولت پیدا کرتی تھی۔ اہل

کلیسا جنت و دوزخ کے پروانے تقسیم کر کے دولت حاصل کرتے تھے۔ اہلِ ریاست نے، اہلِ کلیسا کو بڑی بڑی جاگیریں رشوت میں دے رکھی تھیں۔ بدلے میں اہلِ کلیسا "بادشاہ" کو خدا کا اوتار قرار دے کر اور سادہ لوح عوام کو بلاچوں وچرا اطاعت کا درس دے کر "بادشاہ" کی بالواسطہ حمایت کرتے تھے۔ مسلمانوں نے قیصرِ روم کو شکست دے کر استعماری عیسائی نظام کے تار و پور بکھیر دیئے۔ اس کے بعد کلیسا کی طاقت "بازنطینی" سلطنت میں مجتمع ہونی شروع ہو گئی۔ بازنطین کا شہنشاہ، قیصرِ روم کی طرح سالارِ اعلیٰ اور واحد قانون ساز اور منصفِ اعلیٰ ہونے کے علاوہ عالمی حکمرانی کے بلند و بالا منصب پر فائز سمجھا جاتا تھا۔ مختصراً وہ ریاستی و کلیسائی اقتدارِ اعلیٰ کا حسین امتزاج پیش کرتا تھا۔ شہنشاہِ بازنطین نے کلیسا کی حفاظت، عیسائی ارتداد کا قلع قمع اور کلیسائے قدیم کے مذہب کو پوری دنیا تک پہنچانے کے عظیم کام بھی اپنے ذمّے لے رکھے تھے۔ انہی تصوّراتی ذمّہ داریوں کے علی الرغم یہ سمجھا تھا کہ خدا نے اسے پورے کُرّۂ ارض پر حکمرانی اور غلبے کی اجازت دے رکھی ہے۔ رومی سلطنت کے خاتمے کے بعد اہلِ کلیسا نے بازنطینی شہنشاہ کی صُورت میں ایک ایسا مرکز دوبارہ پالیا تھا جس کے ارد گرد رہ کر انہیں نہ صرف "عیسائیت کے عالمی پیغام" کو دنیا کے کونے کونے میں پہنچانے کے مواقع مل سکتے تھے، بلکہ ریاستی وسائل کو دنیوی مقاصد کے حصول کے لئے استعمال کرنے کے امکانات بھی موجود تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اہلِ کلیسا نے شہنشاہِ بازنطین کی نصرت و حمایت کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

کلیسا کی مدد سے شہنشاہ کی دنیوی و مادی طاقت میں اور بھی اضافہ ہوا، کیونکہ اب بادشاہ کی طاقت میں تقدس اور ہمہ جہت ہونے کے عناصر بھی شامل ہو گئے تھے۔ اس کی تاجپوشی کے موقع پر اسے مقدس تیل لگانے کے بعد یہ اعلان کیا جاتا کہ "وہ خدا میں سے ہے انسانوں میں سے نہیں، وہ کائنات کا سب سے بڑا مالک ہے، اس لئے اس کی مکمل اطاعت کرنا ہر ایک کا فرض ہے" بازنطینی شہنشاہ کے اس خود ساختہ اور خود اختیار کردہ فرائض و اختیارات نے بالکل ویسی ہی صُورت اختیار کر لی جو قیصرِ روم کے زمانے میں تھی۔ "ریاست و کلیسا" کے اس گٹھ جوڑ نے غریب و مجبور عوام پر عرصۂ حیات تنگ کرنا شروع کر دیا۔ تاریخ نے ایک بار پھر اپنے آپ کو دہرایا۔ ترکانِ عثمان نے بازنطینی سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ کلیسائے روم کے بعد کلیسائے بازنطین ایک بار پھر "ریاستی پشت پناہی" سے محروم ہو گیا تھا۔ پہلے بھی مسلمانوں نے ایسا کیا تھا اور اب بھی مسلمانوں کے ہاتھوں سے ہی ایسا ہوا تھا۔ اس کے بعد کلیسائی قوّتوں نے ماسکووی حکمرانوں کے زیرِ سایہ جمع ہونا شروع کر دیا۔ پھر اسی قوّت کے زیرِ اثر مسلم علاقوں پر لشکر کشی شروع ہوئی جو سوویت یونین کے قیام پر منتج ہوئی۔

ماسکووی ریاست کے قیام سے پہلے یہ علاقے (جو بعد میں زار شاہی اور پھر اشتراکی روس میں شامل ہوئے) چھوٹے چھوٹے شہزاد گان اور جنگی لیڈروں کی عملداری میں تھے۔ یہ ریاستی وعلاقائی لیڈر طویل میدانی علاقوں کی شہسواری کی روایات پر کاربند تھے۔ ان کے نزدیک صنعت وحرفت اور زراعت وتجارت سے کہیں زیادہ اہم کام جنگ بازی اور مہم جُوئی تھا۔ یہ لوگ جن علاقوں پر چڑھ دوڑتے وہاں کے لوگوں کو محکوم بنا کر اپنے لئے نہ صرف ضروریاتِ زندگی بلکہ اشیائے تعیش حاصل کر کے اپنی زندگیاں بسر کرتے۔ محکوموں کے لئے سب سے اہم کام صنعت وحرفت اور تیار مال کی فراہمی ہوتا تھا۔ یہ صورتحال نہ صرف مفتوح علاقوں میں حاکموں کے خلاف نفرت کے جذبات پیدا کرتی بلکہ جب کبھی یہ دَبے ہوئے جذبات اظہار کی راہ پاتے تو مقامی طور پر یورشیں اور بغاوتیں جنم لیتیں۔ اسی طرح قوت کے عدمِ ارتکاز کے سبب کبھی نہ ختم ہونے والی داخلی کشمکش اور جنگ وجَدَل عام زندگی کا چلن بن گیا۔ جب نویں صدی میں ان جنگجُو شہزادوں اور سالاروں کا واسطہ بازنطینی ریاست سے پڑا تو صورتحال نے ایک نیا رخ اختیار کیا۔ بازنطینی حکمران اسی علاقے میں دلچسپی رکھتے تھے اس لئے انہوں نے یہاں مقابلہ کرنے کی بجائے مفاہمت کی راہیں تلاش کرنی شروع کیں۔ بازنطین کے ریاستی ڈھانچے میں کلیسا کی حیثیت صرف ایک مذہبی ادارے کی سی نہیں تھی بلکہ اس کی سیاسی اہمیت بھی اپنی جگہ مسلم تھی۔ کلیسا ریاست کے ایک اہم رکن کے طور پر کام کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بازنطینیوں نے روسی عوام کو عیسائی بنانے کے جس منصوبے پر عمل کرنا شروع کیا اس کی اہمیت مذہبی سے زیادہ سیاسی تھی۔ بازنطینی روایات اور عبادات کے ساتھ ساتھ مقامی زبان کو چرچ میں مذہبی روایات کی ادائیگی کے لئے استعمال کیا جانے لگا تاکہ مقامی لوگوں کو زیادہ سے زیادہ قریب کیا جا سکے۔ بازنطینی کلیسا کے ساتھ "ریاست اور کلیسا" کی وحدت اور بادشاہ کے خدائی اختیارات کے علاوہ ایک عالمی عیسائی ریاست کے قیام کے تصوّرات ازخود شامل ہوتے چلے گئے۔ بازنطینی ریاست کے روس سے واسطہ پڑنے کے دوررس نتائج نکلے، کیونکہ مشرقی کلیسا روسی معاشرے کے سیاسی وسماجی نظام پر اثرانداز ہوا۔ مشرقی کلیسا نے روس کو ایک عالمی طاقت کے طور پر ابھرنے کے لئے ایک اخلاقی ونظریاتی بنیاد فراہم کی لیکن اس کے ساتھ ساتھ روسی ریاست کی بنیاد میں موجود ان عناصر کو بھی تقویّت بخشی جو اس کے عدمِ استحکام کا بڑا سبب تھے۔ اوّل الذکر بنیادوں پر ماسکووی ریاست عظیم زار شاہی سلطنت میں تبدیل ہوئی جبکہ آخر الذکر وجوہ نے بالشویک انقلاب کی بنیادیں فراہم کیں۔ اس طرح ایک چھوٹی سی ماسکووی ریاست زار شاہی سے ہوتے ہوئے عظیم اشتراکی سلطنت میں تبدیل ہوئی، جس نے رواں صدی کے سیاسی ومعاشرتی منظر پر ان مٹ

نقوش چھوڑے۔

ماسکووی حکمرانوں سے لے کر زار شاہی بادشاہوں اور پھر اشتراکی روسیوں کے توسیعی منصوبوں کے راستے میں اگر کسی نے مزاحمت کی تو وہ مسلمان تھے۔ کیونکہ اسلام نے ہی انہیں آزادی اور حریّت کا سبق دیا تھا۔ حضرت عمر فاروقؓ کے دورِ خلافت میں جب روسی سرزمین کی طرف بھی مہمات روانہ کی جارہی تھیں تو مسلمانوں کو انہی علاقوں میں مشکلات پیش آئیں۔ روسی شدید جغرافیائی حالات کی وجہ سے قوی و سخت کوش تھے' اس لئے آسانی سے ہار مان لینا ان کے لئے ممکن نہیں تھا۔ دنیا میں شاید ہی کسی اور جگہ اہلِ اسلام کو اتنی شدید اور طویل مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا ہو جتنی اس علاقے کے لوگوں نے پیش کی۔ اس سے ایک طرف مقامی آبادی کی جنگی مہارت اور شجاعت کا اندازہ لگایا جاسکتا' تو دوسری طرف مسلمانوں کے عزمِ محکم کا بھی اندازہ لگانا کوئی مشکل بات نہیں' جس کے تحت وہ عرب کے گرم ریگستانوں سے اٹھ کر روس کے سرد جہنم تک آئے اور یہاں طویل مزاحمت کے باوجود پیغامِ حق کی ایسی شمع روشن کی جو سینکڑوں سال تک بجھانے کی کوششوں کے باوجود ابھی تک روشن ہے اور سوویت یونین کے خاتمے کے بعد ایک شعلہ جوالہ بننے کے لئے تیار ہے۔ مسلمانوں نے آج سے بارہ سو سال قبل اتنی شجاع اقوام کو زیرِ نگیں کر لیا تھا۔ پھر یہی لوگ اسلام کا بازوئے شمشیر زن بنے' اور آنے والی کئی صدیوں تک یورپی عیسائی ان کے نام سے کانپتے رہے۔ انہی لوگوں کے ہاتھوں قسطنطنیہ فتح ہوا۔ اسی قسطنطنیہ کی فتح کے لئے پہلے پہل کئی اسلامی لشکروں نے حملے کئے تھے' لیکن فتح الٰہی ترکانِ عثمان کے حصّے میں آئی جنہوں نے تیغ و سنان کے محیرالعقول کارناموں سے تاریخ کے دھارے کو موڑا۔ اگر اپنوں کی سازشیں کام نہ آتیں تو یہی ترکمان آج بھی عالمی منظر پر چھائے ہوتے۔ استنبول کے کُتب خانوں میں موجود چالیس لاکھ مخطوطات آج بھی ان ترکمانوں کی علمی دوستی کا ثبوت دے رہے ہیں' جن کی صرف فہرستوں کی تیاری ہی ایک بہت بڑا علمی کام ہے۔

روسیوں کی نفسیات میں جہاں یورپی مزاج شامل ہے جس کے زیرِ اثر وہ مہذب اقوام کا سا مظاہرہ بھی کرتے ہیں' وہاں ان میں قبائلی اور جنگلی مزاج بھی پایا جاتا ہے جس کے تحت وہ جبر و استبداد اور وحشت و بربریّت کا مظاہرہ بھی کرتے ہیں۔ تائیگا کے قبائل اور منگول تاتاروں کا رویّہ اسی مزاج کا عکاس ہے۔ یہی مزاج شہزادگانِ ماسکو میں پایا جاتا تھا' اور اسی مزاج کے تحت زار شاہی نے اپنی سلطنت کو نہ صرف توسیع دی بلکہ رعایا پر ظلم و ستم روا رکھا۔ پھر یہی مزاج اشتراکی روس کے اہلکاروں پر غالب رہا جس کے زیرِ اثر انہوں نے افغانستان کے پندرہ لاکھ بے گناہ شہریوں بشمول بوڑھوں' عورتوں اور بچوں کو ہلاک کیا۔

روسی مہم جوئی کو سمجھنے کے لئے روس کی طویل "جغرافیائی تاریخ" (-GEO GRAPHICAL HISTORY) کا مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ دنیا میں بسنے والی مختلف اقوام کی تاریخ ان کے جغرافیائی حالات کو ترتیب دیتی ہے۔ یا یوں کہئے کہ جغرافیہ ہمیشہ تاریخ کے تحت قائم ہوتا ہے۔ لیکن روسی اس کُلیے سے مبرّا ہیں' کیونکہ روسی تاریخ کا تعلق اس کے جغرافیے سے ہے۔ جغرافیائی حالات نے روسی تاریخ ترتیب دی ہے۔

پندرھویں صدی کے آغاز میں ۱۴۰۰ مربع میل پر قائم ماسکووی ریاست نے بیسویں صدی کے اختتام تک تقریباً ۸۰ لاکھ مربع میل کے علاقے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ اسی چھوٹی سی ریاست کی توسیعی شکل سوویت یونین تھی' جس کا رقبہ پاکستان سے ۲۸ گنا اور امریکہ سے دگنا تھا' مشرق سے مغرب تک اوقات کے گیارہ علاقوں میں منقسم اس خطہ ارض میں پائے جانے والے مسائل کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ جب ماسکو میں لوگ سونے کی تیاری کر رہے ہوتے ہیں تو ولاڈی ووسٹک میں لوگ صبح کا ناشتہ کرنے میں مصروف ہوتے ہیں۔ شمالاً جنوباً سوویت یونین ۳۱ ہزار میل تک پھیلا ہوا تھا۔ ایشیا کا ۴۰ فیصد رقبہ سوویت یونین میں شامل تھا۔ اشتراکی روس کا تین چوتھائی حصہ سمندر سے ۲۵۰ میل سے زیادہ فاصلے پر واقع تھا۔ اس کی سرحدوں کی کل لمبائی ۳۷ ہزار میل تھی جبکہ اس میں سے ۲۷ ہزار میل سمندری علاقے پر مشتمل تھا۔ دنیا میں شاید ہی کوئی ایسی مملکت ہو جس کی اتنی طویل سرحدیں ہوں اور خاص طور پر اتنا طویل بحری بارڈر ہو۔ لیکن قطرت کی ستم ظریفی دیکھئے' سوویت روس کو بحری نقل و حمل کے لئے اپنے قیام سے لے کر اختتام تک دوسروں کی طرف ہی دیکھنا پڑا کیونکہ طویل عرصہ تک یخ بستہ رہنے کی وجہ سے روس کے سمندروں میں آزادانہ نقل و حمل ممکن نہیں تھی۔ اس لئے زار شاہی روسی حکمران ہوں یا اشتراکی توسیع پسند' ان کی خارجہ پالیسی کا ایک اہم ترین نکتہ اپنے یخ ساحلوں سے دور گرم پانیوں والے ساحلوں تک رسائی کی سہولیات کا حصول رہا۔ روسی ہمیشہ اپنے سیاسی جغرافیے کو اس انداز میں ترتیب دیتے رہے جس سے انہیں گرم پانیوں تک رسائی ہو سکے۔ ۱۹۸۰ء میں افغانستان پر لشکر کشی بھی اسی خواہش کو عملی شکل دینے کی ایک ایسی مربوط اور منظم کوشش تھی جو بالآخر سوویت یونین کو ہی لے ڈوبی۔

سوویت یونین میں شامل وسیع و عریض علاقوں کی تاریخ و جغرافیہ ابھی تک اتنا معلوم نہیں ہے۔ شمالی مشرقی سائبیریا میں واقع پہاڑوں کے نقشوں کی تیاری کا کام بیسویں صدی کے دوسرے عشرے میں شروع ہوا اور دوسری جنگِ عظیم کے بعد جا کر مکمل ہوا۔ جنوبی سائبیریا کا بیشتر حصہ اونچے نیچے پہاڑی سلسلوں پر مشتمل ہے۔ بے کال جھیل جو دنیا کی سب سے گہری جھیل ہے اسی

خطے میں واقع ہے' جو نقشے میں ایک لکیر کی طرح نظر آتی ہے۔ روسی جغرافیے میں پہاڑوں کے بعد دریاؤں کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ کچھ دریا جنوبی پہاڑوں سے نکلتے ہیں' پھر میدانوں سے مزید ندی نالے ان کے ساتھ مل جاتے ہیں۔ ان دریاؤں میں کشتی رانی ہوتی ہے جو مواصلات کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ موسم سرما میں تو یہ دریا منجمد رہتے ہیں لیکن بہار کے آتے ہی ان کا پانی دور دور تک پھیل جاتا ہے اور عموماً سیلابی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ بحر آرکٹک کی طرف جانے والے دریا خطرے کا باعث بنتے ہیں کیونکہ جنوب میں گرمی پڑتی ہے اور وہ ان علاقوں میں پگھل جاتے ہیں' جبکہ شمال میں ابھی تک انجماد کی کیفیت ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جمی ہوئی برف ایک بند کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ پیچھے سے آنے والا پانی جب زیادہ ہوتا ہے تو برفانی بند کو توڑتا ہوا سیلاب کی صورت میں کناورں سے بہہ نکلتا ہے اور سیلاب آجاتا ہے۔ سارے روس میں موسم کی شدّت ایسی ہی ہے۔ مختصر بہار کے بعد موسم جلد ہی سرما میں تبدیل ہو جاتا ہے اور پھر شدید سردی روس کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ شمال مشرقی سائبیریا میں دنیا کی شدید ترین سردی پڑتی ہے۔ روس کا ۴۰ فیصد علاقہ مستقل طور پر یخ بستہ رہتا ہے۔ اس علاقے میں کہیں اگر حدّت بڑھ جائے تو خاصے بڑے علاقے میں توڑ پھوڑ کا ساسماں پیدا ہو جاتا ہے۔ برف کی سطح پر دراڑیں پڑنے لگ جاتی ہیں اور نیچے سے پانی نکلنا شروع ہو جاتا ہے۔ ہلکی خنک سی صبح جلد ہی اس قدر گرم ہو جاتی ہے کہ دوپہر کا احساس ہونے لگتا ہے۔ پھر کبھی کبھی نیلے آسمان پر اچانک گہرے بادل بھی چھا جاتے ہیں اور کبھی کبھار طوفانوں کی سی کیفیّت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ سورج ڈھلتے ہی موسم گرما میں بھی ٹھٹھراتی ہوئی رات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اصلی سردی کے موسم میں پورا علاقہ تندوتیز تلوار کی سی کاٹ رکھنے والی ہواؤں کی زد میں آتا ہے۔ یہ شدّت اس قدر زیادہ ہوتی ہے کہ ایسے موسم میں باہر نکلنا موت کو دعوت دینے کے مترادف ہوتا ہے۔ شدید سردی کے موسم میں کبھی کبھی ایسا وقفہ بھی آتا ہے کہ جب ہوا بند ہو جاتی ہے' نیلے آسمان اور چمکتی دھوپ میں موسم کی شدّت کا احساس کچھ کم ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہاں آب وہوا تو ہے لیکن موسم نام کی کوئی شے نہیں ہے۔ شمالی روس قطبی صحرا کی حیثیّت رکھتا ہے جہاں سبزہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ آرکٹک ساحل کی جنوبی سمت میں ٹنڈرا کے خطے کی ایک چوڑی پٹی پھیلی ہوئی ہے لیکن یہاں بھی کہر اور دھند چھائی رہتی ہے۔ آرکٹک کے صحرا اور ٹنڈرا میں شدید سرما کی وجہ سے جنگلی حیات نہ ہونے کے برابر ہے۔ صرف برفانی ریچھ یا سیل سرما میں ساحل کے قریب قریب نظر آتی ہے۔ تاہم انتہائی مختصر موسم گرما میں رینڈیر جنگلوں سے نکل کر شمال کا رخ کرتے ہیں۔ مغربی سائبیریا کا علاقہ بھی دلدلوں سے بھرا پڑا ہے۔ تیاگا کا علاقہ وسیع و عریض جنگلات کی وجہ سے دنیا

میں مشہور ہے۔ بلکہ دنیابھر کے جنگلات کاایک تہائی حصّہ تیا گا کے جنگلات ہیں۔ ان کا رقبہ ۳ہزار میل لمبااور ۶۰۰ میل چوڑاہے۔ یہاں موسم گرما کی مناسب طوالت کی وجہ سے درختوں کو پھلنے پھولنے کاموقع ملتاہے۔ سرمابھی ناقابل برداشت نہیں ہوتا، لیکن اگر طوفان برف وباراں آجائے توبسااوقات کئی کئی دن باہر نکلنا ممکن نہیں ہوتا۔ تیا گا کے علاقے میں جانور بہت زیادہ نہیں ہوتے۔ جنگل کے کناروں اور کھلی جگہوں پر بھیڑیئے، لومڑیاں اور ریچھ ضرور مل جاتے ہیں۔ فروالے چھوٹے جانور بھی ان جنگلوں میں پائے جاتے ہیں۔

یورپ کی طرف ملنے والے روسی علاقے کو گھاس کا خطہ کہتے ہیں۔ یہاں کے بسنے والے طاقتور قبائل کے ڈر، سے روسی آبادیاں اکثر جنگلوں میں پناہ لینے پر مجبور ہوتی رہی ہیں۔ یہ خطہ ایشیا سے یورپ کی طرف نقل مکانی کرنے والے افراد کی تاریخی گزر گاہ رہاہے۔ اسے نیا روس بھی کہاجاتاہے انیسویں صدی کے آغاز میں یہاں گندم کی کاشت شروع کر دی گئی تھی۔ یہاں موسم کی شدّت نسبتاً کم ہے۔

وسط ایشیا کازیادہ تر حصّہ صحراپر مشتمل ہے۔ یہاں کیونکہ پانی کم ہےاور موجود پانی کے بخارات بن کر اڑنے کی شرح زیادہ، اس لئے یہاں خشکی زیادہ پائی جاتی ہے۔ اس کانتیجہ یہ ہے کہ زمین کابیشتر حصّہ نیم صحراہے۔ کیونکہ کہیں کہیں گھاس کے خطے بھی ہیں، چراگاہیں اور ہری بھری فصلیں بھی پیداہوتی ہیں آبی بخارات کی وجہ سے زیرِزمین نمک کی سطح بھی بلند ہوتی رہتی ہے، یہاں بارش کی سالانہ اوسط ۱۰ انچ ہے لیکن اس پراعتماد نہیں کیاجاسکتا، کیونکہ یہ بھی بدلتی رہتی ہے۔ وسط ایشیا کے پہاڑوں میں سطح زمین کی بلندی کامشاہدہ کیاجاسکتاہے۔ پہاڑوں کے دامن یا نچلی سطح پر ڈھلوانوں کی زمیں پر آبپاشی کے ذریعے کاشتکاری ممکن ہے۔ پہاڑوں کے دامن تک پہنچتے پہنچتے صحرابھی گھاس کے خطے میں تبدیل ہونے لگتاہے۔ یہی وجہ ہے کہ سطح زمین سے تھوڑی سی بلندی پر پہاڑوں میں گھاس کی وجہ سے سبزہ دکھائی دیتاہے۔ ساڑھے تین ہزار فٹ کی بلندی تک پہنچتے پہنچتے نم آلود ڈھلوانیں جنگلات کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ قفقاز صغیراور آرمینی سطح مرتفع گھاس کے وسیع وعریض خطے پر مشتمل ہے۔ یہاں موسم سرماعام طور پر دیگر گھاس کے خطوں کی نسبت زیادہ سرد ہوتاہےاور برف زیادہ دیر تک زمین کوڈھکے رکھتی ہے۔ یورال کی نسبتاً کم بلند پہاڑیوں میں شمالی علاقے کی سی صورتحال جنوب میں بھی پائی جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے زمینی خطوں کی سرحدیں تبدیل ہوتی نظر آتی ہیں۔ سطح زمین سے بلندی پر ٹنڈرا کا خطہ جنوب تک ملتاہے اور جنگلات کاعلاقہ گھاس کے خطے میں پہاڑوں کے دامن تک چلاجاتا ہے۔ یورال کے جنگلات میں الپائن کاخطہ کہیں کہیں صرف اونچی چوٹیوں کے قریب ہی ملتاہے

جبکہ یورال کے بہت تھوڑے حصّے جنگلات کے خطے سے بلند واقع ہیں۔ جنوبی سائبیریا کے پہاڑوں میں التائی اور سایان کے علاوہ بیکال کے علاقے میں جنگلوں سے ڈھکے ہوئے پہاڑوں کو گھاس کے خطوں جیسا علاقہ الگ کر دیتا ہے۔ اسی علاقے میں منگولیا کے جانور اور پرندے بھی پائے جاتے ہیں۔ شمال مشرقی سائبیریا کے پہاڑوں کے اثرات کے تحت جنوب میں تیاگا سے ملتے جلتے علاقے چھ سات سو میٹر کے قریب ٹنڈرا کے علاقے میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ کولیما دریا کے مشرق میں جنگلات کی بجائے ٹنڈرا کے خطے کا سارنگ دکھائی دیتا ہے، جس کی وجہ سے دور دور تک چٹیل ویران پہاڑوں کا سلسلہ ملتا ہے جہاں انسان تو در کنار جانور تک کے زندہ رہنے کے امکانات ناپید ہیں۔

اس مختصر جغرافیائی پس منظر کے بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ روسیوں کی توسیعی ذہنیت کو سمجھنے میں آسانی پیدا ہو۔ شہزادگان کے روس سے لے کر زار شاہی اور پھر اشتراکی روس کے قیام و انہدام تک پیش آنے والے واقعات کو ان کے حقیقی پس منظر میں سمجھا جا سکے۔ جغرافیائی پس منظر کے عمیق مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ایک تو یہاں کی زمین اس قدر وسیع اور مختلف الاصل ہے کہ اس کا احاطہ کرنا ناممکن نہ سہی لیکن مشکل ضرور ہے۔ دوم موسم کی شدّت اور حالات کی ناموافقت نے یہاں کے باسیوں کو سخت کوش ہی نہیں بلکہ ظالم بھی بنا دیا ہے۔ کوہ قاف سے وابستہ دیومالائی کہانیاں بھی اسی خطے سے متعلق ہیں جن میں ایسے جنوں کا ذکر ہے جو محیرالعقول کارنامے انجام دیتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ معلوم دنیا کی تاریخ میں تباہی و بربادی برپا کرنے والے ضرب المثل کردار چنگیز خان کا تعلق بھی اسی علاقے سے تھا۔ دنیا کو فتح کرنے کا خواب لئے فرانسیسی فاتح نپولین کے قدم اسی علاقے میں آ کر ایسے جمے کہ پھر تباہی و بربادی اس کے حصّے میں آئی۔ خلافتِ عثمانیہ کے بعد عالم اسلام کی سب سے بڑی سلطنت مغلیہ کا بانی ظہیر الدین بابر بھی انہی علاقوں سے اٹھ کر ہندوستان میں آیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے عالمی منظر پر چھا گیا۔ دنیا کو تباہ و برباد کرتے ہوئے جب ہٹلر کی افواج روس آن پہنچیں تو پھر انہیں واپس جانا نصیب نہ ہو سکا۔ لاکھوں نازی فوجی سرد جہنم میں دفن ہو گئے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ہٹلر کا "تیسری جرمن ریاست" کے قیام کا خواب بکھر گیا۔ طبعی شدائد سے لڑتے لڑتے یہاں کے رہنے والے نہ صرف مشکلات و مصائب پر قابو پانے کے لئے طبعی طور پر آمادہ رہتے ہیں بلکہ ایسی ناہمواریوں سے لڑتے لڑتے وہ شدّت پسند ہی نہیں، اذیت پسند بھی ہو گئے ہیں۔ یہاں کے رہنے والوں نے نہ صرف شدید اور ناموافق حالات کا مقابلہ کر کے اپنی سخت کوشی ثابت کر دی ہے بلکہ ایسی کئی طوفانی لہروں کا رخ موڑ کر کئی دفعہ اپنی عالی ہمتی پر بھی مہر تصدیق ثبت کر دی ہے کئی دفعہ دنیا کو تاراج

کرتی ہوئی قوتیں یہاں آکر نہ صرف رک گئیں بلکہ انہیں واپسی بھی نصیب نہ ہو سکی۔ فرانسیسی نپولین بونا پارٹ اور جرمن ہٹلر کی افواج' قاہرہ کی تباہی و بربادی اس ضمن میں بطور مثال پیش کی جا سکتی ہے۔ یہاں سے اٹھنے والی لہروں نے دنیا کو تباہ و برباد کرنے کے علاوہ آباد کاری کا کام بھی کیا۔ چنگیز خان کی تباہ کاریاں اور ظہیر الدین بابر کا مغلیہ سلطنت کا قیام اس سلسلے کی واضح مثالیں ہیں۔ یہاں کے کرداروں کا بعد المشرقین سمجھنے کے لئے یہاں کے جغرافیائی حالات پر گہری نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ روسیوں کے معاشرتی اور معاشی احوال پر یہاں کی بے پناہ زمینی وسعت اور موسمی درشتی نے اس قدر اثرات مرتّب کئے ہیں کہ اگر ان دونوں وجوہات کا مطالعہ کر لیا جائے تو روسیوں کے تاریخی ارتقا کو سمجھنے کی بنیاد مل سکتی ہے۔ یہاں کے زمینی خطے اس قدر وسیع ہیں کہ لوگ اپنی پوری زندگی انہی منطقوں میں گزار دیتے ہیں اور انہیں کسی اور علاقے کو دیکھنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ ماسکو اور ولاڈی ووسٹک کا درمیانی فاصلہ نیویارک اور لندن کے درمیانی فاصلے سے زیادہ ان دونوں علاقوں کے درمیان ایک دن کا فرق ہے۔ دیکھنے میں بحیرہ کیپسئن ایک جھیل کی طرح نظر آتا ہے لیکن رقبے کے اعتبار سے جزائر برطانیہ اس میں غرق ہو سکتے ہیں۔ بیکال جھیل کا ایک سرے سے دوسرے سرے تک فاصلہ ڈیڑھ ہزار کلو میٹر سے بھی زیادہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روس میں "وقت اور فاصلے" کے تعلق کا ایک خاص مفہوم پایا جاتا ہے۔ مرکزی منصوبہ بندی پر عمل در آمد میں کوتاہیوں اور ناکامیوں کی ایک بڑی اہم وجہ "وقت اور فاصلوں کا طویل فرق" بھی رہی ہے۔ کمیونزم کی ناکامی کی ایک اہم وجہ یہی "طویل فرق" بھی رہا ہے جس پر تحقیق کی جانی چاہئے۔

جغرافیہ تاریخ سازی کے لئے ایک سٹیج کی حیثیت رکھتا ہے۔ جغرافیے کے کسی بھی قوم یا ملک کے تاریخی ارتقا پر کیا اثرات مرتّب ہوتے ہیں' اس بارے میں مختلف نظریات پائے جاتے ہیں۔ مغربی تاریخ دان ہیروڈوٹس نے روس کے جنوبی گھاس کے میدانوں میں رہنے والے خانہ بدوشوں کے بارے میں تفصیلات درج کرتے ہوئے ان جغرافیائی حالات کا تذکرہ بھی کیا ہے جن کی وجہ سے یہ خانہ بدوش دیگر اقوام پر چھا گئے۔ سکائی تھین کا تذکرہ کرتے ہوئے ہیروڈوٹس نے ان حالات کا ذکر بھی کیا ہے جن کی وجہ سے طاقتور ایرانی اقوام ان پر غالب نہ آسکیں۔ روس کے جدید تاریخ دان بشمول' کلچوسکی اور سولویف بھی روس کے جغرافیائی حالات کو ہی روسی تاریخ سازی کا اہم عنصر شمار کرتے ہیں۔ مغربی مصنّفین کرنر اور سمنر نے بھی روسی تاریخ پر جغرافیائی حالات کے گہرے اثرات کا بڑے شدومد سے ذکر کیا ہے۔

مغربی مستشرقین بھی عرب مسلمانوں کے دیگر اقوام پر غلبے کو معاشی و معاشرتی حالات کا

شاخسانہ ہی گر دانتے ہیں لیکن جغرافیائی و طبعی حالات کا ذکر کرتے وقت وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ قرون اولیٰ کے مسلمانوں کو جن اقوام کا سامنا کرنا پڑا وہ بھی طبعی و جغرافیائی شدائد کا سامنا کرنے والی تھیں۔ روم فارس اور مشرقِ بعید و افریقہ میں بسنے والے قبائل و اقوام بھی سخت کوش تھیں۔ انہیں بھی عربوں کی طرح موسمی درشتیوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ معاشرتی طور پر وہ اقوام بھی سخت کوش تھیں۔ مغلوب ہونے والی اقوام کا صرف طبقہ اشرافیہ ہی عیش کوش اور آرام طلب تھا ورنہ معاشرہ و تہذیب مجموعی طور پر سخت جان و سخت کوش تھا۔ لیکن اس کے باوجود مسلمان ان پر غالب آئے تو اس کی دیگر وجوہات تھیں، جن پر مستشرقین بحث کرتے ہوئے پہلو تہی کرتے ہیں کیونکہ اس طرح مسلمانوں کی نظریاتی برتری ثابت ہوتی ہے جو یہ لوگ منظرِ عام پر نہیں لانا چاہتے۔

کارل مارکس نے بھی کسی قوم یا معاشرے کے تاریخی ارتقا میں طریقہ پیدائش (PROUDCTION MEANS) کو حتمی عنصر کے طور پر پیش کیا جو کسی بھی معاشرے کے جغرافیائی حالات کے مطابق ترتیب پاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں جغرافیائی حالات ہی تاریخی ارتقا میں حتمی کردار ادا کرتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ موسمی اور جغرافیائی حالات تاریخی ارتقا پر اثرانداز ہوتے ہیں لیکن خارجی جبریت کا یہ عنصر اس قدر مؤثر نہیں کہ انسانی عزم و ہمت کی نفی کر دے۔ تاریخ ہی اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ انسان نے بارہا فطری جبر کو اپنے عزم و ہمت کی طاقت سے شکست دی پھر نظریئے کی طاقت نے ہی انسانی عزم و ہمت کو وہ جلا بخشی کہ جس کی حدود کا تعین ہی نہیں ہو سکتا۔ روسی توسیع پسندی اور جوع الارضی کو "جغرافیائی قوت" قرار دینا جزوی طور پر تو درست ہو سکتا ہے لیکن فقط اسے حتمی عنصر قرار دینا غلط ہے۔ اس سلسلے میں روسیوں کی قومی امنگوں اور اجتماعی نفسیات کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔ روس نے ۱۴۸۱ء تا ۱۹۸۰ء کے عرصے میں جس توسیع پسندی کا مظاہرہ کیا ہے اس میں ان سب عناصر کا بھی گہرا تعلق ہے۔ معروف روسی تاریخ دان ریسونسکی نے روسی استعمار کے ارتقا کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "روسی ریاست کا ارتقا اس علاقے کے جغرافیے سے متاثر ہوا ہے روس کے گرد و پیش دور تک پھیلے ہوئے میدان توسیع کے راستے میں فطری رکاوٹیں نہیں ہیں۔ اس جغرافیائی صورتحال کی وجہ سے ماسکو کی ریاست کے لئے مشرقی یورپ کی طرف پھیلنا نسبتاً آسان ہو گیا تھا۔ یورال کے دوسری طرف روسی، بحرالکاہل بلکہ الاسکا اور کیلیفورنیا تک پھیلتے چلے گئے۔ اس کا موازنہ امریکہ کی مغرب کی جانب پیش قدمی ہی سے کیا جاسکتا ہے۔ روس کی وسیع سلطنت کی سرحدیں شمال اور

...... ا۔ ہسٹری آف رشیا از ریسونسکی مطبع آکسفورڈ ۱۹۶۳ء صفحہ ۹

مشرقی سمت سمندروں سے جاملیں جبکہ جنوب میں صحراؤں 'اونچے پہاڑوں اور کسی حد تک سمندر نے روسی سرحدوں کا تعین کیا۔"

لیکن یہاں ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ انہی علاقوں میں اسی طرح کے موسمی شدائد کا مقابلہ کرنے والے دیگر قبائل واقوام روسیوں سے شکست کیوں کھا گئے۔ اگر جغرافیائی حالات نے ہی تاریخ سازی کرنی تھی تو شمال یورپی روس میں بکھرے اور سائبیریا کے برفستانوں میں رہنے والوں نے روسیوں سے مغلوب ہونا کیوں قبول کر لیا؟ اگر سخت کوشی اور طبعی جبر کے تحت ہی معاملات طے پا رہے تھے تو پھر ایک ہی طرح کے فطری حالات کے تحت زندگیاں گزارنے والوں میں سے ایک گروہ غالب کیسے آیا اور باقی مغلوب کیوں ہو گئے؟ انہیں علاقوں میں بسنے والے مسلم قبائل کی روسیوں کے خلاف مزاحمت کامیابی سے ہمکنار کیوں نہ ہو سکی' حالانکہ سخت کوشی اور فطری جبر برداشت کرنے میں یہ مسلمان کسی طرح بھی جارح روسیوں سے کم نہیں تھے۔ انہوں نے مزاحمت شروع ہی نہیں کی بلکہ طویل مدّت تک قربانیاں دے کر اسے انتہا تک پہنچانے کی کاوشیں بھی کیں لیکن وہ کامیاب کیوں نہ ہو سکے؟ اس مقصد کے لئے پچھلی پانچ صدیوں پر پھیلی ہوئی روسی استعماری تاریخ اور اس کے مدِمقابل داستانِ حریّت کے روشن و تاریک ابواب کا مطالعہ کرنا ضروری ہے۔

پھر سب سے اہم بات ۱۹۸۷ء میں اشتراکی افواج کا افغانستان سے عسکری ہزیمت کے بعد انخلاء ہے 'جس نے نہ صرف اشتراکیوں کی تاریخ پر ان مٹ نقوش چھوڑے ہیں بلکہ عالمی سیاست میں ایسا عدم توازن پیدا کر دیا ہے جس کی وجہ سے مختلف اقوام ونظام ہائے معاش و معاشرت میں الٹ پھیر شروع ہو گیا ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا افغان روسیوں سے زیادہ سخت کوش اور فطری شدائد کا مقابلہ کرنے کی صلاحیّت رکھتے تھے اور ان کے پاس عسکری و معاشی وسائل روسیوں سے زیادہ تھے کہ جن کی وجہ سے انہوں نے دریائے آمو کی طرف سے اٹھنے والے سرخ سیلاب کا رخ موڑ کر ایسا کارنامہ سرانجام دیا کہ جس کی گونج مشرق و مغرب کی تاریخ میں سنائی دیتی رہے گی۔ ان سوالوں کا جواب حاصل کرنے کے لئے پچھلی پانچ صدیوں پر پھیلی ہوئی روسی استعماری تاریخ کے علاوہ روسیوں اور افغانوں کی طویل نفسیاتی و تہذیبی تاریخ کا مطالعہ انتہائی ضروری ہے۔ اس تاریخ میں جہاں استعماریت کے تاریک ابواب آئیں گے وہاں حریّت کی ایسی روشن مثالیں بھی ملیں گی جنہوں نے منہ زور اور بے لگام استعماری جوش کو شجاعت بھری زنجیریں پہنانے کی کوششیں کیں اور بالآخر افغان مجاہدین نے نہ صرف بے لگامی کو لگام دی بلکہ منہ زوری و جبرواستبداد کا زہر نکال کر استعمار کو ہندوکش سے نکال کر دریائے آمو کے اس پار سائبیریا کے

سرد جہنم میں ایسا دفن کیا کہ اشتراکی سوویت یونین اب قصہ پارینہ بن کر مغربی سامراجیت کا منہ چڑا رہا ہے۔

مسلمانوں کے عروج وزوال کی داستان کے ساتھ ساتھ روسی برطانوی اور فرانسیسی سامراجی سرگرمیوں کی ایک متوازی تاریخ موجود ہے۔ ان سامراجی طاقتوں نے ولندیزیوں اور دیگر چھوٹی سامراجی طاقتوں کی بھی اہل اسلام کے خلاف سازشوں میں مدد کی۔ مغل سلطنت کے خلاف ایسٹ انڈیا کمپنی کی سازشیں ہوں یا خلافتِ عثمانیہ کے خلاف لارنس آف عریبیہ کی چالیں، فرانسیسی استعماری ہتھکنڈے ہوں یا زار شاہی روسیوں کی مسلمانوں پر چیرہ دستیاں، ان سب میں جغرافیائی وسیاسی عوامل کے علاوہ سب سے اہم بات وہ تاریخی تسلسل ہے جو خیبر سے (مدینہ) یہودیوں کے انخلا اور القدس میں مسلمانوں کے فاتحانہ داخلے سے شروع ہوتا ہے۔ زار شاہی روس میں مسلمانوں کے خلاف صلیبی روح کارفرما رہی جبکہ اشتراکی روس میں صیہونی دماغ اہلِ اسلام کے خلاف فعال اور متحرک رہا جیسے کہ ہندوکش کی وادیوں میں بسنے والے افغان مسلم قبائل نے اس بری طرح شکست دی کہ رواں صدی کا تاریخی واقعہ معرض وجود میں آگیا۔ یعنی افغا ن مجاہدین کی فتح اور سوویت یونین کا خاتمہ ۱۴۵۳ء میں ترک فاتحین نے سلطنتِ روما کے بعد عیسائی دنیا کے دوسرے بڑے مرکز قسطنطنیہ کو فتح کر کے یورپ میں اپنی عظمت کا سکہ بٹھا دیا۔ خلافتِ راشدہ کے دور میں جب عیسوی دنیا کے مرکز سلطنتِ روم کو ختم کر دیا گیا تو یورپی دنیا نے اپنی کلیسائی طاقت کو قسطنطنیہ میں مرکوز کر دیا جسے ترکان عثمان نے ۱۴۵۳ء میں اپنے گھوڑوں کے قدموں تلے روند ڈالا۔ روسی ہمیشہ سے اپنے آپ کو یورپ کا حصّہ سمجھتے رہے ہیں، یورپ روس تعلقات کی تاریخ بھی خاصی قدیم ہے۔ یورپ کا عیسائی باشندہ دنیا میں کہیں بھی ہو وہ اپنے آپ کو رومائے مقدس کا شہری سمجھتا ہے۔ روس یورپ کا حصّہ ہونے کے باعث اور مشرقی کلیسائی قوّتوں کے زیرِ اثر اپنے آپ کو اسی عیسائی دنیا کا ایک حصّہ سمجھتا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ترکوں نے قسطنطنیہ پر قبضہ کر لیا تو اس کے روس پر بھی اثرات مرتّب ہوئے۔ روسیوں نے اپنے آپ کو ترکوں کے زیرِ نگیں عیسائی افراد کا کسٹوڈین سمجھنا شروع کر دیا۔ ترک، روس باہمی آویزش کی بنیاد یہی سوچ بنی، جس نے پانچ صدیوں تک روسیوں کو مسلم علاقوں پر یلغاریں کرنے پر کمربستہ رکھا۔ روس نے جب ترکانِ عثمان سے معرکہ آرائی شروع کی تو اس وقت ترکوں کی سلطنت تین برّاعظموں پر پھیلی ہوئی تھی۔ وہ روحانی اور سیاسی اعتبار سے عالمِ اسلام کا مرکز سمجھے جاتے تھے یہی وجہ تھی عیسائی روس کیونکہ اپنے آپ کو یورپ کا حلیف سمجھتا تھا اس لئے ترکوں سے اس کی مخاصمت بھی فطری تھی۔ یورپی صلیبیوں کو ترکوں نے چاروں شانے چت گرا دیا تھا۔ سلطان محمد

فاتح کی فتح قسطنطنیہ اس سلسلے کی حتمی کڑی تھی۔ اس کے بعد روسیوں نے اپنے ذمے وہ فرض لے لیا جو صلاح الدین ایوبی کے دور کے بعد یورپ نے تصوّراتی یا شعوری طور پر اپنے ذمّے لے لیا تھا۔ ترکوں نے یورپیوں کو ہر جگہ اور ہر محاذ پر شکست دے کر اپنی برتری ثابت کر دی تھی۔ اس لئے یورپیوں نے ایک طرف براہ راست مقابلے کی بجائے "سازشی انداز" اختیار کیا تو دوسری طرف روسی معاشرے میں کلیسائی اثرات کو سیاسی مہم جُوئی میں فعال کرنے کی کوشش کی۔ ان کی اس کاوشوں کی کامیابی کا اندازہ روسی حکمران پیڑدی گریٹ کی آخری وصیّت سے لگا جا سکتا ہے جس میں وہ رقمطراز ہے "ہر وہ کام کیا جائے جس کے ذریعے یورپی رسم ورواج روس میں رواج پا سکیں۔ اس کام کے لئے مختلف شاہی درباروں کی مدد حاصل کرنے سے دریغ نہ کیا جائے۔ بالخصوص یورپ کے پڑھے لکھے افراد کی خدمات حاصل کی جائیں، انہیں ہر قسم کی ترغیبات دی جائیں اور مناسب طریقے سے برتاؤ کیا جائے" ترکی پیڑدی گریٹ کے دور سے ہی روسیوں کی نظروں میں بُری طرح کھٹک رہا تھا جو نہ صرف عالمِ اسلام کا روحانی وسیاسی مرکز تھا بلکہ دنیا کی سب سے بڑی عسکری طاقت بھی تھا۔ اس لئے روسی بھی اس سے براہ راست ٹکر نہیں لے سکتے تھے۔ اس لئے انہوں نے آرمینیوں اور یونانیوں کو سلطنتِ عثمانیہ کے خلاف اٹھا کر اور سازشوں کے ذریعے اپنے مذموم مقاصد کے لئے استعمال کرنے کی سازشیں کیں۔ یہی وجہ ہے کہ نہ صرف یورپی بلکہ روسی بھی یونانیوں کے ممدو معاون رہے۔ اس کی واحد وجہ یہ تھی کہ یونانی ترکوں کے دشمن تھے۔ ترکی ناٹو کا ممبر ہونے کے باوجود یورپ کی ہمدردیاں حاصل نہیں کر سکا۔ ترکی یورپی کلچر کو اپنا کر بھی آرمینیا اور یونان کے مقابلے میں یورپ کی حمایت حاصل نہیں کر سکا۔ ۱۴۵۳ء میں فتح قسطنطین کے بعد تمام پادریوں بشمول آرچ بشپوں نے ماسکو ہی میں پناہ لی تھی۔ اس طرح روس مشرقی کلیسا کا مرکز بن گیا اور اسے مذہبی تقدّس بھی حاصل ہو گیا۔ اسی تقدّس کے زیرِ سایہ روسی مہم جوئی نے ایک منظّم صورت اختیار کی اور ماسکووی ریاست نے ایک عظیم زار شاہی سلطنت کی صورت اختیار کر لی۔

۱۴۵۳ء میں فتح قسطنطنیہ کے وقت جب ترکوں کی سلطنت تین برّاعظموں پر پھیلی ہوئی تھی اور یورپی کلیسا کی اہلِ اسلام کے خلاف تمام سازشیں ترکوں کے عزم جہاد اور عسکری صلاحیتوں کے سامنے ہیچ ہو چکی تھیں، کلیسائی قوّتیں ماسکو میں جمع ہوئیں اور وہاں سے اسلام کے خلاف نقب لگنی شروع ہو گئی۔ پھر ۱۴۸۰ء میں ماسکووی حکمران آئیوان سوم نے روس میں مسلم تاتار حکومت کے ۲۴۰ سالہ دورِ حکومت کا خاتمہ کر کے اس کام کا آغاز کر دیا تھا جو یورپی صلیبی مکمّل نہیں کر سکے تھے۔ اس کے بعد ۱۵۵۳ء میں قازان پر بھی قبضہ کر لیا گیا۔ ۱۵۵۶ء میں

استرخان بھی ماسکووی حکمرانوں کی ہوس کی بھینٹ چڑھ گیا۔ اس کے بعد وولگا دریا اور اس کے تمام قریبی علاقے جو سب مسلمانوں کے پاس تھے آہستہ آہستہ روسیوں کے قبضے میں چلے گئے۔ حتّٰی کہ ۱۹۱۷ء میں شروع ہونے والے بالشویک انقلاب نے تاریخ کو ایک نئی شکل دے دی۔ توسیع پسندی کی صلیبی روح کی جگہ صیہونی عزائم نے لے لی۔ کلیسائی قوّت کی جگہ مارکس ازم اور لینن ازم نے لے لی اور مقبوضات بڑھانے کا وہ سلسلہ جسے آئیوان سوم نے منظم طریقے سے شروع کیا تھا آگے بڑھاتا رہا۔ حتّٰی کہ دسمبر ۱۹۷۹ء آن پہنچا جب اشتراکی روسی افواج کابل میں داخل ہوئیں، اور پھر تاریخ نے ایک نیا موڑ کاٹا جس میں کلیسائی اور صیہونی روس کی تقدیر ہی بدل گئی۔ جب یہ موقف واضح ہوا تو اس پر "افغانوں جیسی پسماندہ اور غریب قوم کے ہاتھوں روس جیسی عظیم اور امیر قوم کی شکست" لکھی ہوئی تھی۔

لیکن یہاں ایک بات کا ذکر بڑا ضروری ہے کہ فتح قسطنطنیہ تُرکانِ عثمان کی فتوحات کا نقطہ عروج ہے۔ اس وقت عثمانی سلطنت کی سرحدیں ایشیا، یورپ اور افریقہ تک پھیل چکی تھیں اور عیسائی دنیا کا رُوحانی مرکز بھی مسلمانوں کے قبضے میں آچکا تھا۔ القدس پہلے ہی مسلمانوں نے حاصل کر لیا تھا اور عیسائی دنیا صلیبی جذبوں کے علی الرغم بھی اسے مسلمانوں سے واپس نہیں چھین سکی تھی۔ اس لئے اب جبکہ قسطنطنیہ پر بھی مسلمانوں نے توحیدی پرچم لہرا دیئے تھے تو پھر القدس کی واپسی کے امکانات بالکل ہی ختم ہو گئے تھے۔ اس لئے "عیسوی مرکز کو ماسکو" منتقل کر دیا گیا تھا۔ "تیسرے روم" کے تصوّر کے تحت روسی حکمرانوں کو کلیسا کی سرپرستی مل گئی تھی۔ انہی کلیسائی قوّتوں کے زیرِ اثر ۱۴۸۰ء میں سائبیریا پر لشکر کشی کر کے مسلم علاقوں پر قبضہ کرنے کا آغاز ہوا۔ اس کے ساتھ ہی اس علاقے میں آہستہ آہستہ عثمانیوں کے زیرِ اثر مسلمان حکمرانوں کو پہلے آزادی کا خواب دکھایا جاتا، جس کے تحت وہ خلافتِ عثمانیہ سے برات کا اعلان کرتے، اس کے بعد روسی ان پر عرصہ حیات تنگ کر کے اپنی لپیٹ میں لے لیتے۔ یہ سلسلہ رواں صدی کے آغاز تک جاری رہا حتّٰی کہ زار شاہی کے تحت روس ایک ایسی استعماری قوّت بن گیا جس کے زیرِ قبضہ مسلم علاقوں کی تعداد سب سے زیادہ ہو گئی۔ یہ ماسکووی ریاست کو کلیسا کی طرف سے اس امداد کا نتیجہ تھا کہ یہ ریاست مسلمانوں کے علاقوں پر قبضہ کرتے کرتے ایک بہت بڑے علاقے پر پھیل گئی۔ رواں صدی کے آغاز پر مسلم علاقوں پر جن عیسائی طاقتوں نے قبضہ کیا ان میں روس کے قبضے میں باقی عیسائی ممالک کی نسبت تین گنا زیادہ مسلم رقبہ تھا۔ دیئے گئے گوشوارے سے اس بات کا عددی ثبوت ملتا ہے۔

فرانس کے پاس ۳۱لاکھ ۱۶ہزار مربع میل
جرمنی کے پاس ۵۳ہزار مربع میل
برطانیہ کے پاس ۱۸لاکھ ۶۷ہزار ۴ ۲۳مربع میل
پر مشتمل مسلم علاقے تھے جبکہ روس کے پاس ۶۵لاکھ ۶۴ہزار ۸۷۷ مربع میل پر مشتمل مسلم

روسی مسلم اکثریتی علاقے

نام ریاست	کل آبادی	مسلمان
۱۔ ازبکستان	ایک کروڑ	۹۰لاکھ
۲۔ ترکمانستان	۴۰لاکھ	۳۹لاکھ
۳۔ تاجکستان	۲۵لاکھ	۲۲لاکھ
۴۔ قرغیزستان	۳۰لاکھ	۲۷لاکھ
۵۔ قازقستان	ایک کروڑ	۷۰لاکھ
۶۔ آذربائیجان	۵۰لاکھ	۴۰لاکھ
۷۔ کاکیشیا (قوقاز)	ایک کروڑ ۲۵لاکھ	ایک کروڑ
۸۔ کریمیا (جزیرہ قرم)	نامعلوم	۵۰لاکھ
۹۔ جارجیا اور آرمینیا (مسلم اکثریتی علاقے تھے لیکن یہاں رسیوں کو بسا کر مسلمانوں کو اقلیت میں تبدیل کر دیا گیا ہے)	نامعلوم	(۵۰لاکھ تقریباً)
۱۰۔ یورپی روس کے علاقے جن میں دریائے والگا، اورال، قازان، تاتار اور باشکر کے علاقے شامل ہیں	دو کروڑ	ایک کروڑ ۲۵لاکھ
۱۱۔ روس کے باقی صوبوں میں بسنے والے مسلمان		۵۰لاکھ تقریبا

اس طرح روس میں مجموعی طور پر چھ کروڑ مسلمان بستے ہیں

مقبوضہ رقبہ تھا۔ یعنی روس نے حقیقتاً ''تیسرے روم'' کے فرائض انجام دیئے اور اس نے رواں صدی کے آغاز تک سب سے بڑا کلیسائی مرکز بن کر دکھا دیا۔ جس وقت زار شاہی روس اپنا کلیسائی کردار ادا کرنے کے عُروج پر تھا اس وقت مسلم خلافتِ عثمانیہ سمٹ سمٹا کر ترکی تک محصور ہو چکی تھی۔ پھر بعد میں مصطفیٰ کمال پاشا نے اسے ''مردِ بیمار'' کہہ کر خود ہی ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔ مسلمانوں کی عظیم الشّان سلطنت کے خاتمے کے ساتھ ہی مسلم مقبوضات کی بندر بانٹ بھی شروع ہو گئی۔ ایک اہم بات جس پر توجّہ دینے کی ضرورت ہے وہ یہ کہ اسی دوران میں زار شاہی حکومت جو ''تیسرے روم'' کا حقیقی مقام حاصل کر چکی تھی، لڑکھڑانے لگی۔ بالشویک انقلاب کا پہیہ چلنے لگا یہودیوں نے زار شاہی کے اندر اس حکومت کو کمزور کیا اور بالآخر یہاں اشتراکی غالب آ گئے۔ کیا خلافتِ عثمانیہ کا خاتمہ اور پھر اشتراکی ریاست کے قیام میں کوئی واقعاتی مماثلت پائی جاتی ہے یا یہ حُسنِ اتفاق ہے کہ کلیسائی مرکزِ قوّت اس وقت ختم ہوا جب دنیا میں اس کے مدِّ مقابل کوئی ہلالی قوّت موجود نہ رہی تھی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اب کلیسائی قوّت کے وجود کا جواز باقی نہیں رہا تھا اس لئے باقی نہیں رہی تھی۔

اس لئے ''خفیہ ہاتھوں'' نے حرکت شروع کر دی اور تاریخ کا پہیہ ایک بار پھر اسی طرح چلنا شروع ہو گیا جس طرح ان ہاتھوں نے گھمانا شروع کیا۔ قرطاسِ تاریخ میں ایسے کردار ابھرنے شروع ہو گئے جنہوں نے فیصلہ کُن کردار ادا کئے۔ ۱۹۱۷ء میں انقلاب سرخ کی ابتدا سے پہلے روس میں زار شاہی انتظامیہ کا اگر جائزہ لیا جائے تو ایک کردار ہمارے سامنے بڑا واضح انداز میں سامنے آتا ہے، جسے یہودی ذرائع ابلاغ نے ایک جنسی کردار یا جنسی نشان (SEX SYMBOL) کے طور پر مشہور کر رکھا ہے۔ مشرقی اور مغربی تاریخ نویسوں نے راسپوتین (RASPUTIN) کو ایک جنسی بے راہ رو اور آوارہ گرد کے طور پر لیا ہے۔ حالانکہ وہ یہودیوں کا تخلیق کردہ ایک سیاسی کردار تھا جسے مذہب کی آڑ میں ایک سیاسی کردار ادا کرنے کے لئے تخلیق کیا گیا تھا، لیکن اسے جان بوجھ کر جنس زدہ مشہور کیا گیا اور پھر اس کی شخصیّت کے انہی پہلوؤں پر تجزیئے بھی کئے گئے۔ پھر تحقیق و تفتیش کو انہی خطوط پر آگے بڑھایا گیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے گناہ و ثواب کے ایک خود ساختہ تصوّر کو اپنا کر ایک پادری اور مسیحا کا رُوپ دھارا۔ وہ اپنی بے پناہ طلسماتی کشش کے باعث لوگوں میں معروف ہوا۔ اس نے عیسائیّت کے گہرے مطالعے کے بعد اپنے نئے خیالات قائم کئے جو عیسائیت کے معروف نظریات کے برعکس تو تھے لیکن اس نے اپنے آپ کو عیسائی رہبر اور رہنما کے طور پر ہی لوگوں کے

سامنے پیش کیا، اپنے خیالات کا پرچار کیا اور مذہبی تاریخ میں "خلائفی فرقے" کے بانی کے طور پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے زندہ ہو گیا۔ وہ لوگوں کو اپنی طرف بلاتا اور کہتا کہ "رب کی ذات بے پایاں ہے، وہ بخشنے والا ہے، توبہ استغفار کو پسند کرتا ہے توبہ کرنے اور گناہوں کی بخشش مانگنے کے لئے گناہوں کا ہونا ضروری ہے۔ اس لئے آؤ گناہ کریں، کیونکہ گناہ کا بوجھ جس قدر زیادہ ہو گا معافی اور استغفار کا اتنا ہی زیادہ مزہ آئے گا" اس کے ساتھ ساتھ اس نے طویل عرصہ تک "ریاضت و عبادت" کے ذریعے اپنے اندر کچھ عجیب وغریب قسم کی قوت پیدا کر لی تھی جس کے ذریعے وہ نہ صرف لوگوں کی چھوٹی موٹی بیماریاں دور کر دیتا بلکہ انہیں پیش آئند مشکلات سے بھی آگاہ کر دیتا تھا۔ اپنی اسی صلاحیت کے بل بوتے پر وہ "مسیحا و رہبر" بنا اور اسی صلاحیت نے اسے زار شاہی کے اہلکاروں کے حلقے میں شہرت دی۔ طبقہ امرا کی بیگمات نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ کچھ اس کے استغفار اور گناہ کے بارے میں نظریات اور اس پر اس کے شہوت زدہ بے باک رویّوں نے اسے طبقہ اشرافیہ کی خواتین میں ہر دلعزیز بنا دیا تھا۔ انہیں راستوں پر چلتے چلتے وہ بالآخر زار شاہی دربار میں پہنچا جہاں اس نے مسیحائی کردار کے ساتھ ساتھ اپنا سیاسی کردار بھی ادا کرنا شروع کر دیا۔ جنگِ عظیم اوّل میں زار شاہی روس کی شمولیت اور غیر مؤثر کردار کی ادائیگی پس پردہ ہاتھوں میں سب سے اہم ہاتھ راسپوتین کا ہی تھا۔ زار شاہی روس میں عیسائیت کے غلبے اور پادریوں کی مضبوط گرفت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ "قدیم مشرقی چرچ" نہ صرف لوگوں کے نجی و ذاتی معاملات میں دخیل تھا بلکہ ریاستی معاملات میں بھی اس کی مداخلت روا اور حق بجانب سمجھی جاتی تھی۔ راسپوتین کا پادری کے رُوپ میں زار شاہی دربار کے معاملات میں دخل دینا اور پالیسیوں کی ترتیب و تدوین میں مؤثر ہونا اس بات کا ایک اہم ثبوت ہے جسے تاریخ نویس ابھی اس انداز میں نہیں سمجھ سکے جیسا کہ سمجھنے کا حق تھا۔ کسی دور میں سننے میں آیا تھا کہ ماسکو یونیورسٹی میں راسپوتین کے افکار و ریاستی کردار پر تحقیقات ہو رہی ہے لیکن اس کا نتیجہ کیا نکلا پتہ نہیں چل سکا۔ بہرحال یہودیوں نے راسپوتین کی صورت میں ایک ایسا طلسماتی کردار گھڑا تھا جس نے چرچ کا نمائندہ بن کر یا اس کا روپ دھار کر اور پھر زار شاہی دربار میں پہنچ کر نظام کو اندر سے اڑانے کا بندوبست کیا۔ یہی وجہ ہے کہ جنگِ عظیم اوّل کے اختتام کے ساتھ ہی بالشویک انقلاب کا پہیہ چلنا شروع ہو گیا۔ "شطرنج کے مہرے" کے مصنّف ولیم گائی کار کی تحقیق کے مطابق زار شاہی نظام کی تباہی اور اشتراکی انقلاب کی کامیابی یہودی ذہن کی مرہونِ منّت ہے۔ اشتراکیت کے نظریاتی بانی کارل مارکس اور اس کو "اشتراکی جماعت کے منشور (MANEFESTO OF

COMMUNIST PARTY) کی شکل دینے والے ہیگل سے لے کر اشتراکی روس کے بانی کامریڈ لینن تک تمام افراد کا تعلّق یہودیّت سے ہی تھا۔ یہی وجہ ہے جہاں اس نظام کو قائم کرنے میں یہودی فکر اور مادی وسائل کام آتے رہے وہاں اس کے قیام سے قبل قائم زار شاہی نظام کو ڈھانے اور تباہی کے دہانے تک پہنچانے کے لئے بھی عالمی یہودیت نے ہی فیصلہ کن کردار ادا کیا۔ اشتراکی انقلاب اور اس کے نتیجے میں قائم ہونے والی ریاست کے بعد روس کے ارد گرد ایسا آہنی پردہ تن گیا کہ اس کے آر پار دیکھنا ممکن ہی نہ رہا۔ اس سے پہلے قائم نظام کی تباہی میں کن لوگوں نے حصّہ لیا' کس کے ذہن نے منصوبہ بندی کی اور پھر کس طرح اس منصوبہ بندی کو عملی جامہ پہنایا گیا' اس بارے میں زیادہ معلومات نہیں ہیں لیکن اب تک اس آہنی پردے سے چھن کر حاصل ہونے والی معلومات سے جہاں منشویک پارٹی کے برپا کردہ انقلاب کو سرخ انقلاب میں تبدیل کرنے والے ان ۱۲۰ افراد کے ناموں کا پتہ چلا ہے جو جرمنی سے ایک ٹرین میں بیٹھ کر ماسکو وارد ہوئے تھے' اور پھر انھوں نے انقلاب کے پہیّے کو اس طرح گھمایا کہ وہ اشتراکی سلطنت کے قیام پر منتج ہوا۔ لینن بھی اسی ٹرین میں سوار ہو کر ماسکو تک پہنچا تھا۔ ان ۱۲۰ افراد میں سے ۱۸۲ افراد کی شناخت ہو چکی ہے اور وہ سارے کے سارے یہودی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد اشتراکی روس پوری دنیا میں صیہونیت کے پھیلاؤ اور تنظیم و تائید کے لئے ایک مرکز کی حیثیت اختیار کر گیا وہاں یہ بات بھی معلوم ہو چکی ہے کہ راسپوتین بھی یہودیوں کا تخلیق کردہ ایک کردار تھا' جس نے مذہب کی آڑ میں سیاسی کردار ادا کیا تھا۔

زار شاہی روس کا خاتمہ دراصل رومی اور بازنطینی عیسائی سلطنتوں کے خاتمے کے بعد تیسری بڑی عیسائی سلطنت کا خاتمہ ثابت ہوا۔ عیسائی زار شاہی کو "تیسرا روم" قرار دیتے تھے۔ روسی پادری واضح طور پر ماسکو کو اصل روم تصوّر کرنے لگے تھے۔ ماسکو کے شہزادے نے جب زار (بادشاہ) کا لقب اختیار کیا تو اس وقت کلیسائے روس نے خوشی کا اظہار کیا۔ زار ویسلائی سوم کے نام ایک راہب نے تہنیّت کا خط تحریر کیا جس میں اس نے زار کو مبارکباد دینے کے بعد لکھا " وہ روم (سلطنت روما جسے عربوں نے ختم کیا اور سلطنتِ بازنطین جسے ترکانِ عثمان نے تاراج کیا تھا) ختم ہو چکے اور ہمارا تیسرا روم ماسکو قائم و دائم ہے۔ اب چوتھا روم کبھی نہیں بن سکے گا۔ اس سلطنت میں ہمارے کلیسا کی روشنی سورج کی روشنی سے زیادہ آب و تاب کے ساتھ چمک رہی ہے۔ تمام دنیا میں آپ واحد عیسائی زار ہیں"[ل] ۱۵۴۷ء میں آئیوان چہارم کو

۔۔۔ل ہسٹری آف رشیا از وی کلوچوسکی مطبع نیویارک ۱۹۱۲ء ص نمبر ۲۳

زار کے طور پر تخت نشین کروانے کا سہرا بھی کلیسا کے سر بندھتا ہے ماسکووی ریاست مذہبی و سیاسی امتزاج کا ایک بہترین نمونہ تھی جس میں قدیم روسی شہزادوں کی شان و شوکت کے ساتھ ساتھ منگول اور بازنطینی نظریات بھی شامل ہو گئے تھے۔ ایک طرف منگولوں کی طرح زار بھی اپنے آپ کو عوام کے جان و مال کا مالک سمجھتے تھے اور دوسری طرف باز نطینیوں کی طرح عوام کی "روحانی بالیدگی" بھی انہی کے ذمّے تھی۔ جب یہ دونوں روایات زار شاہی روس میں جمع ہوئیں تو زاروں کا "عوامی ملکیت" اور "خدائی قوت کے دنیاوی مظہر" کے دعوؤں نے مجموعی طور پر زار کو تمام حقوق کا مستحق بنا دیا جس کے نتیجے میں عوام کے ذمّے محض فرائض آئے، جبکہ زار پر ان کا حق تسلیم نہیں کیا گیا۔ اس سارے نظام میں زار شاہی اور کلیسا تو مفاد یافتہ طبقے بن گئے جبکہ عوام پستے رہے، بلکہ زار کی عسکری مشینری کو چلانے کے لئے ایندھن تو عوام بنتے رہے لیکن مفادات کلیسا اٹھاتا رہا۔ کلیسا کو اس بات سے اطمینان تھا کہ زار کا سایہ ان پر قائم ہے اور آسمانی برکتیں زار کے ذریعے ان تک پہنچ رہی ہیں۔ لیکن جب بالشویک انقلاب کے بعد اشتراکی ریاست کے قیام کی وجہ سے زار شاہی کے خاتمے اور آسمانی ثمرات کی ترسیل بند ہو گئی تو عیسائی مذہبی رہنما پریشان ہو گئے کیونکہ زار شاہی کے خاتمے کے بعد نہ صرف ماسکو میں قائم "تیسرا روم" ختم ہو چکا تھا بلکہ یہودیت کو طویل عرصے کے بعد عیسائی ریاست میں نقب لگا کر "پناہ" حاصل ہو گئی تھی۔

لینن اور سٹالن سے لے کر لیونڈ بر ژنیف اور آندروپوف و کانسٹنٹن چرننکو تک اشتراکی روس کا کردار یہودی نواز رہا۔ ۱۹۴۸ء میں دور جدید کی پہلی یہودی ریاست کے قیام کے وقت سوویت یونین کا کردار موافق رہا اسرائیل کے قیام کے وقت سب زیادہ افرادی قوت سوویت یونین نے ہی مہیا کی۔ اوّلین اسرائیلی قیادت بشمول وزیر اعظم گولڈا میئر، موشے دایاں اور بیگن جیسے قد آور لیڈروں کا تعلق بھی اشتراکی روس سے ہی تھا۔ اشتراکی قیادت نے باوجود پابندیوں کے روسی یہودیوں کو اسرائیل کی طرف ہجرت کرنے اور اپنے اسباب لے جانے کی نہ صرف اجازت دی بلکہ سہولیات بھی مہیا کیں۔ اشتراکی روس میں کلیسا کی ریاستی طاقت و حمایت بالکل ختم نہیں ہوئی بلکہ اشتراکیوں کے قہر و جبر میں دب کر رہ گئی۔ ریاستی امور میں ان کا عمل دخل مکمل طور پر نہ سہی لیکن بظاہر مکمل طور پر ختم ہو گیا تھا۔ عیسائیت نے اپنی ابتدا سے ہی کیونکہ ریاستی قہر و جبر میں زندہ رہنے کا فن سیکھ لیا تھا اس لئے اشتراکی خون آشامیوں کے دوران بھی کلیسائی زندہ رہے اور یہودی نواز اشتراکیوں کے ساتھ ساتھ خاموشی سے چلتے رہے۔ پھر جونہی انہیں سر اٹھانے کا موقع ملا تو انہوں نے بڑی بے جگری کے ساتھ اشتراکی نظام کے ساتھ معرکہ آرائی

کی۔ گورباچوف کے عروج وزوال اور پھر بورس یلسن کو عالمی منظر پر نمایاں کرنے میں کلیسائی منصوبہ بندی کے علاوہ یہودی دشمن امریکی ڈیموکریٹک پارٹی کا بھی موثر کردار شامل ہے۔

برژنیف کے انتقال کے بعد نومبر ۱۹۸۲ء میں آندروپوف نے اقتدار سنبھالا تو اشتراکی روس کی ریاستی مشینری میں موجود تضادات ابھر رہے تھے۔ ابھی نئی قیادت ان پر قابو پانے کا بندوبست کر ہی رہی تھی کہ وہ بھی اگلے جہاں چل نکلی۔ فروری ۱۹۸۴ء میں کانسٹنٹائن چرننکو نے روسی قیادت سنبھالی لیکن مارچ ۱۹۸۵ء میں وہ بھی چل بسے اور پھر اشتراکی روس کی تاریخ میں گورباچوف کی صورت میں ایک نوجوان قیادت ابھری جو یہودیت نواز نہیں بلکہ مذہب پرست (عیسائی) تھی۔ گورباچوف کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ترکی الاصل ہیں اور ان کی نانی کا تعلق کسی ترک مسلم قبیلے سے تھا۔ بحر حال اس میں حقیقت ہو یا افسانوی رنگ لیکن یہ بات مسلّم ہے کہ گورباچوف کے دورِ حکومت میں اشتراکیّت کی وہ خون آشامی کم ہو گئی جو یہودیوں کی سازشوں سے عبارت تھی۔ لیکن اس عیسائی یہودی کشمکش کے دوران میں ایک بات بڑی واضح رہی کہ اسلام دشمنی اور مُسلم کشی کے متعلق ہر دو فریقین میں نظر و عمل کا اتحاد قائم رہا۔ یہی وجہ ہے کہ خلیجی جنگ کے دوران اتحادی افواج کو کسی بھی اشتراکی سپر طاقت یا عام ریاست کی طرف سے سفارتی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ حتّٰی کہ عراقی بعث قیادت کے ساتھ اشتراکی روس کے طویل دوستانہ مراسم ہونے کے باوجود اتحادیوں کی جارحیّت کے وقت عراق کو اپنے اشتراکی دوستوں کی طرف سے کوئی اخلاقی وسفارتی یا مادی امداد نہ مل سکی' اور اس طرح بالواسطہ طور پر انہوں نے امریکہ کی مدد کی کہ وہ اسرائیل دشمن عراقی قوت کا سر کچل سکے۔ یہ الگ بات ہے کہ عملاً شاید ایسا ممکن نہیں ہو سکا کیونکہ عراق زیادہ ہی سخت جان نکلا اور تین درجن سے زیادہ ممالک کی اتحادی افواج کی عسکری جارحیّت کے علی الرغم ابھی تک نہ صرف زندہ ہے بلکہ امریکہ اس کی سلحی وجوہری طاقت سے بُری طرح خائف ہے۔

۱۹۱۷ء روس میں بالشویک انقلاب کے ذریعے زارشاہی کا خاتمہ ہو گیا۔ پھر اس "تیسرے روم" کے خاتمے کے بعد وہاں اشتراکی غالب آگئے جن کی نظریاتی وسیاسی ساخت وپرداخت میں صیہونی خمیر شامل تھا یہ بات اب کوئی راز نہیں رہی کہ منشویک انقلاب کو بالشویک انقلاب میں بدلنے کا سہرا لینن کے سر بندھتا ہے جو یہودی الاصل ونسل تھا یہودیوں نے ہی اس کی تربیّت کی اور وہ اسے جرمنی سے ماسکو لے کر آئے اور پھر اس نے یہاں پہنچ کر انقلابی قوّتوں کی قیادت کا خود ساختہ منصب سنبھالا اور اس طرح دنیا کے نقشے پر ایک اشتراکی سلطنت اُبھری جس

نے ستر سال تک اہلِ اسلام کا ناطقہ بند کئے رکھا۔ اشتراکی سوویت یونین میں یہودیوں کے ریاستی رسوخ اور اسے عالمِ اسلام کے خلاف مؤثر انداز میں استعمال کرنے کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ برژنیف کے دورِ سربراہی میں جس پریذیڈیم نے افغانستان پر چڑھائی کا فیصلہ کیا تھا اس کے ۱۱۹ ارکان میں سے ۱۱۴ کا تعلق یہودیت سے تھا یہ کوئی حُسنِ اتفاق نہیں بلکہ صیہونی تحریک کی طویل مدتی منصوبہ بندی کے نتیجے میں ہوا تھا کہ روسی اشتراکی نظام میں یہودی غالب آئے اور انہوں نے "ریاستی طاقت" کو من مرضی سے استعمال کیا۔ اشتراکی روس کے ذریعے یہودی مشرقی دنیا کو ہی نہیں بلکہ یورپ کو بھی اپنا غلام بنانا چاہتے تھے۔ مسلم ممالک کے خلاف لشکر کشیاں کرتے وقت روسی عیسائی یورپ کو اعتماد میں لیتے رہے ہیں بالخصوص وسط ایشیا میں مہم جُوئی کے دوران تو "تہذیب و تمدّن" کے نام پر جارحیّت کا جواز تلاش کرنے کی بڑی بھونڈی کاوشیں کی جاتی رہی ہیں۔ روسی پرنس گورچاکوف نے وسط ایشیا میں اپنی مہم جوئیوں کے بارے میں روسی سفیروں کو ایک گشتی مراسلہ بھیجا تھا تاکہ یورپی طاقتوں کو روسی عزائم سے باخبر رکھا جائے "روسی قیادت اس بات سے باخبر ہے کہ "سفید آدمی" کے فرائض کیا ہیں یہی خود ساختہ فرائض یا بوجھ یورپی اقوام نے بھی اپنے ذمّے لے رکھے۔ ہیں اس نظریئے کے مطابق سفید آدمی کے فرائضِ منصبی میں یہ بات شامل ہے کہ انسانی آبادیوں کو تاخت و تاراج کرتے ہوئے ان کے گھروں کو جلائے اور ان کے لیڈروں کو پھانسیاں لگائے، انہیں تہذیب و تمدن سے روشناس کروائے یہ عظیم کام ہے جو سفید آدمی کو سرانجام دینا ہے" اسی طرح اور کسی ایک مراسلے میں درج ہے کہ "روس کی وسط ایشیا میں وہی پوزیشن ہے جو ان تمام مہذّب ریاستوں کی ہوگی جنہیں نیم وحشی قبائل آبادیوں سے سابقہ پیش آتا ہے۔ ان آبادیوں کی کوئی مقررہ معاشرتی تنظیم نہیں ہوتی اس لئے متمدن ریاستیں اس بات پر مجبور ہو جاتی ہیں کہ وہ اپنی سرحدوں کی حفاظت اور تجارتی تعلقات کو باقاعدہ استوار کرنے کے لئے ان وحشی قبائل اور ناپسندیدہ غیر مہذّب پڑوسیوں کے اوپر اپنی بالادستی قائم کرے۔ یہی وجہ ہے یورپ روسیوں کا مدد گار رہا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ روسیوں نے مشرقی یورپ کی طرف بھی پیش قدمی جاری رکھی۔ جنگِ عظیم اوّل کے بعد خلافتِ عثمانیہ کے علاقوں کی بندر بانٹ کے ذریعے اس سمت میں روسی حلقہ اثر خود بخود پھیل گیا اور دوسری جنگِ عظیم کے بعد بھی "جنگِ عظیم کے دوران ہٹلر کی نازی افواج قاہرہ کو تین سال تک روسی سرد جہنم میں روکے رکھنے اور پھر فطرت کے ہاتھوں شکست سے دوچار کروانے کے بدلے میں "اشتراکی روسیوں کو یورپ کی مشرق و مغرب میں تقسیم کے ذریعے معقول حصہ ملا جس کی وجہ سے

سوویت یونین کا حلقہ اثر یورپ تک پہنچ گیا تھا اس کے بعد رہی سہی کسر اشتراکی فوجی ٹینکوں نے پوری کر دی یوں مشرقی یورپ پر بھی اشتراکیوں نے دانت تیز کئے۔ بلغاریہ، ہنگری اور چیکوسلواکیہ کے علاوہ رومانیہ پر بھی اشتراکی جھنڈے لہرا دیئے۔ یورپی اور امریکی سوائے مذمتوں کے اور کچھ بھی نہ کر سکے "معاہدہ وارسا" (WARSAW PACT) کے ذریعے کئی اور ممالک کے آب و زمینی وسائل و نقل و حمل کے ذرائع پر گرفت مضبوط کر لی تھی۔ یورپ کی طرف اشتراکی روس کی آخری پیش رفت پولینڈ کی جانب تھی جہاں ستر کی دہائی کے آخر میں روس نے "اینٹی کمیونسٹ" (ANTI COMMUNIST) مزدور تحریک کو بُری طرح کچل کر وہاں پر بھی اپنی گرفت مضبوط کر لی تھی۔ اگر ماسکو نواز پولش حکومت مزدوروں کی اس تحریک "سالیڈیریٹی" کو کچل نہ دیتی تو روسی ٹینک پولینڈ کو بھی روندڈالنے کے لئے تیار کھڑے تھے۔ مغربی دنیا بشمول امریکہ میں اتنا دم خم نہیں تھا کہ وہ روس کی کسی نئی عسکری جارحیّت کا مؤثّر جواب دے سکتی جس کا عملی مظاہرہ افغانستان میں روسی افواج کے داخلے کے بعد مغربی و امریکی حکمرانوں نے "مذمتی بیانات" جاری کر کے کیا۔ روسی قیادت نے پولینڈ میں مغربی عیسائی دنیا کے ساتھ نبرد آزما ہو کر دیکھ لیا تھا کہ ان میں اشتراکی روس کے ساتھ "پنجہ آزمائی" کا حوصلہ نہیں۔ ہے مغربی دنیا نفسیاتی طور پر اشتراکی روس سے خائف تھی امریکی ویت نام میں اپنی عسکری ہزیمت کے زخم ابھی چاٹ رہے تھے اس لئے وہ کسی نئی مہم جُوئی کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ پولینڈ کے بعد اشتراکی روس نے ایران میں امریکیوں کا بوریا بستر گول ہونے سے پیدا ہونے والے خلا کو فوری طور پر پورا کرنے میں ایک بھی لمحے کی تاخیر نہیں کی اور ۲۷ دسمبر ۱۹۷۹ء ایک لاکھ روسی افواج افغانستان میں داخل کر دیں۔ اب بحیرہ ہند اور بحیرہ عرب روسی طیاروں کی زد میں آ گئے تھے۔ خلیج فارس بھی، جہاں سے مغربی دنیا کو سپلائی کئے جانے والے تین چوتھائی تیل کی پائپ لائنیں گزرتی ہیں۔ روسی توپوں کی زد میں آ گئی تھی۔ علاقے میں طاقت کا توازن بگڑ گیا تھا ایران میں ماسکو نواز تودہ پارٹی۔ اور بھارت میں کانگریس پارٹی فعال اور متحرک تھیں۔ پاکستان میں ذوالفقار علی بُھٹّو کی پھانسی کے بعد ضیاء حکومت کو شدید اپوزیشن کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا پاکستان کی امریکی امداد بھی عرصے سے بند تھی صورتحال مجموعی طور پر روس کے حق میں تھی۔

افغانستان میں بھی ماسکو نواز پیپلز ڈیموکریٹک پارٹی حکمران تھی افغان آرمی اور ایئر فورس میں بھی اشتراکی کلیدی آسامیوں پر تعینات تھے۔ اس لئے دسمبر ۱۹۷۹ء میں روسی افواج کا افغانستان میں داخلے کا فیصلہ بروقت تھا۔ امریکی پہلے ہی افغانستان کو "روسی حلقہ اثر" میں سمجھتے

تھے۔ روسی مشیر مدّت سے یہاں مصروفِ عمل تھے۔ روس کے ساتھ افغانوں کے دوستی وتعاون کے کئی معاہدے بھی موجود تھے۔ سب سے بڑھ کر روس افغان سرحدیں ملتی تھیں اور اشتراکیوں نے اپنی ساٹھ سالہ تاریخ میں عسکری طور پر اٹھے ہوئے قدم واپس نہیں لوٹائے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب روسی افواج افغانستان میں داخل ہوئیں تو اسے معمول کی کارروائی سمجھ کر امریکہ نے "روایتی ودفتری" مذمتی بیانات ہی جاری کئے اور افغانستان کو روسیوں کے چنگل سے چھڑانے کے لئے کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا۔ ویسے بھی امریکہ میں ڈیموکریٹ برسرِاقتدار تھے جنہیں اپنی یہود نواز پالیسیوں کی وجہ سے اشتراکی روس کے مسلم کش اقدامات کے بارے میں تشویش بھی نہیں تھی ویسے اگر انہیں تشویش ہوتی بھی تو وہ کیا کر لیتے امریکی حکّام اشتراکیوں کی پے درپے کامیابیوں کی وجہ سے نفسیاتی طور پر بھی احساسِ کمتری کا شکار ہو چکے تھے۔

139

بھٹو حکمت یار تعلقات کی حقیقت

مزاحمتی تحریک کی ابتداء کے متعلق مبنی بر حقائق تجزیہ

۱۴۱

تحریکِ مزاحمت کاایک دور وہ ہے جو سردار محمد داؤد کے دورِ حکومت تک جاری رہا۔ جس میں ''پشتونستان'' کے مسئلے پر داؤد کے خلاف تحریکِ مزاحمت کو ذوالفقار علی بھٹّو کی حکومت مدد فراہم کرتی رہی۔ اس دور میں انجینئر گلبدین حکمت یار نے اپنی حزب اسلامی کی تنظیمی بنیادیں یہاں پاکستان میں مضبوط کیں۔ اسی دور میں پروفیسر برہان الدین ربانی نے جماعت اسلامی کی قیادت سے تعلقات استوار کیے۔ پشاور میں قاضی حسین احمد (جواب جماعت کے امیر بن چکے ہیں) سے ان کے تعلقات کی ابتداء بھی اسی دور میں ہوئی۔ لیکن پھر بھٹّو، داؤد مذاکرات شروع ہو گئے اور تحریکِ مزاحمت کی پشت پناہی میں کمی واقع ہوئی۔ ادھر افغانستان میں داؤد حکومت کا خاتمہ ہوااور اشتراکی دور کا آغاز ہو گیا۔ اس سے پہلے ۱۹۷۷ء میں یہاں بھٹّو کی حکومت کاخاتمہ ہو گیاتھا تحریکِ مزاحمت کی خفیہ مدد کا سلسلہ بھی بند ہو چکاتھا۔ مزاحمتی افغانوں اور حکومتِ پاکستان کے درمیان واحد رابطہ، میجر جنزل نصیراللہ بابر (جو بھٹّو دور حکومت میں گورنر سرحد اور بے نظیر دَور حکومت میں وزیر اعظم کے مشیرِ اعلیٰ رہ چکے ہیں) بھی مارشل لائی حکّام کی تحویل میں تھے۔ تحریکِ مزاحمت کی حمایت مکمل بند کی جاچکی تھی۔ حتیٰ کہ جنرل ضیاء الحق نئی حکومت سے تعلّقات بحال کرنے اور بہتر بنانے کی کاوشوں میں مصروف تھے۔ اس دور میں تحریکِ مزاحمت بغیر کسی امداد کے بڑے مؤثّر انداز میں چل رہی تھی۔ ایران میں امام خمینی کے ماننے والے امریکی شاہ کے خلاف

ایران میں مورچہ زن تھے۔ اس لئے وہاں سے بھی انہیں کسی قسم کی امداد نہیں مل سکتی تھی۔ لیکن اس دور میں بھی تحریک مزاحمت بڑے بڑے آپریشن کر رہی تھی۔ ھرات' پکتیا 'ننگر ھار' جلال آباد اور کابل کے علاوہ دیگر کئی مقامات پر بھی یہ لوگ گوریلا سرگرمیوں کے ذریعے نور محمد ترکئی اور حفیظ اللہ امین حکومتوں کے خلاف بڑے کامیاب معرکے سرانجام دے رہے تھے۔ سوویت فوجی مشیروں اور کے جی بی کے ماہرین کی کابل میں موجودگی کے باوجود گوریلا طرز کی مزاحمتی کاروائیاں اپنا رنگ دکھا رہی تھیں۔ مسعود پنج شیری (جو آج کل احمد شاہ مسعود کے نام سے بین الاقوامی پریس پر چھایا ہوا ہے)' گلبدین (انجینئر گلبدین حکمت یار) اور استاد ربانی (پروفیسر برہان الدین ربانی) جیسے قوم پرست افغان مسلمان 'لادین اور ماسکو نواز حکمرانوں کے خلاف بڑے مؤثر انداز میں لڑ رہے تھے۔ یہ دوسرا دور ببرک کارمل کے اقتدار میں آتے ہی ختم ہو گیا۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ یہ دور اپنے تیسرے مرحلے میں داخل ہو گیا۔ ظالم اور مظلوم کھل کر سامنے آ گئے۔ جارح اور اس کا شکار واضح طور پر ایک دوسرے کے سامنے آ گئے۔ اشتراکی سُرخ افواج اور ان کو للکارنے والے بظاہر بے سہارا لیکن دولت ایمانی اور جذبۂ حریّت فکر و عمل سے لیس افغان قوم ایک دوسرے کے مقابلے میں صف آرا ہو گئے۔ برطانوی افواج کے چلے جانے کے بعد زاروں کے دور سے شروع "چھپا ہوا کھیل" جسے اشتراکیوں نے دوستی اور اقتصادی و فوجی تعاون کے معاہدوں کی آڑ میں نصف صدی سے زائد عرصہ پہلے شروع کر رکھا تھا' اب اپنے کھلاڑیوں سمیت سامنے آ گیا تھا۔ کفر اور الحاد دوستی و تعاون کے تمام پردوں سے نکل کر واضح انداز میں سامنے آ گیا تھا۔ دوسری طرف داؤد' نور محمد ترکئی اور حفیظ اللہ امین کے ادوارِ حکمرانی میں جاری رہنے والی تحریکِ مزاحمت نے ببرک کارمل کے اقتدار میں آتے ہی ایک ایسا موڑ کاٹا کہ پھر ایک نیا سفر شروع ہو گیا' جس میں افغان مسلمان اور اشتراکی فوج حق و باطل کی صُورت میں معرکہ زن ہو گئے۔ حتیٰ کہ ۱۹۸۸ء میں جارح اشتراکیوں کو یہاں سے "افغانستان میں لشکر کشی کی غلطی" کا اعتراف کرنے کے بعد ذلیل و رسوا ہو کر جانا پڑا اس کے بعد نیا دور شروع ہوا جو ابھی تک جاری ہے۔ تحریکِ مزاحمت کا یہ حتمی اور فیصلہ کن دور ہے جس میں طویل مزاحمتی جدوجہد نے حتمی و منطقی انجام تک پہنچنا ہے۔ حتمی انجام کے بارے میں تو دو آرا ہو سکتی ہیں' لیکن منطقی انجام اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ جدوجہد کو اس نکتے تک پہنچایا جائے جو تحریک کی ابتدا میں "نشانِ منزل" کے طور پر تحریک کے قائدین کے پیشِ نظر تھا۔ اگر ظاہر شاہی دور حکومت (۷۳' ۱۹۳۳ء) میں بننے والی انتظامی وزارتوں کا مطالعہ کیا جائے تو طویل ترین وزارت سردار محمد داؤد

خان (۱۹۶۳ء ' ۱۵۵۳ء) کی ہے۔ اس کے بعد (۱۹۷۸ء ' ۱۹۷۳ء) بھی سردار محمد داؤد خان کا دورِ حکومت ہے جس میں وہ افغانستان کے سیاہ وسفید کا مالک بنا رہا۔ اس کے ابتدائی دور میں مسلم تحریکِ مزاحمت کی ابتدا ہوئی۔ داؤد کی ظالمانہ اور سیکولر پالیسیوں کے خلاف عوام میں ایک مزاحمتی جذبہ پیدا ہوا جس نے ایک منتشر اور غیر مربوط تحریک کی صورت اختیار کر لی۔ نہ صرف داخلی سطح پر بلکہ خارجی میدان میں بھی سردار محمد داؤد خان حکومت 'مسلم بلاک کے قریب رہنے کی بجائے لادینی ونیم اشتراکی ممالک کے قریب رہی۔ مثلاً سردار محمد داؤد خان نے بھارت کے مقابلے میں پاکستان کے ساتھ مخاصمانہ رویّہ اختیار کیا۔ "پشتونستان" کے مسئلے پر پاکستان میں موجود مرکز گریز اور بھارت نواز عناصر کی پشت پناہی کی۔ ولی خان ' غفار خان اور اجمل خٹک کے علاوہ اسی قبیل کے پشتون وبلوچ لیڈروں کو افغان حکومت نے نہ صرف مادی اور مالی معاونت مہیا کی ' بلکہ ذرائع ابلاغ کے سہارے ان باغی لیڈروں کو "انقلابی لیڈروں" کے طور پر پیش کیا۔ ریڈیو کابل ' کابل ٹی وی اور دیگر سرکاری اخبارات نے ایسے لیڈروں کو خوب اچھالا۔ یہ بات ایسی تھی کہ عام افغان مسلمان کی سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ ہماری حکومت (داؤد سے لے کر ببرک کارمل تک) ہندوؤں اور غیر مسلموں سے تو دوستی قائم رکھتی ہے ' لیکن پاکستان جیسے برادر اسلامی ملک کے ساتھ ہر وقت ان بن رہتی ہے۔ کبھی پشتونستان کے مسئلے پر پاکستان میں بھارت نواز عناصر کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے اور کبھی بہانے بہانے سے پاک مسلم افواج کے ساتھ جھڑپیں شروع کر دی جاتی ہیں۔ پھر وہی افغان جب داخلی محاذ پر پرچمیوں اور خلقیوں کے ایوانِ اقتدار میں حکمرانوں کے ساتھ آنکھ مچولی کا مشاہدہ کرتے تو انہیں حکمرانوں کا ایک نئی طرز کا رویّہ دیکھنے کو ملتا۔ افغان حکمران اشتراکیت کی پروردہ پیپلز ڈیموکریٹک پارٹی آف افغانستان کے پرچمی و خلقی دھڑے سے تعاون حاصل کرنے کیلئے بے قرار دکھائی دیتے لیکن پاکستان کے ساتھ دشمنی ان سب فریقین میں مشترک تھی۔ ان وجوہات نے مل جل کر تحریکِ مزاحمت کی نظریاتی بنیادوں کو مضبوط کیا۔ اس کے علاوہ ان حکمرانوں کی مغرب نوازی کے علاوہ الحادی روس کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے اپنائی جانے والی پالیسیوں نے بھی ایوانِ اقتدار میں براجمان شخصیتوں اور ان کے نظریات کے خلاف افغان عوام کے جذبات کو پختہ کیا۔ مخالف جذبات کا لاوا اس وقت مزید ابلا جب ظاہر شاہی نظام کا خاتمہ کرنے کے بعد سردار محمد داؤد نے افغانستان کے اقتدار کی کرسی خود سنبھالی اور افغانوں پر سختیوں کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ یہاں پاکستان میں بھٹو حکومت قائم تھی جس نے طویل عرصے کے بعد ملک کو نیا آئین یا دستور دیا تھا۔ سقوطِ مشرقی

پاکستان کی وجہ سے پاکستانیوں کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی مایوسی کی گرد نئے آئین کی وجہ سے کسی حد تک بیٹھ گئی تھی۔ تمام سیاسی اور مذہبی رہنماؤں نے اس دستور کی تہذیب و ترتیب میں مل جُل کر حصّہ لیا تھا۔ مولانا مودودی جیسی اکابر دینی شخصیات سے لے کر مولانا مفتی محمود اور مولانا شاہ احمد نورانی جیسے رہنماؤں نے اس دستور کو باقیماندہ پاکستان کی فلاح و بہبود کیلئے ہی نہیں بلکہ اسلامی نظام کے قیام کی طرف ایک پیش رفت قرار دیا تھا۔ ذوالفقار علی بھٹّو "نئے پاکستان" کو ایک فلاحی مملکت بنانے کا عزم لئے ہوئے تھے۔ تمام سیاسی جماعتوں کا تعاون بھی انہیں حاصل تھا۔ اس لئے افغانستان میں برپا ہونے والے "انقلابِ ثور" کا انہوں نے سنجیدگی سے نوٹس لیا۔ اس وقت صوبہ سرحد کے گورنر اور اپنے معتمد خاص جنرل نصیر اللہ بابر کو نئے حالات کا جائزہ لینے کا حکم دیا' کیونکہ افغانستان میں ہونے والی اس تازہ ترین تبدیلی کے تناظر میں ذوالفقار علی بھٹو نے اپنی سیاسی فہم و فہراست کی بنیاد پر یہ محسوس کر لیا تھا کہ اب افغانستان تبدیلیوں کی زد میں رہے گا۔ ان کی یہ سوچ کسی الہامی اشارے یا فلکیاتی جمع تفریق کے حوالے سے نہیں تھی 'بلکہ تھوڑی بہت سیاسی سُوجھ بُوجھ اور افغان معاملات پر نظر رکھنے والا دانشور بھی یہ بات آسانی سے سمجھ سکتا تھا کہ "بادشاہت" کے قیام و بقا کی صُورت میں یہ بات سب کو پتہ ہوتی ہے کہ "موجودہ بادشاہ" کے بعد کون حکمران ہو گا۔ لیکن ظاہر شاہ کے منظر سے ہٹائے جانے کے بعد غیر معروف لوگ اقتدار کے کھیل میں شریک ہو گئے تھے۔ سردار محمد داؤد نے اقتدار سنبھالنے کے بعد جو اندازِ فکر و عمل اختیار کیا تھا اس سے سنجیدگی اور پختگی کی بجائے "جلد بازی" اور "بچپنے" کا اظہار ہوتا تھا۔ دوسری طرف ایران بھی تبدیلیوں کی زد میں تھا۔ وہاں خمینی کی تحریک نے بھی کسی حد تک پر پُرزے نکال لئے تھے۔ شہنشاہِ ایران امریکی ہتھیاروں کی بنیاد پر بڑی حد تک ایک فوجی قوّت بن چکا تھا لیکن وہاں "شاہ پرستی" "ساواک" کے مظالم کی وجہ سے دب چکی تھی۔ اسرائیلی مشن یہاں مسلمانوں کے خلاف سرگرم تھے 'اس لئے بڑھتے ہوئے مذہبی جذبات کو جس قدر زیادہ دبایا جاتا وہ اسی قدر زیادہ قوّت سے بھڑکتے چلے گئے۔ چین میں بھی "عظیم قیادت" بوڑھی ہو چکی تھی۔ ماؤزے تنگ اگلے جہاں سدھار چکے تھے۔ چواین لائی زیادہ فعال نہیں تھے۔ علاقے کی مجموعی صورتحال کسی بڑی تبدیلی کا اشارہ دے رہی تھی۔ مئی ۱۹۷۴ء میں ہندوستان نے ایٹمی دھماکہ کر کے نئی صورتحال پیدا کر دی تھی۔ اس کے برادبھارتی وزیراعظم مسز اندار گاندھی نے "ایٹمی دھماکے" کو اپنی قوم کا قانونی حق قرار دیتے ہوئے اقوامِ متحدہ کے ایٹمی دھماکوں پر پابندی کی قرارداد پر دستخط کرنے سے بھی انکار کر دیا تھا۔ اس وقت بنگلہ دیش بھی مسائل کا شکار تھا۔

اقتصادی مسائل نے بنگالی قوم کو ایک بار پھر ہندوؤں کے خلاف سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ شیخ مجیب الرحمٰن بنگالیوں کے "بابائے قوم" بننے کے باوجود ناکام حکمران ثابت ہو چکے تھے۔ اپنی ناکامیوں پر پردہ ڈالنے کیلئے دسمبر ۱۹۷۴ء میں انہوں نے آئین معطل کر دیا لیکن حالات اس قدر بگڑ چکے تھے کہ اگلے سال اگست کے وسط میں شیخ صاحب کو فوج کے افسروں نے ان کے خاندان سمیت قتل کر دیا۔ اسی سال اندرا گاندھی نے اپنے ملک میں ایمرجنسی نافذ کرنے کا اعلان بھی کر دیا تھا۔ کیونکہ اپوزیشن اندرا حکومت کے اس قدر خلاف ہو چکی تھی کہ حکومت بچانے کیلئے اندرا کے پاس اس کے علاوہ کوئی دوسرا چارہ کار نہیں تھا۔ پاکستان میں الیکشنوں کے نتیجے میں مرکز کے علاوہ سندھ اور پنجاب میں پیپلز پارٹی کی حکومت قائم ہوئی تھی جبکہ سرحد اور بلوچستان میں اپوزیشن پارٹیوں بشمول نیشنل عوامی پارٹی اور جے یو آئی کی مخلوط حکومتیں قائم ہوئیں۔ اسی دور میں "پشتونستان" کے ساتھ ساتھ "عظیم بلوچستان" جیسی علیحدگی پسند تحریک بھی شروع ہو گئی تھی۔ سوویت یونین جو افغانستان کے ایوانِ اقتدار میں نقب لگانے میں کامیاب ہو چکا تھا پاکستان میں بھی ایسی ہی علیحدگی پسند تحریکوں کی آبیاری کے ذریعے مرکز کو کمزور کرنا چاہتا' تھا تاکہ یہاں بھی اپنا حلقہ اثر بڑھا سکے۔ ۱۹۷۳ء میں انقلابِ ثور کے بعد یہ تحریکیں اور بھی زیادہ تشدّد ہو گئی تھیں۔ بھٹو حکومت نے نہ صرف صوبائی حکومتوں کو ختم کیا بلکہ نیپ کو خلافِ قانون قرار دے دیا۔ اس کے ساتھ ہی علیحدگی پسندوں کے خلاف فوجی ایکشن شروع ہوا جو ۱۹۷۶ء تک جاری رہا۔ دوسری طرف ذوالفقار علی بھٹو نے گورنر سرحد کو ایک ایسی ریسرچ رپورٹ تیار کرنے کا حکم دیا جس میں ملکی اور بدلتے ہوئے خارجی حالات کے وسیع تر تناظر میں آئندہ کا لائحہ عمل تجویز کیا گیا ہو۔ جنرل نصیر اللہ بابر ان علاقوں میں کافی عرصے سے سرکاری ذمہ داریاں نبھاتے چلے آ رہے۔ تھے وہ JCO - ۲ آف سیون ڈویژن کے ساتھ یہاں ۱۹۶۰ء میں پوسٹ ہو کر آئے تھے۔ ۱۹۶۲ء کے تاریخی باجوڑ آپریشن میں بھی شامل تھے۔ کچھ عرصہ انہوں نے یہاں انسپکٹر جنرل فرنٹیئر کانسٹیبلری کے طور پر بھی گزارا تھا۔ اسی دوران جب بھٹو صاحب نے قبائلی علاقوں کا دورہ کیا تو ان کی نصیر اللہ بابر سے شناسائی ہوئی۔ ان کے جوش و جذبے کو دیکھتے ہوئے بھٹو صاحب نے ان سے تفصیلاً ملاقاتیں کیں اور اس علاقے کی دفاعی اور سیاسی اہمیت کے بارے میں سیر حاصل معلومات حاصل کیں۔ ۱۹۷۲ء میں انہیں فوج سے ریٹائر کر کے صوبہ سرحد کا گورنر لگا دیا گیا۔ جنرل نصیر اللہ بابر اپنے دَورِ گورنری کی کارکردگی پر بڑے فخر کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ ان کے بقول "میں جب ۱۹۷۲ء میں گورنر بن کر یہاں آیا تو قبائلی ایجنسیوں کا بجٹ ۴۴ لاکھ تھا' لیکن

جب ۱۹۷۷ء میں گورنر ہاؤس کو خیرباد کہا تو یہ بجٹ ۳۲ کروڑ تک جا پہنچا تھا۔ اس ۳۲ کروڑ کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اس وقت صوبائی ترقیاتی بجٹ ۲۹ کروڑ روپے تھا۔ اس فرق کو دیکھ کر قبائلی ایجنسیوں کی اہمیت کا اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے۔ " انقلابِ ثور کے تناظر میں جنرل نصیر اللہ بابر نے ذوالفقار علی بھٹو کے کہنے پر ایک ریسرچ رپورٹ تیار کرنی شروع کی، پھر اسی رپورٹ کی سفارشات کی بنیاد پر بھٹو حکومت نے اپنی "افغان پالیسی" ترتیب دی۔ اس افغان پالیسی کا مسودہ تو ابھی تک کہیں شائع نہیں ہوا کیونکہ ذوالفقار علی بھٹو دور کے بعد جنرل ضیاء الحق کا طویل دورِ حکومت آیا۔ پھر بے نظیر کا ۲۰ ماہی دور، غلام مصطفیٰ جتوئی کا عبوری دورِ حکومت، پھر میاں محمد نواز شریف کی وزارتِ عظمیٰ، دوسری طرف افغانستان سے روسی افواج کی واپسی، آپریشن جلال آباد میں ناکامی، عبوری حکومت کی تجویز، بینن سیوان پلان اور پھر نجیب اللہ کی اقتدار سے رخصتی جیسے معاملات چلتے رہے ہیں۔ اس لئے حقائق ٹھیک طور پر ابھی منظر عام پر نہیں آ سکے لیکن بغض و عدوات کی گرد جوں جوں بیٹھتی چلی جائے گی حقائق نکھر کر سامنے آتے چلے جائیں گے۔ انقلابِ ثور کے بعد پاکستان نے کیا پالیسی اختیار کی، اس کے خدوخال کیا تھے، اس پالیسی سے کیا مقاصد حاصل ہونے کی توقع تھی، وہ اہداف کہاں تک حاصل ہو سکے؟ یہ ایسے سوالات ہیں جن کے جواب تاریخ کا ایک قرض ہیں جو اتارے بغیر ہم سُرخرُو نہیں ہو سکیں گے۔ اس دور کی افغان پالیسی کے بارے میں جنرل نصیر اللہ بابر نے اپنی یادداشتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے جو باتیں کی ہیں ان سے اس دور کی "افغان پالیسی" کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ان کے بقول "۱۹۷۳ء میں ظاہر شاہی کے خاتمے کے بعد سردار محمد داؤد نے حکومت سنبھالی تو وزیراعظم ذوالفقار بھٹو نے پاکستان کے ردِعمل کے سلسلے میں مجھے پوچھا۔ وہ یہ جاننا چاہتے تھے کہ بدلتے ہوئے حالات میں پاکستان کی خارجہ پالیسی کیا ہونی چاہئے۔ میں نے وسیع تر تناظر میں تحقیق و جستجو کی اور پھر ایک مفصل رپورٹ تیار کی جس میں اس علاقے کی تاریخی و جغرافیائی اہمیت کے علاوہ قبائلی نفسیات کو بھی سامنے رکھا گیا تھا۔ برطانوی سامراج کی ہزیمت کے بعد افغانستان میں روسیوں کی طویل سرگرمیاں اور دلچسپیاں بھی میرے سامنے تھیں۔ ظاہر شاہی کے خاتمے کے بعد حالات نے ایک نئی کروٹ لی تھی لیکن حتمی صورتحال ابھی سامنے نہیں آئی تھی۔ کیا یہ سب کچھ اشتراکیوں کا کیا دھرا تھا کیا روسی اپنا کھیل کھیل چکے تھے یا آخری راؤنڈ کی تیاری کر رہے تھے اس بارے میں ابھی بظاہر کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا لیکن ایک بات بڑی واضح تھی کہ موجودہ صورتحال زیادہ دیر تک برقرار نہیں رہ سکے گی سردار محمد داؤد اپنا آپ ۶۳، ۱۹۵۳ء میں بھی دکھا چکے تھے روسی انہیں پسند

نہیں کرتے تھے۔ اب ۱۹۷۳ء تک اشتراکی عناصر افغانستان میں خاصے فعال ہو چکے تھے۔ داؤد نے مسلمانوں پر ایک بار پھر ظلم ڈھانا شروع کر دیا تھا۔ کابل یونیورسٹی میں اشتراکیوں اور داؤد سرکار کے خلاف تحریکِ مزاحمت نے سر اٹھانا شروع کر دیا تھا۔ ۱۹۷۳ء میں گلبدین حکمت یار وغیرہ پاکستان آ گئے تھے اس سے پہلے حبیب الرحمٰن یہاں آئے تھے لیکن وہ شہید ہو گئے تھے حکمت یار کے بعد گلاب خان ننگر ہاری یہاں آیا۔ میں ان سے پوچھتا تھا کہ تمہارا حقیقی سربراہ کون ہے تمہارے بعد ہم معاملات کس سے طے کریں گے اگر تم کامیاب ہو جاتے ہو تو پھر معاملات کی نگرانی کون کرے گا شروع میں یہ لوگ اس بات کا جواب دینے سے کتراتے تھے لیکن بعد میں یہ لوگ ربانی کو لے کر آئے اور انہیں اپنے بزرگ اور رہنما کے طور پر متعارف کروایا ہم نے انہیں تربیّت دی 'اسلحہ دیا' روپیہ پیسہ دیا اور ہر لحاظ سے مسلّح کر کے واپس بھیجا' کیونکہ یہ بات طے شدہ تھی برطانوی سامراجی حملے ہوں یا اشتراکی افواج کی مداخلت کا خطرہ۔ ہمیشہ شمالی سرحدیں ہی تختہ مشق بنتی رہی ہیں, بھٹو صاحب نے یہ خطرہ ۱۹۷۳ء میں ہی بھانپ لیا تھا یہی وجہ ہے کہ وہ خطرے کے آگے بند باندھنے کیلئے کمربستہ ہو گئے تھے حکمت یار اور اس کے ساتھیوں کی مدد اسی نقطہ نظر سے کی جاتی تھی اب تو جماعت اسلامی بھی روسی ایمپائر کے خاتمے کو تحریکِ مزاحمت کے ہاتھوں ہونے والے شدید روسی نقصانات کے ساتھ وابستہ کر رہی ہے میں بھی اسی نقطہ نظر کا حامی ہوں کہ افغانستان میں روسیوں کو شدید نقصانات اٹھانے پڑے جس کی وجہ سے ان کی معاشی حالت بگڑی اور بالآخر ان کا معاشی ڈھانچہ زیروزبر ہوا۔ امریکہ کو بھی ویتنام میں شدید مالی نقصانات کا بوجھ اٹھانا پڑا اور ویتنام کافی عرصہ تک امریکیوں کے اعصاب پر سوار رہا لیکن وہ اس عظیم معاشی بحران سے بچ نکلے کیونکہ ان کے نظام میں جان تھی جبکہ روسی معیشت افغانستان میں ہونے والے بھاری نقصانات کا بوجھ نہ اٹھا سکی جس کے نتیجے میں ایسی ابتری پھیلی کہ یونین ہی اللہ کو پیاری ہو گئی۔

کسی بھی جارح قوم کو دوسرے ملک پر حملہ آور ہونے کے بعد عموماً دو طرح کے حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایک تو انہیں "کفن کی مسلسل آمد" کا منتظر رہنا ہوتا ہے کیونکہ جارح اور حملہ آور کا جانی نقصان ہمیشہ زیادہ ہوتا ہے دوسرا "مالی نقصانات" کیونکہ جارحیّت میں حملہ آور کی قوت جس قدر زیادہ ہو جارحیت کی کامیابی کا امکان بھی اسی قدر زیادہ ہوتا ہے اس لئے جارح کو زیادہ مالی نقصانات برداشت کرنے کیلئے تیار رہنا چاہئے۔ جو ملک یا معیشت ان نقصانات کو زیادہ بہتر انداز میں خندہ پیشانی سے برداشت کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے وہ بالآخر اپنے مقاصد میں

کامیاب ہو جاتی ہے لیکن روس اس قابل نہیں تھا کیونکہ وہاں کا معاشرتی اور معاشی ڈھانچہ سرکاری انداز میں چلتا تھا اس لئے لوگوں کی زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ پیداواری عمل کو ایک سرکاری ڈیوٹی سمجھ کو انجام دیا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب نقصانات زیادہ ہونے شروع ہوئے اور پیداواری عمل کو تیز کرنے کی ضرورت پیش آئی تو روسی عوام نے تعاون نہیں کیا معاشی مسائل بڑھتے گئے اور بالاخر روسی افواج کو افغانستان میں شکست کا سامنا کرنا پڑا اس دور میں روسی عوام کو ڈالر کی علت پڑ گئی تھی بیشتر روسی غیر ملکیوں سے ڈالر مانگتے پھرتے تھے۔ مجھے کریملن میں ایسے کئی تجربات سے گزرنا پڑا۔

اس کے علاوہ کریملن کی روسی قیادت بھی کچھ SENILE ہو گئی تھی۔ وہ بہتر فیصلے نہیں کر سکی تاریخی اعتبار سے روسی توسیع پسندی کا آغاز تو پیٹر دی گریٹ کے دور سے ہی ہو چکا تھا۔ ۱۷۷۰ء میں یہاں برِ صغیر میں جنگِ پلاسی ہوئی' اور برطانوی توسیع پسندی نے عملی صورت اختیار کی۔ اس طرح معاملات کو تاریخی پس منظر میں دیکھنے سے یہ بات واضح ہو رہی تھی کہ توسیع پسندی جس کا آغاز ۱۷۷۰ء میں ہوا تھا ابھی تک جاری تھی۔ برژنیف نے اس تاریخی عمل میں حصّہ ڈالنا تھا۔ اس کے خیال میں افغانستان کو فتح کر کے روسی سرحدیں خلیج فارس تک لائی جا سکیں گی۔ پھر ایران اور پاکستان کا نمبر آ جانا تھا۔ اور اس طرح روس نے دنیا کے عظیم الشان تیل کے خزانے تک پہنچ کر حقیقی سپر طاقت بن جانا تھا۔ اسی تاریخی پس منظر میں ہم نے حکمت یار کی صفوں کو منظّم کیا۔ ہم نے بجائے پاکستان میں مہاجروں و گوریلوں کو تربیّت دینے کے اس بات کا فیصلہ کیا کہ ان گنے چنے لوگوں کو یہاں تربیّت دی جائے۔ پھر یہ افغانستان میں جا کر خود دوسروں کو تربیّت دیں اور تحریک منظّم کریں۔ ہم نے انہیں خصوصی تربیّت دینی شروع کی۔ یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ ۱۸۹۷ء میں امیر عبدالرحمان کے دور سے افغانستان میں ہتھیاروں پر پابندی عائد ہے۔ کوئی افغانی ہتھیار بند نہیں ہو سکتا صرف غلزئی قبیلے کو اس بات کی اجازت تھی۔ یہ کیونکہ یہاں مہاجر تھے اس لئے انہیں حفاظتی نقطۂ نظر سے ہتھیار رکھنے کی محدود اجازت تھی۔ حتیٰ کہ داؤد کے زمانے تک یہی صورتحال تھی' اس لئے ہمیں انہیں تربیّت دینی پڑی۔ اگر ہم ۱۹۷۳ء سے انہیں تربیّت نہ دینی شروع کرتے تو ۷۹ء میں روسی افواج کے واقعے کے بعد تحریک مزاحمت کبھی بھی پھل پھول نہ سکتی ان میں صلاحیّت ضرور تھی لیکن ان کی تربیت بھی ضروری تھی انہیں فرنٹیئر کور کے تحت تربیّت دی جاتی رہی خصوصی تربیّت کیلئے انہیں فرنٹیئر کور کے آدمی بنا کر پاک فوج کے اداروں میں تربیّت کیلئے بھیجا جاتا۔ یہ معاملات اس طرح خفیہ طریقے سے سرانجام

دیئے جاتے کہ تربیّت دینے والوں کو بھی کچھ پتہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ کسے تربیّت دے رہے ہیں۔ جنرل ٹکا خان کے علاوہ مجھے اور وزیر اعظم کو درست صورتحال کا پتہ ہوتا تھا۔ حتیٰ کہ فارن آفس کو بھی ہم ان معاملات میں شریک نہیں کرتے تھے۔ فارن آفس اور دیگر سرکاری اداروں کو بھیجے جانے والا سرکلر میں خود تیار کرتا جس میں فوجی نوعیت کے معاملات کا ذکر نہیں ہوتا تھا' تاکہ اگر افغان حکومت کی طرف سے کوئی احتجاج ہو تو آغا شاہی یکسوئی سے اس کی تردید کر سکیں اور اس طرح کئی دفعہ ہوا کہ افغان حکومت نے پاکستان پر "گوریلوں کو تربیّت دینے کا الزام" لگایا۔ جس قدر شدّت سے یہ الزام لگایا گیا اسی شدّت سے ہمارے فارن آفس نے اس کا دندان شکن جواب بھی دے دیا۔ اسی دور میں قبائلی علاقوں کو پاکستان کے حق میں کرنے کی غرض سے یہاں ترقیاتی کاموں کی رفتار بھی تیز کر دی گئی۔ اس طرح قبائلیوں کو "پاکستان کی طرف دیکھنے" پر مجبور کر دیا گیا۔ جب افغانستان سے یہاں کی طرف ہجرت شروع ہو گئی تو "پاکستان دوست" حلقے یہاں خاصے فعال ہو چکے تھے۔ اے این پی یہاں افغان حکومت کے مفادات کیلئے کافی عرصے سے کام کر رہی تھی۔ اجمل خٹک جیسے لوگ پاکستان کے خلاف ایک عرصے سے کام کر رہے تھے۔ حکومتِ پاکستان نے ۱۹۷۴ء میں "پاکستان دوستوں کی تلاش" اور انہیں منظم کرنے کا کام شروع ہوا۔ اس دور میں اجمل خٹک کی زہر آلود تقاریر ریڈیو کابل سے نشر ہوا کرتی تھیں۔ صوبہ سرحد دھماکوں کی زد میں تھا۔ اس طرح افغان حکمرانوں نے پاکستان کو ڈرانے کی پالیسی اپنا رکھی تھی۔ میں نے ذوالفقار علی بھٹو کو "سرحد کے اس پار پیغام" بھیجنے کا مشورہ دیا تاکہ ہم بھی افغانستان کے اندر اپنی موجودگی کا احساس دلا سکیں۔ پھر اگست ۱۹۷۵ء میں وادیٔ پنج شیر میں کامیاب آپریشن کروائے جس سے کابل حکومت کے ہوش ٹھکانے آ گئے یہ ساری کاروائی گلبدین کے ذریعے پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ اس کامیاب آپریشن کے بعد کابلی حکمرانوں کے ہوش ٹھکانے آ گئے اور داؤد حکومت پاکستان کے ساتھ ساتھ تمام متنازعہ امور پر بات چیت کیلئے آمادہ ہو گئی۔ سردار داؤد نے تمام متنازعہ امور بشمول ڈیورنڈ لائن پر بات چیت کرنے کا عندیہ دیا۔ ہماری پالیسی کامیاب رہی تھی افغان حکومت اب "جارحیّت" کی بجائے "مفاہمت" پر آ گئی تھی انہوں نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا تھا کہ اب معاملہ یکطرفہ نہیں بلکہ دو طرفہ ہو گیا ہے کیونکہ اس سے پہلے صرف افغان حکمران ہمیں تنگ کر رہے تھے جبکہ پنج شیر کے آپریشن کے بعد افغان حکومت بھی پریشان ہو گئی تھی۔ ہم بھی چاہتے تھے کہ معاملات سیاسی انداز میں ہی طے ہوں متنازعہ امور کو مل بیٹھ کر برادرانہ انداز میں طے کر لیا جائے۔ لڑائی جھگڑے اور دنگے فساد سے

دونوں اطراف مسلمانوں کا ہی نقصان ہو تا رہا تھا جسے ختم کرنا ضروری تھا۔ یہ اسی صورت میں ممکن تھا کہ افغانستان میں ماسکو نواز یا دہلی نواز لوگ بر سرِ اقتدار نہ ہوں بلکہ " پاکستان دوست " حکومت قائم ہو جن کی پشتونوں کے ساتھ ہمدردی اور دوستی کے ساتھ ساتھ پاکستان کے خلاف دشمنی نہ ہو اور وہ حکومت پاک افغان تعلقات بہتر کرنے کی کوشش کرے۔ اس سلسلے میں سردار داؤد کے زمانے سے پہلے کے ایک وزیرِ اعظم موسیٰ شفیق نے ایک ایسا قابلِ عمل فارمولا پیش کیا تھا جس کی پذیرائی کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اسے حکمرانوں کے علاوہ حکمت یار اور ربانی جیسے "بنیاد پرستوں" نے بھی قبول کیا تھا۔ موسیٰ شفیق کا تعلق اخوان المسلمون سے تھا۔ جامعہ الازہر میں حصولِ تعلیم کے دوران وہ اخوانیوں سے متاثر ہوا تھا۔ انہی سے تربیت حاصل کی اور پھر افغانستان کا وزیرِ اعظم بنا۔ ہمیں کافی عرصہ بعد میں پتہ چلا کہ حکمت یار وغیرہ کے اس سے رابطے تھے دیگر انقلابی قسم کے نوجوان بھی اس سے متاثر تھے مزاحمتی تحریک کے پس پردہ بھی اس کا دماغ کام کر رہا تھا یہی وجہ ہے کہ اس کا تجویز کردہ فارمولا ان لوگوں نے مان لیا تھا ہم سیاسی تبدیلی چاہتے تھے ۱۹۷۶ء میں ہم نے ایک وفد ظاہر شاہ سے مذاکرات کے لئے بھیجا اس وفد میں ایک آدمی حکمت یار کی طرف سے بھی شامل تھا اس وقت تک حکمت یار، ربانی اور دیگر افغان حریت پسند ایک ہی تھے موسیٰ شفیق فارمولے کے تحت یہ وفد ظاہر شاہ کو افغانستان واپس لانے کے لئے روم بھیجا گیا تھا لیکن بوجوہ ہماری یہ کوشش کامیاب نہ ہو سکی" بعد میں درپیش حالات میں بھی اسی قسم کی سفارتی سرگرمیاں جنرل ضیاء الحق دور میں بھی جاری رہیں محمد خان جونیجو اور بے نظیر دورِ حکومت میں بھی سفارتی کوششیں اسی نہج پر چلتی رہیں حتّٰی کہ نواز شریف کے دورِ حکومت میں بھی چیف آف آرمی سٹاف جنرل آصف نواز کا روم میں ظاہر شاہ سے ملنے کا پروگرام طے پا گیا تھا ان کی ظاہر شاہ کے داماد شاہ ولی سے ابتدائی ملاقات بھی ہو گئی تھی کہ ملکی پریس میں ایک شور مچ گیا حکومت پر افغان پالیسی سے ہٹنے کا الزام لگنا شروع ہو گیا۔ پھر داخلی دباؤ کے تحت یہ ملاقات حتمی صورت اختیار نہ کر سکی۔ افغان مسئلے کے حوالے سے بہت سے "ماہرین" اور دانشوروں" کی رائے میں افغان معاشرتی ڈھانچے میں ایک "بزرگ شخصیت" نے ان منتشر قبائل کو منظم کیا اور پھر بڑی بڑی بادشاہتوں کو قائم کیا۔ اسی نظریاتی پس منظر میں موسیٰ شفیق نے جو فارمولا طے کیا تھا اس میں ظاہر شاہ کو واپس لا کر ایک ایسا نظمِ مملکت ترتیب دینے کی پلاننگ موجود تھی جو نہ صرف افغان معاشرے کی روایات کے عین مطابق ہو بلکہ بیرونی اثرات سے بھی آزاد ہو یہی وجہ ہے کہ اس وقت انجینئر حکمت یار اور پروفیسر ربانی جیسے "بنیاد پرستوں" نے بھی اس فارمولے کو مان لیا تھا

ظاہر شاہ کی واپسی بھی اسی فارمولے کے مطابق تھی لیکن اب بقول گلبدین حکمت یار ''افغان مسئلے کے حل میں ظاہر شاہ کا کردار صفر نہیں بلکہ منفی ہوچکا ہے۔ ''اس مسئلے سے دلچسپی رکھنے والے لوگوں کیلئے حکمت یار کا یہ رویّہ بظاہر ناقابل فہم اور ''متضاد'' ہے لیکن ذرا سا غور کریں تو یہ معاملہ آسان ہوجاتا ہے۔ اس وقت یعنی ستر کی دھائی کی ابتدا میں مسئلہ افغانستان کسی حد تک ایک داخلی ایشو تھا۔ اس میں مختلف نظریات کے حامل افغان گروہ آپس میں برسرِپیکار تھے۔ بیرونی مداخلت اگر تھی بھی تو بالواسطہ اور پوشیدہ تھی۔ لیکن ۱۹۷۹ء میں روسی جارحیت نے معاملات کو ایک واضح شکل دے دی ہے وہاں دو گروہ وضع ہوگئے ہیں ایک جارح یا جارح کے ساتھی اور دوسرا مظلوم اور جارحیّت کا مقابلہ کرنے والے روسی اور ان کے بل بوتے پر حکومت کرنے والے نور محمد ترکئی' حفیظ اللہ اور ببرک کارمل سے لے کر نجیب اللہ اور اس کے بعد آنے والوں تک سب جارح اور اس کے ساتھی تھے اور روسی افواج کے چلے جانے کے بعد بھی ان کی پوزیشن نہیں بدلی۔ کیونکہ جس طرح سوویت قیادت نے ''افغانستان میں اپنی افواج بھیجنے کے فیصلے کو اپنی بڑی غلطی تسلیم کیا اور پھر اپنی فوجیں واپس بلالیں اسی طرح روسیوں کے زیرِ سایہ پرورش پانے اور افغانوں کو خاک وخون میں نہلانے والوں نے نہ تو اپنی غلط کاریوں کو تسلیم کیا ہے اور نہ ہی اعترافِ گناہ کے بعد ندامت کا اظہار کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ روسی افواج کے چلے جانے کے بعد بھی ان کی سوچ ویسی ہی ہے۔ دوسری طرف مظلوم اور جارحیّت کا مقابلہ کرنے والے ہیں۔ افغان مجاہدین و مہاجرین جنہوں نے طویل مزاحمتی تحریک کو ایک سُپر طاقت کے خاتمے تک پہنچایا۔ ''جہادِ تاریخ اسلام کا زندہ وجاوید باب ہے جسے رواں صدی کی ابتدا میں بھی افغانوں نے ہی جِلا بخشی اور ایک عظیم طاقت برطانیہ عظمی کو لندن پہنچایا اور رواں صدی کے آخری عشرے میں افغانوں نے ہی دوسری عظیم طاقت ''سوویت یونین'' کو کریملن تک بھیج دیا ہے۔ جارح اور مجروح' ظالم اور مظلوم 'اشتراکی جارح اور افغان مجاہدین' بساط بڑی واضح تھی اور اب بھی واضح ہے۔ مجاہدین نے جارح کو مار بھگایا ہے ۱۹۷۹ء میں جارح اور مظلوم کی بجائے ۱۹۸۹ء میں اور اس کے بعد یہ پوزیشن مفتوح اور فاتح کی صورت اختیار کرچکی ہے اشتراکی جارح اور اس کے ساتھی میدانِ جنگ میں مجاہدین کے ہاتھوں شکست کھا چکے ہیں۔ اب جنگ کے بعد ''مذاکرات کی بساط'' بچھا کر فاتح کی پوزیشن کو بدلنے کی کوشش کرنا تاریخ کے ساتھ ایک مذاق ہے افغانستان میں اب صورتحال باہمی فریقین کی نہیں رہی کابل انتظامیہ خواہ کوئی بھی ہو جارح کے ساتھی اور ظالم ہیں۔ اس لئے ظالموں کے ساتھ معاملہ طے کرنا ایسی صورت میں جبکہ وہ

شکست بھی کھا چکے ہوں' بالکل غلط ہے۔ اب ایسی "بزرگ شخصیّت" ہی کوئی کردار ادا کر سکتی ہے جو کسی طور بھی نہ تو ظالموں کے ساتھ رہی ہو اور نہ ہی ان کے بارے میں کوئی ہمدردی رکھتی ہو۔ ظاہر شاہ اب نہ تو بزرگ شخصیّت کا کردار ادا کرنے کے قابل ہے اور نہ ہی وہ غیر متنازعہ رہا ہے۔ کیونکہ معاملات اب ایک ایسی نہج پر چل نکلے ہیں جس میں ظالم و مظلوم کا تعیّن اور مظلوموں کی فتح تسلیم کئے بغیر افغانستان میں پائیدار امن قائم نہیں ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انجینئر گلبدین حکمت یار نے اب ظاہر شاہ کی واپسی قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ مزاحمتی تحریک کے مختلف ادوار کے حوالے سے ابتدائی دَور کا تجزیہ ہو رہا تھا بھٹّو دور کی "افغان پالیسی" اور "مزاحمتی تحریک کے حوالے سے جنرل نصیر اللہ بابر کی یادداشتیں اس لحاظ سے بڑی اہم ہیں کہ وہ اس دَور میں نہ صرف صوبہ سرحد جیسے اہم صوبے کی گورنری کے فرائض سرانجام دے رہے تھے بلکہ انہیں وزیراعظم پاکستان کا اعتماد بھی حاصل تھا۔ سب سے بڑھ کر انہیں قبائلی معاشرت اور سیاست کے اسرار و رموز کے ساتھ ساتھ بہت سے عسکری معاملات میں براہِ راست شرکت کا بھی موقع ملا تھا۔ اس اعتبار سے بھٹّو دورِ حکومت میں ان کی بنائی ہوئی افغان پالیسی نے بڑے مؤثر نتائج پیدا کئے انہوں نے نہ صرف افغان حکمرانوں کو پاکستان دشمنی کی پالیسی بدلنے پر مجبور کیا بلکہ اوّلین تحریکِ مزاحمت کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کا موقع بھی فراہم کیا۔ اس دُور کی مزاحمتی تحریک کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ "گلبدین حکمت یار پشتون مزاج کی بھرپور نمائندگی کرتا تھا بہادری اس کے مزاج میں کُوٹ کُوٹ کر بھری ہوئی تھی کیونکہ پشتون کبھی بھی بزدلی کا مظاہرہ نہیں کرتے اور حکمت یار اس مزاج کا بہترین نمونہ تھا۔ اس دَور میں حکمت یار کو افغانستان میں "ملٹری آپریشنوں" کی ذمّہ داری سونپی جاتی تھی اور وہ بڑی کامیابی سے عسکری ذمہ داریاں پوری کرتا تھا' جبکہ استاد ربانی علمی قسم کی شخصیّت تھے اس لئے انہیں افغانستان میں پروپیگنڈے کی ذمّہ داریاں سونپی جاتی تھیں۔ خاص طور پر "شب ناموں" کے ذریعے کی جانے والی کاروائیوں کے سلسلے میں ربانی گروپ کی کامیابیاں قابلِ رشک تھیں۔ اس وقت جماعت اسلامی والے ان لوگوں کے قریب بھی نہیں جاتے تھے' ڈر کی وجہ سے یا انہیں اس مزاحمتی تحریک کی اہمیّت کا اندازہ ہی نہیں تھا۔ غرض وجہ کچھ بھی ہو جماعت اسلامی ان سے دُور ہی رہتی تھی۔ ان کی مزاحمتی سرگرمیاں ہمارے ملکی مفادات کیلئے سود مند تھیں اور انہیں ہمارا تعاون درکار تھا اس لئے ہمارے ان سے اچھے تعلقات قائم ہو گئے۔ مفاہمت و تعاون کے ساتھ معاملات چلتے رہے۔ ۱۹۷۳ء میں ایسا لگنے لگا جیسے حالات پر بھٹّو حکومت کی گرفت کمزور ہو رہی ہے اس لئے ۱۹۷۶ء میں مجھے

فوج سے ریٹائر کر کے سول حکومت میں شامل کر لیا گیا۔ جنرل جہانداد خان ' جنرل احمد جمال میرے ہی ساتھی تھے ویسے ذوالفقار علی بھٹو نے مجھے اگست ۱۹۷۵ء میں ہی بتادیا تھا کہ وہ مجھے ریٹائر کر کے اہم ذمّہ داریاں سونپنا چاہتے ہیں۔ میں ریٹائرمنٹ لینے میں ذرا ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ پھر مارچ ۷۶ء میں مجھے ریٹائر کر کے گورنر لگادیا گیا۔ میں نے گورنر بنتے ہی تمام معاملات کو ایک ترتیب سے سُلجھانا شروع کیا پنج شیر میں گلبدین کے کامیاب آپریشن اور پاکستان کی طرف سے افغان حکومت کے خلاف دیگر جوابی کارروائیاں اسی دَور کی یادگاریں ہیں۔ انھی کارروائیوں کی وجہ سے سردار محمد داؤد خان کو پاکستان کے ساتھ مفاہمتی بات چیت کیلئے درخواست گزار ہونا پڑا۔ کچھ لوگوں کا ہم پر الزام ہے کہ ہم اس کے ساتھ ساتھ ظاہر شاہ کے ساتھ بھی سلسلہ جنبانی کیوں جاری رکھے ہوئے تھے۔ یہ بات درست ہے کہ ہم نے ظاہر شاہ کو بھی اس مسئلے کے حل کیلئے کچھ کردار ادا کرنے کیلئے کہا تھا کیونکہ ایسا کرنا ہمارے قومی مفادات کے عین مطابق تھا۔ ہم نے مزاحمتی تحریک کے لوگوں کو بتادیا تھا کہ ہم یہ سب کچھ اس لئے کر رہے ہیں کہ ایسا کرنا نہ صرف ہمارے قومی مفاد میں ہے بلکہ اس سے افغان عوام کو بھی سُکھ کا سانس لینے کا موقع ملے گا۔ ہماری مدد کسی فرد کیلئے یا پارٹی کیلئے نہیں بلکہ افغان عوام کیلئے تھی۔ اب اگر نواز شریف حکومت کو ان سے معاملات طے کرنے میں مشکل پیش آرہی ہے اور ان کے ساتھ پاکستان کے ساتھ اختلافات پیدا ہو رہے ہیں تو ہمیں ان لیڈروں کی پرواہ نہیں کرنی چاہئے۔ ہمیں گروپوں کو نہیں بلکہ افغان عوام کے وسیع تر مفادات کو پیشِ نظر رکھنا چاہئے۔ ہم ظاہر شاہ کو اس لئے واپس لانا چاہتے تھے تاکہ افغانستان میں سیاسی ادارے قائم ہو سکیں افغان عوام کو کچھ سیاسی تربیت حاصل کرنے کا موقع مل سکے۔ ہم نے قبائلی علاقوں میں بالغ رائے دھندگی کی بنیاد پر الیکشن کروانے کا پروگرام بنالیا تھا طے یہ ہوا تھا کہ قبائلی علاقے کے عوام کو بھی صوبائی اسمبلی میں نمائندگی دی جائے گی۔ اس سلسلے میں الیکشن کمیشن کو اطلاع دی جاچکی تھی قیوم خان نے اس کی مخالفت بھی کی تھی لیکن ہم نے حتمی فیصلہ کر لیا تھا داؤد جب یہاں آیا تو اس نے کہا کہ " آپ کے معاشی وسماجی حالات بہتر ہیں قبائلی علاقے میں آپ کے ترقیاتی منصوبوں کی وجہ سے مجھ پر افغانستان میں دباؤ بڑھ گیا ہے اب اگر آپ نے بالغ رائے دہی کی بنیاد پر الیکشن کروادیئے تو میرے لئے مسائل اور بھی بڑھ جائیں گے اس لئے برائے مہربانی اسے ایک سال کیلئے ملتوی کر دیں " اس کے بعد ۷۷ء کا مارشل لاء آگیا اور سارے طے شدہ معاملات کھٹائی میں پڑ گئے۔ بھٹّو صاحب کے پاس جب بھی کوئی قبائلی لیڈر یا ملک جاتا تو وہ انہیں ٹرک وبس کے پرمٹ جاری کرتے۔ اس طرح ان قبائلیوں

کے کاروبار بڑھے ان کے ٹرک و بسیں پورے پاکستان میں چلنا شروع ہوئیں۔ یہاں ان کے مفادات بڑھے تو ان کی سرکشی میں کمی آئی۔ پھر انہوں نے یہاں امن و امان قائم رکھنے کیلئے حکومت کی مدد کرنا شروع کر دی۔ اس طرح وہ زیادہ سے زیادہ پاکستانی ہوتے چلے گئے۔ ویسے لارڈ کرزن کے دور سے ہی ایسا ہوتا چلا آ رہا ہے کہ قبائلی مرکزی حکومت کے ساتھ ہی ہوتے ہیں۔ ہم نے سوچا کہ ان کی نمائندگی اگر یہاں کی صوبائی اسمبلی میں بھی ہو تو ان کے دل اور بھی زیادہ ہمارے قریب ہوں گے۔ انہیں بیس سیٹیں دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ ۸۰ پہلے تھیں ۲۰ اور دیگر کل سو سیٹیں ہو جاتیں۔ سندھ کی اس وقت ۱۰۵ سیٹیں تھیں۔ ہم انہیں بھی زیادہ پاکستان کے ساتھ INTEGRATE کرنا چاہتے تھے۔

۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو مارشل لاء لگ گیا۔ جنرل ضیاء الحق کے پاس بالغ نظری اور دور اندیشی نہیں تھی، وہ دور تک دیکھ ہی نہیں سکتے تھے۔

انہوں نے قبائلی علاقے میں ہونے والے معاملات سے ہاتھ کھینچ لیا ترقیاتی کام روک دیئے گلبدین کی امداد بھی بند کر دی۔ ان کا نکتہ نظر یہ تھا کہ افغانستان میں ہونے والے معاملات ہمارا مسئلہ نہیں ہیں۔ مجددی ۱۹۷۶ء میں ہمارے پاس آئے وہ سکینڈے نیویا میں کام کر رہے تھے۔ بھٹو صاحب نے کہا کہ یہ جو کام وہاں کر رہے ہیں انہیں وہی کرتے رہنا چاہئے۔ وہ تبلیغ دین کا کام بہتر انداز میں کر سکتے ہیں، اس لئے انہیں عسکری اور مزاحمتی امور کے متعلق زیادہ تردّد نہیں کرنا چاہئے۔ اس طرح انہیں واپس کر دیا گیا۔ اسی دور میں لیبیا کے سفیر میرے پاس آئے اور انہوں نے افغانستان کی پاکستان دشمن حکومت کے خلاف یہاں پر آپریشن کرنے کی اجازت طلب کی۔ انہوں نے کہا کہ ہم تخریبی اور گوریلا سرگرمیوں میں ایک خاص ملکہ رکھتے ہیں۔ ہمارے پاس تجربہ بھی ہے اور وسائل بھی۔ تربیتی مراکز بھی ہیں۔ اگر آپ ہمیں اپنے ساتھ شامل کر لیں تو مزاحمتی تحریک میں زیادہ قوّت پیدا ہو جائے گی۔ ذوالفقار علی بھٹو کسی بھی بیرونی قوت کے پاکستانی معاملات میں مداخلت کے خلاف تھے۔ انہوں نے مجھے کہا کہ بابر اگر تم سمجھتے ہو کہ مزاحمتی گروپوں کو زیادہ امداد کی ضرورت ہے تو اس میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ہم کسی دوسری حکومت کو اجازت نہیں دیں گے کہ وہ ہماری زمین کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرے، خواہ اس سے ہمیں بھی فائدہ پہنچنے کا امکان ہو۔ ان کی یہ بات بڑی حد تک درست تھی۔ ویسے کہا جاتا ہے کہ جنرل اختر عبدالرحمان امریکیوں کے براہِ راست مجاہدین تک پہنچنے کے خلاف تھے۔ ہمارے امریکی و دیگر مغربی معاون حکومتوں کی بڑی شدید خواہش تھی کہ وہ مجاہد کمانڈروں

سے براہِ راست رابطے پیدا کریں لیکن ۱۹۸۷ء تک انہیں اس میں کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ اس میں آئی ایس آئی کے مؤثر نظم وضبط اور اس پر جنرل اختر کی مؤثر گرفت کا بھی ہاتھ ہو سکتا ہے، کیونکہ جنرل ضیاء الحق تو امریکیوں کے دباؤ کا زیادہ مقابلہ نہیں کر سکتے تھے اور ان کی اس سوچ کا اظہار خارجہ معاملات میں بار بار ہوتا رہا۔ ۱۹۷۸ء میں محترمہ بیگم بھٹو صاحبہ صوبۂ سرحد کے دورے پر آئیں تو میں نے کئی جلسوں میں افغانستان کی بگڑی ہوئی صورتحال کا ذکر بھی کیا کئی تبصرے لکھے اور ان میں واضح طور پر بتادیا کہ اگر حالات اسی نہج پر چلتے رہے تو روسی افواج افغانستان میں داخل ہو جائیں گی لیکن اس وقت میری بات پر حکمرانوں نے توجہ نہ دی بلکہ مجھے جیل بھجوا دیا۔

مزاحمتی تحریک کا یہ دوسرا دور دسمبر ۱۹۷۹ء میں روسی افواج کے افغانستان میں داخلے تک جاری رہا جس میں مزاحمتی لیڈروں کو پس منظر میں دھکیل دیا گیا اور سفارتی وسیاسی محاذ گرم کیا گیا۔ افغان حکمران جو بھٹو دور کی "جوابی کارروائیوں" کی وجہ سے دفاعی پوزیشن میں آ گئے تھے، پاکستان کے ساتھ بات چیت کیلئے آمادہ دکھائی دینے لگے۔ جنرل ضیاء الحق نے اس صورتحال سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی لیکن کیونکہ انہیں افغان معاملات کے بارے میں کوئی زیادہ معلومات نہیں تھیں۔ اس لئے یہ کاوشیں بے ترتیب اور غیر فطری انداز میں آگے بڑھتی رہیں اور ان کا نتیجہ کوئی نہ نکل سکا۔ کچھ عرصہ جنرل ضیاء الحق اور سردار داؤد کے ساتھ سلسلہ جنبانی چلتا بھی رہا۔ داؤد اشتراکیوں کے چنگل سے نکلنا چاہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ پاکستان کے ساتھ اپنے تعلقات مضبوط بنانے کی پالیسی پر گامزن ہوا۔ لیکن ضیا حکومت کی طرف سے اسے بروقت اور مؤثر جواب نہ ملا۔ اسی دوران اشتراکیوں نے بنی بنائی بساط الٹ دی۔ جنرل ضیاء الحق کے دور کے شروع ہوتے ہی مزاحمتی تحریک وقتی طور پر ایک نئے دور میں داخل ہوئی۔ اس دور میں مزاحمتی تحریک کو پاکستان میں مایوس کن حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ بھٹو دور کے آخری دو سالوں میں تحریکِ مزاحمت بڑی کامیابی سے آگے بڑھ رہی تھی اور ایسے حالات پیدا ہو رہے تھے کہ افغانستان میں داؤد حکومت یا تو پاکستان دشمن پالیسی ترک کر دے اور برادرانہ تعلقات کا آغاز کر دے یا پھر تحریکِ مزاحمت کی طرف سے حتمی مقابلے کے لئے تیار ہو جائے۔ اس دور میں پاکستان کی افغان پالیسی میں جتنی اہمیت "افغانستان میں دوست حکومت کے قیام" کو حاصل تھی اتنی ہی اہمیت "تحریکِ مزاحمت" کی بھی تھی۔ کیونکہ داؤد حکومت کو پاکستان دوستی پر مجبور کرنے کا ایک ہی راستہ تھا کہ اس پر "مزاحمتی تحریکی سرگرمیوں" کے ذریعے دباؤ ڈالا جائے تاکہ داؤد مجبور ہو کر نہ صرف مفاہمت پر آمادہ ہو جائے بلکہ "اینٹی کمیونسٹ عناصر" پر عرصہ حیات بھی تنگ کرنے سے

باز رہے۔ ۱۹۷۷ء کے ابتدائی ایام میں تحریکِ مزاحمت کی سرگرمیاں عروج پر تھیں۔ بقول حکمت یار ''قریب تھا کہ ہم کابل میں برسراقتدار آجاتے لیکن حالات نے پلٹا کھایا۔'' پاکستان میں ضیاء الحق نے مارشل لاء لگادیا۔ پیپلز پارٹی کے دورِ حکومت میں افغانوں سے قائم رابطوں کو ختم کر دیا گیا یا دوسرے الفاظ میں یہ رابطے خود بخود ہی ختم ہو گئے۔ پاکستان میں حکمرانوں کی ترجیحات ہی بدل گئیں۔ بلکہ ملکی انتشار، حکومت اور اپوزیشن خونی تصادم کے قریب پہنچ چکے تھے کہ جنرل ضیاء الحق مارشل لاء لگا کر ''بیچ بچاؤ'' کرانے کیلئے بیچ میں آ گئے۔ اب نئی پاکستانی حکومت کی ترجیحات میں ''۹۰ دنوں میں الیکشن کروانا'' اور ''اقتدار منتخب نمائندوں کے سپرد کرنا'' شامل تھا۔ افغانستان میں دوست حکومت کا قیام اور اس مقصد کیلئے مزاحمتی تحریک کی پرورش و ترقی نئی حکومت کے پیشِ نظر نہیں تھا۔ اس نئے دور کے حوالے سے جنرل نصیر اللہ بابر رقمطراز ہیں۔ ''۱۹۷۷ء میں مارشل لاء کے نفاذ کے بعد پیپلز پارٹی کی ''افغان پالیسی'' پر عمل در آمد روک دیا گیا ان سارے عملی منصوبوں پر جمود طاری ہو گیا جو پاکستان کے وسیع تر مفادات کے تناظر میں شروع کئے گئے تھے۔ قبائلی علاقوں میں جاری ترقیاتی منصوبے ختم کر دیئے گئے۔ افغان گوریلا سرگرمیوں کی پشت پناہی سے بھی ہاتھ کھینچ لیا گیا۔ ۱۹۷۸ء کے اوائل میں گلبدین حکمت یار نے مجھ سے ملاقات کی اور شکایت کی کہ اب انہیں امداد نہیں مل رہی ہے اس لئے مزاحمتی تحریک کے سرد پڑ جانے کا فوری امکان ہے۔ اس پر میں نے ایرانی حکام سے رابطہ قائم کیا ایرانی قونصلیٹ کے ذریعے شہنشاہ ایران کو پیغام بھجوایا کہ وہ ان کی مدد کریں پشاور میں ایرانی سفارتی اہلکاروں نے مجھے تین دن بعد دوبارہ رابطہ قائم کرنے کو کہا۔ اسی دوران مجھے جیل بھیج دیا گیا۔ پھر جب مئی میں میری رہائی ہوئی تو شہنشاہ ایران خود ہی ایران سے نکل چکا تھا۔ اس طرح مزاحمتی تحریک کا ایک ممکنہ مددگار بھی چھن گیا، لیکن میں نے ہمت نہیں ہاری۔ امریکیوں سے رابطے کئے۔ اس دور میں میری ''حرکات و سکنات'' پر مارشل لاء حکام کی کڑی نظر تھی کیونکہ میں ان کے نزدیک ناپسندیدہ شخص تھا۔ میں نے خفیہ ذرائع سے گلبدین اور ربانی کے رابطے امریکیوں سے کروادیئے۔ ان کا نتیجہ کیا نکلا مجھے کچھ معلوم نہیں۔ لیکن میں نے ''اپنے ملک کے وسیع تر مفادات کے پیشِ نظر تحریکِ مزاحمت کو فعال رکھنے کی ہر ممکنہ کوشش کی۔ امریکیوں کو ربانی، حکمت یار اور مجددی کی صلاحیتوں کے بارے میں تفصیلات مہیا کیں تاکہ ان کی مدد کریں۔ پھر دسمبر ۱۹۷۹ء میں روسی افواج افغانستان میں داخل ہو گئیں اور سارے معاملات نے ایک نئی صورت اختیار کر لی۔ ۱۹۷۷ء میں جب پی این اے کی تحریک زوروں پر تھی تو میں نے حکمت یار کو

کہا کہ ہمیں معلوم نہیں کہ ہم کتنی دیر اور حکومت میں رہیں۔ تم اسلحہ وغیرہ کے ذخائر جمع کر لو۔ اسی دوران میں نے انہیں وافر مقدار میں اسلحہ مہیا کیا۔ داخل افغانستان مختلف صوبوں میں انہیں COMMUNICATION NET WORK قائم کرنے میں مدد دی۔ یہی وجہ ہے جب دسمبر ۷۹ء میں روسی افواج یہاں آئیں تو یہاں مزاحمت کا سامان تیار تھا۔ گلبدین کے کالجوں و یونیورسٹیوں کے لوگوں سے رابطے مؤثر ہو چکے تھے۔ تنظیمی ڈھانچہ بھی تیار تھا۔ نور محمد ترکئی کے دور سے پہلے انہوں نے دو مرتبہ داؤد حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش کی لیکن تربیت نہ ہونے کی وجہ سے ناکام رہے۔ پھر ترکئی اور حفیظ اللہ امین آئے ان سے پاکستان کے تعلقات قدرے بہتر ہو گئے تھے۔ پاکستان نے ان حکومتوں کو تسلیم بھی کیا' اس لئے حکمت یار و ربانی وغیرہ پس منظر میں چلے گئے تھے۔ ایک دفعہ قاضی حسین احمد نے ملتان میں بڑی لمبی چوڑی تقریر کی اور افغان جہاد کے متعلق کریڈٹ لینے کی کوشش کی۔ اخبارِ جہاں میں خان رضوانی نے اس پر مضمون بھی لکھا۔ میں نے خان رضوانی کو لکھا کہ تم اس بارے میں ان لوگوں سے پوچھو جو اس معاملے میں براہِ راست فریق ہیں۔ پھر جب قاضی حسین احمد سے اس مسئلے پر بات کی گئی تو انہوں نے بھی تسلیم کیا کہ اس مسئلے کی ابتدا بھٹو دور میں ہوئی اور انہوں نے ہی افغانوں کی مدد کا آغاز کیا۔ ۸۱۔ ۱۹۸۰ء میں میں نے ضیاء الحق حکومت کو بار بار کہا کہ وہ اس مسئلے کو INTERNATIONALIZE کریں تحریکِ مزاحمت کو مضافات کی بجائے شہروں تک پھیلائیں۔ ہائی ویز اور روڈ بلاک کریں۔ افغان حکمرانوں کیلئے امن و امان کا مسئلہ پیدا کریں تاکہ دنیا کی توجہ اس طرف مبذول ہو اور اس مسئلے کا حل نکل سکے۔ میں نے اپنے دور میں انہیں ۷ RPG مہیا کی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے روسیوں کے ساتھ پہلے ہی براہِ راست معرکے میں کئی ٹینک تباہ کر دیئے تھے۔ روسیوں کے افغانستان میں داخلے کے بعد جنرل اختر نے جو عسکری پالیسی اختیار کی وہ بالکل عالمی طرز کی گوریلا جنگی حکمتِ عملی سے ملتی جلتی تھی۔ ابتدا میں شاید جنرل اختر کو حکمت یار اور ربانی کے امریکی رابطوں کا علم نہیں تھا۔ حتیٰ کہ اس وقت افغانستان کی تازہ ترین صورتحال کے بارے میں بھی وہ امریکی جاسوسی سیارے کی معلومات پر انحصار کیا کرتے تھے۔ لیکن بعد میں ایک منجھے ہوئے سپاہی اور جنرل کی طرح انہوں نے اپنی صفیں ترتیب دیں اور تحریکِ مزاحمت کی پشت پناہی کا سلسلہ شروع کیا۔ پھر حکمت یار اور ربانی وغیرہ ایک بار پھر منظرِ عام پر آنے شروع ہوئے۔ اس لحاظ سے جنرل اختر کا چناؤ بہترین تھا کہ انہوں نے ان لیڈروں کو ان کی صلاحیتوں کے مطابق کام دیا اور بڑی کامیابی سے اپنی عسکری حکمتِ عملی کو کامیابی سے ہمکنار کیا۔ ابتدا میں امریکی حکومت اس مزاحمتی تحریک کو

شاید زیادہ اہمیت نہیں دیتی تھی اس لئے انہیں جدید ہتھیار مہیا نہیں کئے گئے۔ لیکن جوں جوں تحریک پھیلتی گئی اور اس کے اثرات پورے افغانستان میں نظر آنے لگے تو امریکی مجبور ہوئے کہ اس تحریک کو امداد مہیا کریں۔ جب انہیں اینٹی گن شپ ہتھیار ملنے شروع ہوئے' چائینز مشین گنیں آئیں تو مجاہدین کی حربی صلاحیّت میں اضافہ ہوا اور روسیوں کو شدید مشکلات پیش آنا شروع ہوئیں لیکن ایک بات بڑی واضح ہے کہ پاکستان سفارتی محاذ پر بہت زیادہ کامیاب نہیں رہا۔ یہی وجہ ہے کہ میدانِ جنگ میں حاصل کی جانے والی فتوحات کو "سیاسی برتری" کی شکل نہیں دی جاسکی ہے۔



امن کی تلاش میں



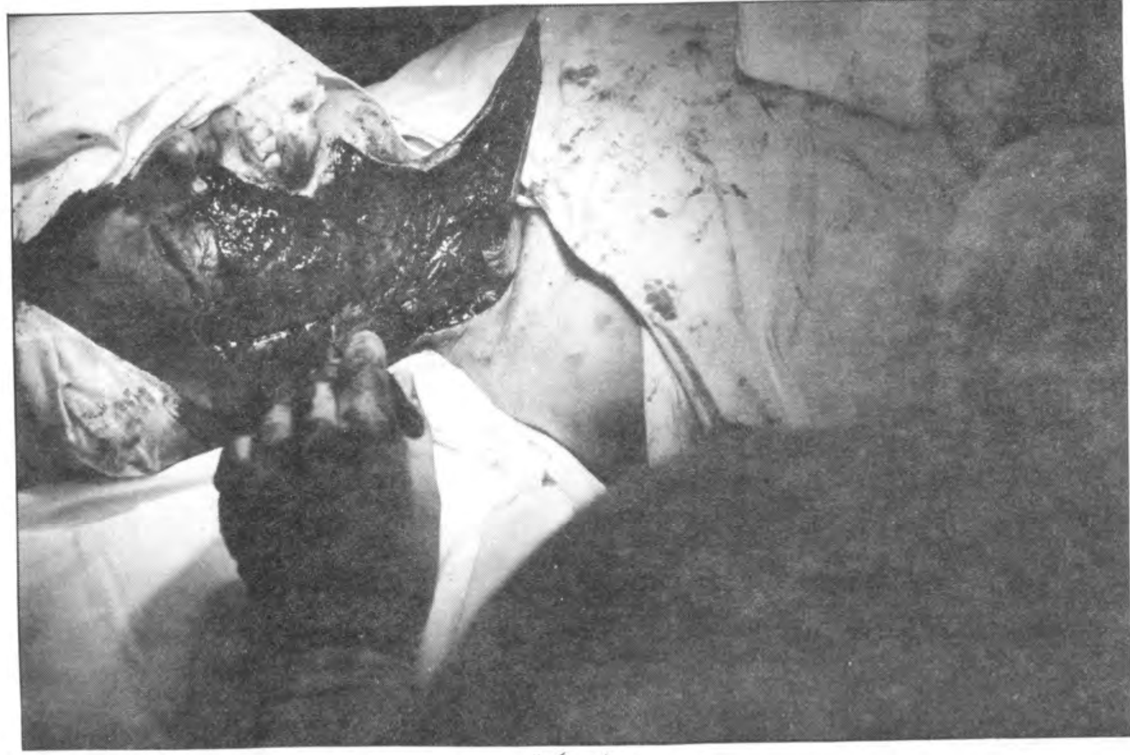
دشمن سے چھینے ہوئے ٹینک پر سوار افغان مجاہدین



ایک افغان مجاہد...... دشمن پر حملے کے لئے تیار بیٹھا ہے



اس بربریت کا ذمہ دار کون ہے



اس کا جرم کیا تھا؟



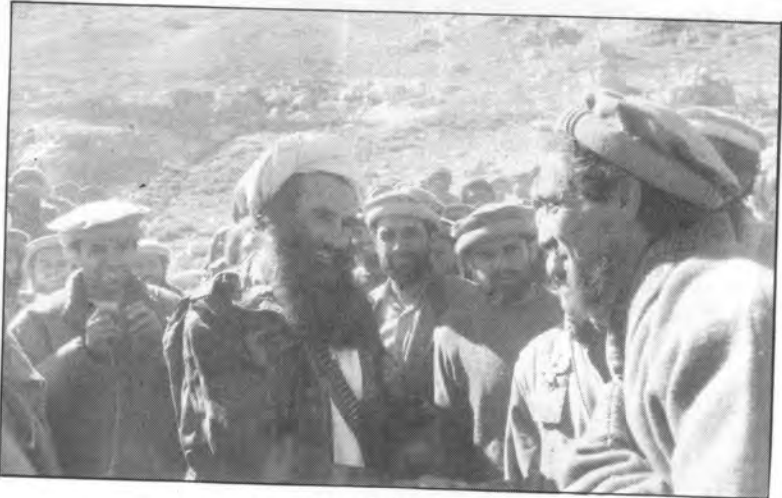
روسی بربریت کا شکار ایک معصوم افغان



پھر کبھی لوٹ کر نہ آئیں گے   تیری محفل سے جا رہے ہیں ہم

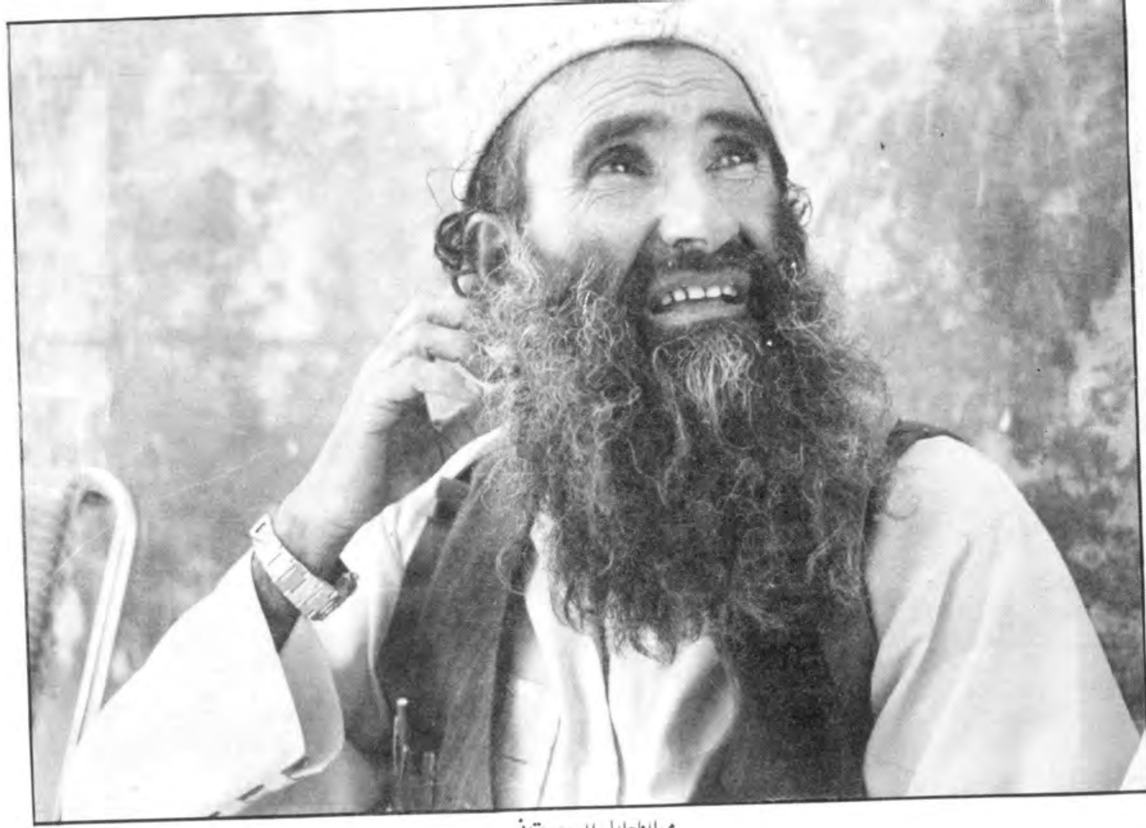


کمانڈروں کی شوریٰ ...... میدان جہاد سے میدان سیاست کی طرف رواں دواں (اپریل 1989ء)



احمد شاہ مسعود، جلال الدین حقانی کے ساتھ (مارچ 1992ء)

166



مولانا جلال الدین حقانی



مولوی یونس خالص اور مولانا سمیع الحق، صبغۃ اللہ مجددی کے ساتھ (اپریل 1992ء)



شیخ جمیل الر حمان ......ولائت کنڑ کے امیر جنہیں ایک مصری باشندے نے شہید کر دیا



ایک متنازعہ کردار۔ جنرل تنائی



اشتراکیوں کی ارضی جنت کا آخری تاجدار گورباچوف

اشتراکی عسکری ہزیمت

171

دسمبر ۱۹۷۹ء میں افغانستان میں روسی افواج کے داخلے سے لے کر فروری ۱۹۸۹ء میں روسی افواج کی عسکری ہزیمت تک پاکستان عالمی منظر پر چھایا رہا۔ ابتدا میں پاکستان نے سفارتی محاذ پر اسلامی وزرائے خارجہ کانفرنس بلا کر ان کاوشوں کی ابتدا کی جو جنیوا معاہدے کی صورت میں انجام پذیر ہوئیں۔ ۱۹۸۰ء کے ابتدائی مہینوں میں افغان مہاجرین کا ایک سیلاب تھا جو پاکستان چلا آ رہا تھا۔ اس سال دس لاکھ سے زائد مہاجرین کی پاکستان میں موجودگی نے ضیاء حکومت پر معاشی دباؤ بڑھا دیا تھا۔ حتّٰی کہ فوجی طور پر بھی معاملات پیچیدہ ہوتے جا رہے تھے۔ ۱۹۸۱ء تک روسیوں نے اپنی رسد کے راستوں اور شہری مراکز پر بھی اپنا کنٹرول بحال کر لیا تھا۔ اس وقت روسی افواج اس قدر طاقتور تھیں کہ افغان آرمی کی مدد کے بغیر ہی شہری مراکز پر اپنا کنٹرول قائم کر سکیں۔ گن شپ ہیلی کاپٹروں، ٹینکوں اور آرمڈ کاروں کے ذریعے روسی بڑی مہارت سے افغانستان پر اپنا کنٹرول قائم کر رہے تھے۔ عام شہری روسیوں سے ایسے ہی نفرت کرتا تھا جیسے وہ برطانوی سپاہ سے کیا کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ تحریکِ مزاحمت اس دور میں بھی برقرار رہی جب انہیں کہیں سے بھی مدد نہیں مل رہی تھی۔ گو ببرک کارمل کی حکومت قائم تھی لیکن افغان فوجی ''بھگوڑے'' ہو کر گوریلوں سے مل رہے تھے۔ پھر یہی فوجی ''جاہل اور غیر تربیّت یافتہ'' افغانوں کی فوجی تربیّت کرنے لگے۔ ''افغان بھگوڑے فوجیوں'' کی تعداد دن بدن بڑھنے لگی حتّٰی کہ افغان فوج میں ۴۰

فیصد سے بھی کم فوجی رہ گئے۔ جو روسی فوجیوں کی مدد کر سکتے تھے یہی وجہ ہے کہ روسیوں نے ابتدا ہی سے افغان فوجیوں پر اعتماد کرنا چھوڑ دیا تھا۔ نہ تو انہیں مشوروں میں شریک کیا جاتا اور نہ ہی انہیں منصوبہ سازی سے آگاہ کیا جاتا، حتیٰ کہ یہ صورتحال ۱۹۸۹ء میں روسی افواج کی اپنے وطن واپسی تک قائم رہی۔ دوسری طرف کارٹر انتظامیہ نے سفارتی سطح پر افغانستان میں روسی فوجی مداخلت کی مذمت کی اور تجارتی سطح پر کچھ ایسے اقدامات کی سفارشات مرتب کیں جن کا مقصد ناراضگی کا اظہار تھا۔ ماسکو میں ہونے والے اولمپکس کے بائیکاٹ کے علاوہ روس کو بھجوائی جانے والی ۷ ملین ٹن کی غذائی امداد بھی روکنے کی دھمکی شامل تھی۔ کچھ دنوں بعد اقوام متحدہ کے ۱۰۴ ممبر ممالک نے بھی ایسی ہی ایک مذمتی قرارداد منظور کر کے روسی فوجی مداخلت کی مذمت کی۔ فروری ۱۹۸۰ء میں امریکی وزیر خارجہ وارن کرسٹوفر نے پاکستان کا دورہ کیا ان کے ساتھ امریکی قومی سلامتی کے مشیر زبگنیو بھی تھے جنہوں نے ضیاالحق اور آغا شاہی سے مذاکرات کئے۔ انہوں نے صوبہ سرحد کے قریب افغان بارڈر کی صورتحال جاننے کیلئے بھی سفر کیا۔ اس طرح پاکستان کی دفاعی ضروریات کا جائزہ لیا۔ دوسری طرف سٹیٹ ڈپارٹمنٹ میں جنوبی ایشیا کے امور کے ماہر ہاورڈ شیفر نے اپنے ماہرانہ تجزیے میں "بھارت کو علاقے کی سب سے اہم طاقت قرار دیا۔" اس طرح پاکستان نئے سیاسی حالات میں بھی وقتی طور پر اہمیّت حاصل نہ کر سکا۔ کارٹر انتظامیہ نے عالمی سطح پر اپنا بھرم قائم رکھنے کیلئے پاکستان کو ۴۰۰ ملین ڈالر کی امداد کی پیش کش کی لیکن اس کے ساتھ ساتھ بھارت کو بھی یقین دلا دیا کہ امریکہ نہ صرف انڈیا کو جدید ہتھیار مہیا کرنے کیلئے تیار ہے بلکہ اسے بمبئی میں قائم ایٹمی پلانٹ میں استعمال ہونے والا ایٹمی ایندھن بھی فراہم کیا جائے گا۔ اس دور میں جب امریکی سفارت کار پاکستان کا دورہ کر رہے تھے ایک امریکی وزیر دفاع کلارک کلیفورڈ نئی دہلی کا دورہ کر رہا تھا جس نے اندرا گاندھی کو امریکی صدر جمی کارٹر کا پیغام پہنچا دیا تھا کہ امریکی حکومت نے پاکستان پر واضح کر دیا ہے کہ بدلتے ہوئے جغرافیائی حالات میں پاکستان کا ایٹمی پروگرام علاقے میں موجود کشیدگی میں اضافے کا باعث بنے گا۔" اس دور میں پاکستان کے بارے میں حکام کی سوچ کا اندازہ لگانے کیلئے ڈپٹی سیکرٹری آف سٹیٹ برائے جنوب مشرقی ایشیائی امور، جین کون کی اس تقریر کا حوالہ دینا ضروری ہے جو انہوں نے فروری ۱۹۸۰ء میں کانگریس کے ایک خصوصی اجلاس میں کی۔ بدلتے ہوئے حالات میں پاکستان کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں "اس وقت پاکستان ہی سب سے زیادہ متاثر ہونے والا ملک ہے...... ہم فوری طور پر چاہتے ہیں کہ پاکستان کے ساتھ مل کر ایسے ممالک سے بات چیت کی جائے جو پاکستان کو زائد

امداد دینے کیلئے تیار ہوں..... سعودی عرب پاکستان کو مضبوط بنانے کی اہمیّت سے آگاہ ہے..... اس دوران ہماری ٹیمیں پاکستانی حکّام سے مل کر اس کی دفاعی ضروریات کا جائزہ لے چکی ہیں ہم نے پاکستان کے دفاعی نظام کی خامیوں کو بھی پرکھا ہے اور اس بات پر بھی غور کر لیا ہے کہ انہیں کیسے دور کیا جاسکتا ہے..... ہم بغیر کسی معاہدے کے پاکستان کو نقد ادائیگی پر کچھ ہتھیار فراہم کرنے کے لئے تیار ہیں..... ہمیں امید ہے کہ ان ہتھیاروں کی خرید سے پاکستان اپنی شمال مغربی سرحدوں پر پیدا ہونے والے خطرات سے نمٹنے کیلئے تیار ہو جائے گا"۔ اب ذرا اس تقریر کو دیکھئے تو یہ بات بڑی واضح ہو جاتی ہے کہ امریکی حکام روسی افواج کے افغانستان میں داخلے کو کتنی اہمیّت دے رہے تھے ان کے نزدیک گو پاکستان کے دفاعی مسائل میں اضافہ ہو گیا تھا لیکن پاکستان کو خصوصی اہمیّت دے کر وہ بھارتی قیادت کو بھی ناراض نہیں کرنا چاہتے تھے اس لئے پاکستان کو "ہتھیاروں کی فروخت" کا پیغام دے کر انہوں نے بھارتیوں کو بھی جدید ہتھیار اور ایٹمی ایندھن فراہم کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اسی تناظر میں جنرل ضیاء الحق نے ۴۰۰ ملین ڈالر کی امریکی امداد کو "مونگ پھلی" قرار دے کر ٹھکرا دیا تھا۔ نومبر ۱۹۸۰ء میں اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی کا ایک اور اجلاس منعقد ہوا جس میں افغانستان کی تازہ ترین صورتحال کا جائزہ لیا گیا دس ماہ پہلے بھی دنیا کے ۱۰۴ ممالک نے "اشتراکی فوج کشی" کی مذمّت کی تھی اب پاکستان کے وزیرِ خارجہ آغا شاہی نے ایک اور قرارداد پیش کی جس میں اشتراکی افواج کے افغانستان سے "بلا تاخیر، بلا شرط اور مکمل انخلاء" کا مطالبہ شامل تھا۔ دس ماہ پہلے پیش اور پاس کی جانے والی قرارداد کا بھی کچھ اثر نہیں ہوا تھا اور اب بھی ایسا ہی ہونے کی توقع تھی روسی جارح قیادت اس سے پہلے بھی اسی قسم کی کئی قراردادوں کا حشر جانتی تھی اس لئے اب ان کیلئے "عالمی سفارتی دباؤ" کوئی خاص اہمیّت نہیں رکھتا تھا روسی افغانستان میں اپنی بیس سالہ سرمایہ کاری جمع سود وصول کرنے کیلئے یہاں پہنچے تھے۔ افغانستان سے روس کی طرف جانے والی برآمدات کا حجم بھی بڑھ گیا تھا۔ اس کے علاوہ افغانستان سے نکلنے والی قدرتی گیس بھی براہِ راست روس منتقل ہو رہی تھی۔ اس کی قیمت کا تعیّن بھی خود روس نے ہی کیا تھا۔ روسی اپنی سرمایہ کاری کے ثمرات جلد از جلد سمیٹ لینا چاہتے تھے۔ امریکیوں کے مذمّتی بیانات اور اقوامِ متحدہ کی قراردادیں نہ تو پہلے روسی توسیع پسندی کے راستے کی رکاوٹ بن سکی تھیں اور نہ اب ایسا کوئی امکان تھا۔

مئی ۱۹۸۰ء میں اسلامی کانفرنس کے ۳۵ ممبر ممالک نے ایک تین رکنی سٹینڈنگ کمیٹی قائم کی تھی جس کا سربراہ کانفرنس کے سیکرٹری جنرل کو مقرر کیا گیا تھا۔ پاکستان اور ایران کے وزرائے

خارجہ اس کے ممبران تھے۔ اس کمیٹی کے قیام کا مقصد "مسئلہ افغانستان کا پُرامن اور باوقار حل" تھا۔ کمیٹی نے سوئٹزرلینڈ میں پیپلز ڈیموکریٹک پارٹی آف افغانستان کے پرچمی و خلقی لیڈروں سے ملاقات کی کوششیں کیں۔ ببرک کارمل نے افغان نمائندوں کو کسی بھی ایسی کمیٹی سے رابطہ کرنے سے روک دیا جو افغانستان کی موجودہ حکومت کو سفارتی سطح پر تسلیم کرنے سے انکاری ہو۔ اسلامی کانفرنس نے جنوری ۱۹۸۰ء کے اجلاس میں افغانستان کی ممبرشپ معطل کرنے کے علاوہ کارمل انتظامیہ کو تسلیم کرنے کا فیصلہ بھی موخر کر دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ کارمل انتظامیہ نے کسی قسم کی بات چیت کے آغاز سے پہلے "افغان حکومت کو تسلیم" کرنے کی شرط عائد کر دی تھی۔ پاکستانی وزیر خارجہ آغا شاہی نے افغان مزاحمتی لیڈروں سے ملاقات کے بعد ۲۳ جولائی ۱۹۸۰ء میں سیکرٹری ایڈمنڈ مسکی سے واشنگٹن میں ملاقات کی اور انہیں مسئلہ افغانستان کے سیاسی حل کے متعلق پاکستان کے موقف سے آگاہ کیا۔ اس دور میں جنرل ضیاء الحق بھی سوویت قیادت سے رابطہ رکھے ہوئے تھے۔ جو بظاہر افغانستان میں "خانہ جنگی" کا خاتمہ چاہتی تھی۔ افغان وزیر خارجہ دوست محمد نے نومبر ۱۹۸۰ء کے جنرل اسمبلی کے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے افغانستان میں رونما ہونے والے واقعات کو "افغانستان کا داخلی معاملہ" قرار دیتے ہوئے امریکہ، چین اور پاکستان پر الزام لگایا کہ "وہ گوریلوں کو تربیت دے کر اور مسلح کر کے افغان حکومت کے خلاف کاروائیوں کیلئے بھیج رہے ہیں" روسی افواج کی افغانستان میں آمد کو "روس، افغان معاہدہ دوستی" کے عین مطابق قرار دیا۔ جنرل اسمبلی کے اسی اجلاس میں آغا شاہی نے تقریر کرتے ہوئے عالمی برادری کو افغان تحریکِ مزاحمت کے بارے میں تفصیلات مہیا کیں اور اسے روسی جارحیت کا ایک فطری ردِعمل قرار دیتے ہوئے پاکستان کے ملوث ہونے کے الزام کی پُرزور تردید بھی کی۔ انہوں نے پاکستان کی طرف سے "مسلم یا غیر جانبدار ممالک کے مبصروں کے علاوہ اقوامِ متحدہ کے نگرانوں کو تعینات کرنے" پر بھی رضامندی کا اظہار کیا۔ پاکستان کی طرف سے "عدم مداخلت" کی ضمانتوں کی فراہمی پر بھی رضامندی کا اظہار ہوا لیکن معاملات جوں کے توں ہی رہے۔ دنیا حیران و پریشان کھڑی مذمتی قراردادیں پاس کرتی رہی اور روسی اپنا کام دکھانے میں لگے رہے۔ سفارتی میدان میں بھارت سرکار نے بھی پاکستانی موقف کی تائید کی اور افغانستان میں بگڑتی ہوئی صورتحال پر تشویش کا اظہار بھی کیا لیکن دسمبر ۱۹۸۰ء میں جب روسی رہنما برژنیف نے نئی دہلی کا دورہ کیا تو وہاں نہ صرف "افغانستان میں اپنی ذمہ داریاں ادا کرنے" پر زور دیا گیا بلکہ خلیج فارس اور بحرِ ہند میں امن قائم کرنے کیلئے پانچ نقاطی فارمولا بھی پیش کر دیا،

جسے امریکی حکام نے وقت کا ایک بہت بڑا مذاق قرار دے کر مسترد کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی امریکہ کی طرف سے خلیج اور بحرِ ہند میں "ایٹمی ہتھیار سے پاک علاقہ" قائم کرنے کی تجویز پیش کی گئی۔ "سفارتی سطح پر کھیلی جانے والی اس آنکھ مچولی" کے ساتھ ساتھ روسی افغانستان میں اپنی قوت بھی بڑھا رہے تھے۔ انہوں نے بھارت کے ساتھ اپنے معاہدہ دوستی کی مزید پانچ سال کیلئے تجدید بھی کر لی اور روس کی طرف سے بھارت کو بر آمد کئے جانے والے تیل کی مقدار میں بھی اضافہ کر دیا گیا۔ کیونکہ ستمبر ۱۹۸۰ء میں ایران عراق جنگ شروع ہونے کی وجہ سے عراقی تیل کی در آمدات کم ہو گئی تھیں جسے زائد روسی بر آمدی تیل کے ذریعے پورا کیا جاتا تھا۔ "نیا ذہن" روسیوں سے ممکنہ مفادات حاصل کرنے کی پالیسی پر گامزن تھا۔ اس سلسلے میں مختلف ممالک کے رویّوں سے مجموعی طور پر ذاتی مفاد پرستی کی جھلک واضح طور پر دکھائی دیتی ہے۔ ہر قیادت اپنے ملکی مفادات کے مطابق اس نئی صورت حال پر ردِّ عمل ظاہر کر رہی تھی۔ بھارت سرکار کا رویّہ خاصا مضحکہ خیز بھی تھا۔ وہ ایک طرف افغانستان کی صورتحال پر تشویش کا اظہار کر رہی تھی۔ تو دوسری طرف روسی قیادت سے "دوستی کے معاہدے" کی تجدید کے ساتھ ساتھ "امداد" بھی حاصل کر رہی تھی۔ جبکہ پاکستان میں علماء اور سیاستدانوں سے لے کر ملکی سطح کے قائدین تک صورتحال کو سمجھنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے تھے یا انہوں نے غور و فکر ہی نہیں کیا تھا۔ دانشور حضرات طبقات میں بٹے ہوئے تھے۔ سرخ و سبز یا بائیں و دائیں کی تفریق کے سبب حقائق کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی جا رہی تھی۔ ہر طبقہ فکر معاملات کو اپنے مخصوص نقطہ نظر سے دیکھ رہا تھا۔ ولی خان کی عوامی نیشنل پارٹی اور جماعت اسلامی معاملات کی تشریح و تعبیر اپنے اپنے نقطہ نظر سے کر رہی تھیں۔ حکومت گومگو کا شکار تھی۔ اس دور میں ضیاء حکومت کی پالیسی کے بارے میں آغا شاہی رقمطراز ہیں "اس دور میں ہماری اور امریکہ کی ترجیحات مختلف تھیں۔ امریکی نئی صورتحال کو اپنے مفادات کے حوالے سے دیکھ رہے تھے۔ ان کے پیش نظر ویتنام کی جنگ کا تجربہ تھا روسی توسیعی اقدامات کر رہے تھے۔ امریکہ کو اس وقت روس کی داخلی کمزوریوں کا بھی اتنا پتہ نہیں تھا جتنا کہ بعد میں پتہ چلا۔ پاکستان کے سیاسی رہنما بھی یہی کہتے تھے کہ "اب روس افغانستان سے واپس نہیں جائے گا اس لئے ہمیں اس سے جھگڑا مول نہیں لینا چاہئے" ویسے روس کی تاریخ بھی ایسا ہی کہتی تھی کہ بڑھے ہوئے روسی قدم واپس نہیں ہٹے۔ روس نے کبھی کسی ایسے ملک پر حملہ نہیں کیا جس کی سرحدیں اس سے ملتی نہ ہوں۔ اس طرح وہ سپلائی لائن برقرار رکھ کر اپنے قبضے کو مستحکم کرتا تھا۔ افغانستان بھی اس کا ہمسایہ تھا۔ میں اس بات پر زور دیتا تھا کہ اس تاریخی تناظر میں

روس کا اگلا شکار ہم ہوں گے۔ زار شاہی روس کی تاریخ بھی یہی کہتی تھی اور اشتراکی روس کی تاریخ کے قرائن یہی بتاتے تھے۔ افغانستان پر اشتراکی فوج کشی کے بعد ہماری سرحدیں روس کے ساتھ جا لگی تھیں۔ ہمارے ایک طرف ہندوستان جیسا دشمن تھا تو دوسری طرف بھی دشمن آن بیٹھا تھا۔ روسی افواج کی موجودگی نے دشمن کی طرف سے خطرات کو اور بھی زیادہ وسیع کر دیا تھا۔ ہمارے قومی مفادات کو شدید خطرات لاحق ہو گئے تھے۔ میں نے پوری دنیا کے ماہرین سے اس مسئلے پر بات چیت کی۔ روسی اندازِ فکر کے بارے میں تجزیہ کیا اور پھر جنرل ضیاء الحق سے کھل کر بات کی۔ انہیں ملکی اور قومی مفادات کے مطابق پالیسی پر عمل پیرا ہونے کا مشورہ دیا لیکن انہیں شاید حالات وواقعات کا حقیقی ادراک نہیں تھا یا صورتحال کا مقابلہ کرنے کے حوصلے کی کمی۔ اس لئے وہ کوئی واضح قدم اٹھانے سے کتراتے رہے ویسے ملکی سطح پر بھی ان کی حکومت مسائل کا شکار تھی۔ بین الاقوامی سطح پر بھی ان کی حکومت کو "سندِ قبولیت" نہیں مل سکی تھی۔ اس لئے وہ مسئلہ افغانستان کو "اپنے اقتدار کو مضبوط" بنانے کے نقطہ نظر سے پرکھتے رہے حتیٰ کہ کچھ عرصے بعد انہیں اس حوالے سے یکسوئی حاصل ہو گئی۔ انہوں نے روسی افواج کی آمد کے بعد پیدا شدہ نئی صورتحال کو "ذاتی اقتدار کے استقرار" کے لئے استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور وہ آخری وقت تک صورتحال کو اسی نقطہ نظر سے استعمال کرتے رہے۔ ایسے دگر گوں حالات میں جنرل ضیاء الحق نے پالیسی سازی اور نئی صورتحال کی معاملہ فہمی کے لئے آئی ایس آئی کے جنرل اختر عبدالرحمٰن سے رابطہ قائم کیا اور پھر رواں صدی میں رونما ہونے والے ایک محیرالعقول واقع کی ابتدا ہوئی۔ دنیا کی عظیم عسکری طاقت سوویت یونین کی کمزوری کی ابتدا اور بالآخر خاتمے کا اعلان۔ مزاحمتی تحریک کا یہ طویل دور آٹھ سالوں پر محیط ہے۔ ۱۹۸۰ء سے لے کر ۱۹۸۷ء میں جنرل اختر عبدالرحمٰن کی آئی ایس آئی سے علیحدگی تک۔ اس طویل دور میں تحریکِ مزاحمت نے عروج حاصل کیا اور بالآخر روسی قیادت نے افغانستان پر لشکر کشی کے فیصلے کو غلط قرار دیتے ہوئے اشتراکی فوجیں واپس بلانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس طویل مزاحمتی دور کے ابتدا میں جنرل ضیاء الحق نے "دیکھو اور انتظار کرو" کی پالیسی اختیار کی۔ کیونکہ "صدر کو بخوبی اندازہ تھا کہ پاکستان انتہائی خطرناک جغرافیائی صورتحال سے دوچار ہے۔ مشرق میں ۸۰ کروڑ جارحانہ عزائم رکھنے والے ہندو بیٹھے تھے مغرب میں روس کی ریڈ آرمی افغانستان پر قبضہ جما چکی تھی اور اس بات کا شدید خطرہ تھا کہ پاکستان ان طاقتور دشمنوں کے درمیان آ کر چکی کے دو پاٹوں میں پس کر نہ رہ جائے" ☆ جنرل اختر نے سب سے پہلے تو صورتحال کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لیا۔ افغانستان کا جغرافیائی محلِ وقوع،

افغانوں کے فطری اوصاف ' خامیاں اور کمزوریاں ' پاک افغان سرحد کا جائزہ لینے کے بعد افغانوں کے طویل اور بہادرانہ تاریخی پس منظر کی روشنی میں یہ نتیجہ نکالا کہ اگر منتشر تحریکِ مزاحمت کو مناسب رہنمائی اور ٹریننگ کی سہولتیں مل جائیں تو انہیں "ناقابلِ شکست گوریلا فورس" کی شکل دی جا سکتی ہے۔ اس تجزیاتی رپورٹ میں امریکی مفادات ایران کی دلچسپیوں کے حوالے سے بھی مواد شامل تھا۔ جنرل اختر نے نہ صرف سفارش کی کہ پاکستان کو "جہادِ افغانستان" کا ساتھ دینا چاہئے بلکہ اس کا قابلِ عمل منصوبہ بھی پیش کیا جس کے مطابق اگر پاکستان راز داری کے ساتھ افغان تحریکِ مزاحمت کی حمایت کرے اور اسے ایک بڑی گوریلا جنگ میں تبدیل کر دے تو نہ صرف روسیوں کے بڑھتے ہوئے قدم روکے جا سکتے ہیں بلکہ انہیں افغانستان سے باہر بھی دھکیلا جا سکتا ہے۔ جنرل اختر نے بڑے واضح الفاظ میں "مسئلہ افغانستان" کے فوجی حل پر زور دیا تھا۔ صدر جنرل ضیاء الحق نے جنرل اختر سے کہا کہ "مجھے پاکستان اور بین الاقوامی سطح پر اپنی پوزیشن مضبوط بنانے کیلئے دو سال کا عرصہ چاہئے۔" اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ نہ تو امریکہ پاکستان کا حلیف تھا اور نہ ہی دیگر مسلم ممالک سرِدست کچھ امداد دینے پر آمادہ تھے ' اس لئے جنرل ضیاء الحق بھی تذبذب کی حالت میں تھے۔ لیکن جنرل اختر نے ایک پیشہ وارانہ سپاہی کے طور پر حالات کو پرکھا اور یقینِ محکم کے ساتھ "فوجی راستہ" اختیار کرنے کی منصوبہ بندی کی۔ پھر اسے بڑی مہارت اور چابکدستی سے عملی جامہ پہنایا۔ پورے آٹھ سال کے دوران نہ تو افغان جہاد میں اتنی شدّت کبھی نہ آئی کہ روس "گرم تعاقب" کے بہانے پاکستانی سرحدوں میں داخل ہوا اور نہ ہی جہاد کی طے شدہ پالیسی کے نفاذ کی رفتار میں کمی واقع ہوئی۔ اس ساری جنگی مہم کے دوران جنرل اختر تنی ہوئی رسی پر چلتے رہے۔ دراصل یہ ان کی عسکری مہارت اور پیشہ وارانہ دانش وبصیرت کا امتحان تھا کہ وہ روس پر فوجی دباؤ اس ہنرمندی سے ڈالیں کہ روس مشتعل ہو کر پاکستان کے ساتھ براہِ راست فوجی تصادم پر نہ اتر آئے۔ تاریخ میں یہ بات لکھی جا چکی ہے کہ جنرل اختر اس امتحان میں پورے اترے۔ اگرچہ روس پاکستان کے سرحدی علاقوں پر شیلنگ کرتا رہا ' بم بھی گرتے رہے ' تخریبی کاروائیاں بھی ہوتی رہیں لیکن روس نے کبھی بھی زمینی سرحد کی خلاف ورزی کرتے ہوئے فوجی حملے کی کوشش نہیں کی۔ اشتراکی جارحیّت سے پیدا ہونے والے مسئلہ افغانستان کے حل کیلئے جنرل اختر کا منصوبہ

١...... افغانستان سے روسی افواج کا انخلا

٢...... کابل میں مجاہدین کی حکومت کا قیام

جیسے دو نکات پر مشتمل تھا انہوں نے انہی نکات پر عمل کیلئے اپنی فوجی حکمتِ عملی ترتیب دی تھی۔ جب مارچ ۱۹۸۷ء میں انہیں فور سٹار جنرل کے طور پر پروموشن دے کر آئی ایس آئی سے الگ کر کے چیئرمین جوائنٹ چیف آف سٹاف مقرر کیا گیا تو روسی افواج کے انخلا کا تاریخی فیصلہ ہو چکا تھا۔ اختر کی عسکری منصوبہ بندی کا ہدفِ اوّل حاصل ہو چکا تھا اور دوسرا ہدف "فتح افغانستان" لبِ بام ہی رہ گیا تھا۔ جنرل اختر نے جب ۱۹۸۰ء میں عسکری حکمتِ عملی کا منصوبہ تیار کیا تو اس وقت کوئی بھی ان کا حامی نہیں تھا۔ جنرل ضیاء الحق کے سیاسی مخالفین ہی نہیں آغا شاہی سمیت پاکستان کا دفترِ خارجہ بھی جنرل اختر کی تجویز کردہ "عسکری مہم جُوئی" کا حامی نہیں تھا۔ ان کے خیال میں پاکستان فلسطینیوں کی حمایت کرنے والے عرب ممالک کے سے انجام کا شکار ہو سکتا ہے۔ مہاجروں کے پاکستان میں داخلے سے جرائم بڑھیں گے، غربت پھیلے گی، پاکستانی معیشت پر ناقابلِ برداشت بوجھ میں اضافہ ہو گا۔ دفترِ خارجہ کے ماہرین کا استدلال تھا کہ "روسی جہاں بھی داخل ہوئے تو پھر انہیں کوئی بھی وہاں سے نکال نہیں سکا ہے۔" ان کی بات تاریخی تناظر میں مبنی بر حقیقت تھی۔ پانچ صدیوں پر پھیلی ہوئی روسی تاریخ یہی بتاتی تھی۔ لیکن جنرل اختر کا جواب ہوتا کہ افغانیوں کی تاریخ بھی ایسی ہی ہے کہ ان کے ملک میں آج تک کوئی نہیں ٹھہر سکا ہے۔ دفترِ خارجہ ہی نہیں بلکہ بری افواج کے اعلیٰ جرنیل بھی جنرل اختر کے مجوزہ نظریے کا مذاق اڑاتے تھے کہ "افغانستان سے روسیوں کو فوجی دباؤ کے ذریعے نکالا جا سکتا ہے۔" ان میں کئی جرنیل ایسے بھی تھے جنہیں جنرل ضیاء الحق کی قربت بھی حاصل تھی۔ ان میں سے ایک جرنیل نے روس نواز عبدالولی خان سے کہا کہ جنرل ضیاء الحق حماقت میں مبتلا ہیں حالانکہ روسی چاہیں تو ٹینکوں میں نہیں مرسڈیز کاروں میں سوار ہو کر تین دن میں کراچی کے ساحل تک جا سکتے ہیں۔ جنرل اختر جب افغان گوریلوں کی کامیابیوں کے اعداد و شمار پیش کرتے تو ان کا مذاق اڑایا جاتا۔ پاکستان کے بہت سے دانشور اور صحافی یہ بات ماننے کیلئے تیار ہی نہیں ہوتے تھے کہ افغانستان میں کوئی جنگ ہو رہی ہے۔ کامیابیوں کے دعوؤں کو فریب قرار دیا جاتا تھا۔ فوج کے بعض جرنیل تو کامیابیوں کے ان دعوؤں کو جنرل اختر کا ایک ڈھونگ قرار دیتے تھے لیکن ستائش اور تنقید کی پرواہ کئے بغیر اختر اپنے وضع کردہ منصوبے کو عملی جامہ پہناتا رہا۔ ابتدا میں جنرل ضیاء الحق نے بھی جنرل اختر کو یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کی ابتدا کیسے کریں۔ سارا کام صفر سے شروع کرنا تھا۔ بظاہر مادی اسباب کسی بھی ممکنہ کامیابی کی طرف اشارہ نہیں کر رہے تھے لیکن ایک امید تھی، یقین تھا، عزم صمیم تھا۔ جنرل کا سارا تجربہ، وقار اور سب کچھ داؤ پر لگ چکا تھا۔

مسئلہ افغانستان کے "فوجی حل" کا منصوبہ پیش کر کے جنرل نے خود کو سب کے سامنے پیش کر دیا تھا۔ اب اس سے پیچھے ہٹنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ "مسئلہ افغانستان کے فوجی حل" کی طرف پیش رفت کا آغاز پاک فوج کے اسلحہ ڈپوؤں میں موجود متروک ۳۰۳ رائفلوں کے حصول سے ہوا۔ یہ رائفلیں افغان حرّیت پسندوں کو دی گئیں۔ آئی ایس آئی کے افسروں کو یہ واضح طور بتا دیا گیا تھا کہ اس سارے معاملے میں انتہائی راز داری کا مظاہرہ کیا جانا ضروری ہے کیونکہ اس منصوبے کا - کلیدی پہلو' ہی راز داری ہے۔ اگر اس کھیل کے اسرار ور موز روسیوں پر منکشف ہو گئے تو معاملہ بگڑ جائے گا۔ اس راز داری کو برقرار رکھنے کیلئے آئی ایس آئی کے افسروں کو قلیوں کے طور پر بھی کام کرنا پڑا اور وہ بعض اوقات ساز و سامان خود اپنے کندھوں پر اٹھا کر حرّیت پسندوں تک پہنچاتے۔ اس دور میں جن افغان لیڈروں کو اعتماد میں لیا گیا انہیں بھی راز داری برتنے کی تاکید کی گئی۔ انہیں اس راز داری کی اہمیّت سے آگاہ کر دیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ کافی عرصہ تک مختلف محاذوں پر ہی نہیں بلکہ ایک ہی محاذ پر مزاحمت کرنے والے مختلف گروہوں کو بھی ایک دوسرے کے آپریشنوں کا پتہ نہیں ہوتا تھا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے پورے افغانستان میں مزاحمت کسی خود رو سبزے کی طرح پھوٹ پڑی۔ افغانستان کے طول و عرض افغان مزاحمتی تحریک کی فوجی سرگرمیوں سے لرزنے لگے۔ روسی جو مزاحمت کو چند ہفتوں میں کچلنے کے منصوبے لے کر آئے تھے اس موثر ردعمل سے پریشان ہوئے لیکن انہوں نے اپنے انداز میں اس مؤثر ردِ عمل کو مؤثر طریقے سے کچلنے میں ذرا بھی تامل کا مظاہرہ نہیں کیا۔ راستوں پر پہرے بٹھا دیئے اور آبادیوں کو بلڈوز کرنا شروع کر دیا۔ شک اور اندازے کی بنیاد پر معصوم اور بے گناہ افغانوں کو موت کے گھاٹ اتارنا شروع کر دیا۔ اسی دورِ وحشیانہ میں روسیوں نے گڑھے کھود کر درجنوں بچوں 'بوڑھوں اور عورتوں کو زندہ دفن کیا۔ مزاحمت کے پھوٹتے ہی روایتی روسی وحشیانہ مظالم کھل کر سامنے آنے لگے۔ قتل و غارت گری کے اس سیلاب کا مقابلہ کرنے کیلئے اسلحہ و گولا بارود کی ضرورت تھی۔ تربیّت یافتہ فوج جس کی رسد یقینی ہو کا مقابلہ کرنے کیلئے کم از کم دفاعی و مزاحمتی ہتھیاروں کی ضرورت تھی۔ امریکہ اور مغربی ممالک مزاحمتی تحریک کو "ہفتوں" کی مار سمجھے ہوئے تھے پھر اسلحہ کہاں سے آتا۔ مغربی و امریکی اخبارات "افغان گوریلوں" کو باغی کہتے تھے۔ سی آئی اے اور پینٹاگون نے امریکی حکومت کو "مزاحمتی تحریک" پر قومی وسائل "ضائع نہ کرنے" کا مشورہ دے رکھا تھا۔ ایسے حالات میں مزاحمتی تحریک کو شروع کرنا اور پھر نامساعد حالات کے درمیان جاری رکھنا ہی ایک معجزے سے کم نہیں جس کیلئے جہاں جنرل اختر کو خراج

عقیدت پیش کرنا ضروری ہے وہاں افغانوں کے ناقابلِ تسخیر جذبۂ حریّت کو سلام پیش کرنا بھی اتنا ہی اہم ہے جنھوں نے اپنی جانوں کی پرواہ کئے بغیر ایسے وقت میں "سرخ خونخوار ریچھ" سے پنجہ آزمائی شروع کی جب بیرونی امداد ملنے کا دور دور تک امکان نہیں تھا۔ ڈگمگاتی 'ابھرتی' ہچکولے کھاتی اس تحریکِ مزاحمت نے اپنے آپ کو نہ صرف ابتدائی چند مہینوں میں زندہ رکھا بلکہ اپنوں اور دشمنوں کی بھرپور توجّہ بھی اپنی جانب مبذول کروالی۔ کیونکہ جنہیں وہ کمزور اور چند ہفتوں کا مہمان سمجھے بیٹھے تھے انہوں نے مہینوں تک اپنے آپ کو زندہ اور زندگی کا ثبوت مہیا کرنے والے ثابت کر کے انہیں حیران کر دیا تھا۔

اس دور میں امریکہ اور یورپی اقوام کی توجّہ پولینڈ کی طرف تھی جہاں تحریکِ مزاحمت کو روسیوں نے بڑے مؤثّر انداز میں کچل کر رکھ دیا تھا۔ ۱۹۷۹ء میں جب نئے پوپ جان پال دوم نے پولینڈ کا دورہ کیا تھا تو ۶۰ لاکھ پول باشندوں نے ان کا والہانہ استقبال کر کے ان کے ساتھ یکجہتی کا اظہار کیا تھا۔ اس سے پولینڈ کی اشتراکی حکومت کے خلاف سرگرم عمل "سالیڈیریٹی تحریک" کو خاصی تقویت بھی ملی تھی لیکن اشتراکیوں نے بڑی جرأت اور شدّت کے ساتھ اس تحریک کو کچل کر رکھ دیا تھا۔ ۱۹۸۱ء میں نہ صرف اس تحریک کو خلافِ قانون قرار دے دیا گیا بلکہ مارشل لا کے نفاذ کے ذریعے ممکنہ ردِّعمل کے امکانات کو بھی ختم کر دیا تھا۔ مشرقی یورپ میں سوویت یونین کی آخری سرگرمی بھی کامیابی سے ہمکنار ہو گئی تھی۔ یقیناً گون سی آئی اے اور چرچ سب مل جل کر بھی پولینڈ میں اپنی کارکردگی نہیں دکھا سکے تھے۔ دوسری طرف جب افغانستان میں تحریکِ مزاحمت نے اپنی زندگی کا عملی ثبوت مہیا کرنا شروع کیا تو حالات نے ایک نئی کروٹ لی۔ امریکیوں کو یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ یہ سب جانیں کہ روسیوں کے مدِّمقابل "نہتے اور غیر مہذّب" افغانوں کو مزاحمت کی کیسے جرأت ملی اور وہ اب تک کیسے زندہ وباقی ہیں۔ اسی دور میں امریکی سینیٹرز' کانگریس کے ممبران اور سی آئی اے کے اہلکار اسلام آباد پہنچنے لگے۔ ان سب کیلئے مزاحمتی تحریک کا پھُوٹ پڑنا بڑا عجیب وغریب تھا۔ ہر کوئی اس مزاحمتی تحریک کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ جنرل اختر عبدالرحمان اپنے ان مہمانوں کو بڑے سادہ اور بے ساختہ انداز میں کسی استاد کی طرح بات سمجھانے کی کوشش کرتے۔ افغانستان کے جغرافیائی' سیاسی اور فوجی حقائق انہیں ازبر ہو چکے تھے۔ افغانستان کی تاریخ پر بھی ان کی گہری نظر تھی اور سب سے بڑھ کر انہیں یقینِ کامل تھا کہ "تحریکِ مزاحمت" کے ذریعے اشتراکیوں کو ہزیمت سے ہمکنار کر دیں گے۔ وہ اس لئے بھی یقین سے بات کر سکتے تھے کہ حریّت پسندوں نے نہ صرف حسبِ توقّع بلکہ توقّعات

سے کہیں بڑھ کر زیادہ کامیابیاں حاصل کرلی تھیں۔ جنرل اختر مغرب سے آنے والوں کو بڑے واضح اور سادہ الفاظ میں "تحریکِ مزاحمت" کی عسکری، جغرافیائی اور سیاسی اہمیّت سے آگاہ کرتے۔ اس طرح امریکی آہستہ آہستہ جنرل اختر کے ہم خیال ہونے لگے۔ جنرل اختر کی عسکری حکمتِ عملی نے رنگ دکھانا شروع کر دیا تھا۔ دوسری طرف پاکستان کا دفترِ خارجہ مسلسل اس بات پر زور دے رہا تھا کہ پاکستان روس اور کابل انتظامیہ سے براہِ راست بات چیت کے ذریعے معاملات طے کرے۔ حتّٰی کہ بعض اہلکار تو حکومت کو "دھمکی آمیز" انداز میں مشورہ دیتے کہ اگر یہ موقع ہاتھ سے نکل گیا تو پاکستان کو پچھتانا پڑے گا۔ جنرل اختر کی اس وقت بھی یہ رائے تھی کہ روس نہ تو پہلے کبھی پاکستان کا دوست تھا اور نہ اب کبھی اسے معاف کرے گا اس لئے آزاد اور مجاہدوں کا افغانستان ہی پاکستان کے تحفّظ کا بہترین راستہ ہے ایسا۔ افغانستان جہاں پاکستان کے دوست حکمران ہوں، نہ صرف علاقے میں پائیدار امن کا ضامن ہوگا بلکہ علاقائی طاقت کے توازن کو پاکستان کے حق میں کر دے گا۔ دنیا کے ایک خطے سے لے کر دوسرے خطے تک مغربی و مشرقی دنیا کے اخبارات کوہِ ہندوکش میں اشتراکیوں سے پنجہ آزما گوریلوں کے تذکروں سے بھرے پڑے تھے لیکن پاکستان میں تو جیسے سیاستدانوں اور اخبارات کو جنرل ضیاءالحق سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ ملک میں ہر خرابی کا ذمّہ دار انہیں ٹھہرایا جاتا۔ ملک میں بڑھتے ہوئے لاء اینڈ آرڈر کو افغان مہاجرین اور مجاہدین کے ساتھ وابستہ کر دیا جاتا۔ ۱۹۸۱ء میں ہتھوڑا گروپ کی وارداتوں نے ملک میں سراسیمگی پھیلا دی۔ افغان تحریکِ حریّت کے خلاف زہریلا پروپیگنڈہ ہونا شروع ہو گیا۔ آئی ایس آئی نے اس مسئلے پر خاصی محنت کی اور "ہتھوڑا گروپ" کی سرگرمیوں کا راز معلوم کیا۔ اس کے پیچھے ایک افریقی ملک کا ہاتھ تھا۔ ثبوت کے طور پر ایک سفارتکار کو بھی پکڑا گیا لیکن اس کا چرچا اس لئے نہیں کیا گیا کہ ایسا کرنا شاید ملکی مفادات کے برعکس تھا۔ لیکن یہاں بے شمار سیاسی گماشتے اور تنخواہ دار صحافی افغانیوں پر الزام دھرتے رہے۔ حالانکہ یہ کیسے ممکن تھا کہ جس سرزمین نے انہیں دارالحرب سے نکل کر یہاں پناہ دی تھی وہ ایسے دارالامن کو کیسے عدمِ استحکام کا شکار کرنے میں ملوث ہو سکتے تھے۔ لیکن نام نہاد سیاسی دانشور معقولیّت کی بجائے "خاد" اور "کے جی بی" کے افواہ سازوں کے جال میں پھنس کر منفی پروپیگنڈہ کرنے میں مصروف تھے۔ بائیں بازو کے نام نہاد دانشوروں کی سمجھ میں یہ بات آ ہی نہیں رہی تھی کہ ان کے مُربّی و مرشد سوویت یونین نے ایک غریب اور بے بس ملک پر لشکر کشی کی تھی اور اسے کس انداز میں مزاحمت کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ سوشلزم جس نے ابھی تک کامیابیاں ہی کامیابیاں حاصل کی

تھیں لیکن یہاں آ کر وہ ذلیل ورسوا ہونے لگا تھا۔ ساری دنیا اس پر نفرین تو بھیج رہی تھی لیکن اس پر اس کا ذرا سا بھی اثر نہیں ہوا تھا۔ اصل مسئلہ مزاحمتی تحریک کے ہاتھوں ذلیل ورسوا ہونے کے سبب پیدا ہوا تھا۔ پاکستان میں پھیلتی ہوئی ہیروئن کی وبا کو بھی افغانوں کے ساتھ ہی وابستہ کر کے پیش کیا جاتا تھا، حالانکہ ۱۹۸۷ء تک ہیروئن کی ایک فیکٹری بھی افغانستان میں نہیں تھی۔ ہیروئن سازی قبائلی علاقوں میں ہوتی تھی اور اس کی ترسیل کا انتظام کرنے والے مغربی ممالک کے وہ سمگلر تھے جو اس ہنر کے اسرار ورموز سے آشنا تھے۔ حتیٰ کہ ہیروئن سازی میں استعمال ہونے والا مادہ کیمیائی بھی مغربی ممالک سے سمگل ہو کر یہاں پہنچتا تھا۔ کوہِ ہندوکش میں پلنے والی مزاحمتی تحریک اور جنرل اختر سے ملاقاتوں کے نتیجے میں امریکیوں کی سوچ میں تبدیلی آئی۔ اس سے پہلے امریکی سوویت اقدامات کو "ناقابلِ واپسی" سمجھتے تھے اس لئے روسی جہاں کہیں بھی فوج کشی کرتے یا کسی ملک کو اپنے دائرہ اثر میں لانے کا منصوبہ بناتے تو امریکی اس علاقے یا ملک کو چھوڑ کر اس کے اردگرد اپنے مفادات کے تحفّظ کی فکر میں لگ جاتے۔ دسمبر ۷۹ء میں افغانستان پر لشکرکشی کے بعد بھی کارٹر انتظامیہ نے ایسا ہی رویّہ اختیار کیا تھا۔ پاکستان کو ۴۰۰ ملین ڈالر کی امداد دے کر اشتراکی جارحیت کے بڑھتے ہوئے اثرات کو روکنے کی کوشش کی جسے جنرل ضیاء الحق نے ٹھکرا دیا۔ پھر جب جنرل اختر کی عسکری حکمتِ عملی کے نتیجے میں امریکیوں کی سوچ میں تبدیلی آئی اور انہوں نے سوویت یونین کے قیام اور جنگِ عظیم دوم کے بعد پہلی مرتبہ اشتراکیوں کو روایتی انداز سے ہٹ کر چیلنج کرنے کا فیصلہ کیا۔ افغانستان میں تحریکِ مزاحمت کے حوصلہ افزا نتائج دیکھ کر سی آئی اے اور پینٹا گون کے حکّام نے سوچا کہ اشتراکی ناقابل تسخیر نہیں ہیں۔ اگر کوہِ ہندوکش کے رہنے والے افغان اشتراکی افواج کو للکار سکتے ہیں تو کیا پولینڈ میں کچلی ہوئی مزدور تحریک کو زندہ کر کے اشتراکیوں کو للکارا نہیں جا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ریگن انتظامیہ نے سوویت یونین کے خلاف "دو شاخی پالیسی" اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس ایک شاخ کا تعلق افغانستان سے تھا۔ یہ کھلی اور واضح پالیسی تھی جس نے ۳.۲ء ملین ڈالر کی امداد کی صورت اختیار کی، جبکہ دوسری شاخ پوشیدہ تھی اور اس کا تعلق پولینڈ سے تھا۔ ۷ر جون ۱۹۸۲ء ویٹیکن سٹی، لائبریری ہال میں پوپ کے خصوصی کمرے میں عیسائی دنیا کی معزز ترین شخصیت پوپ جان پال دوم اور دنیا کی سیاست کی مقتدر ترین شخصیت امریکی صدر رونالڈ ریگن، دونوں سر جوڑے بیٹھے ہیں۔ مشرقی یورپ میں بڑھتے ہوئے اشتراکی اثرات کے علاوہ، افغانستان میں تحریکِ مزاحمت کی حیرت انگیز موجودگی زیرِ بحث ہے۔ پینٹا گون اور سی آئی اے کے ماہرین کے تجزیوں کی روشنی میں سوویت یونین کے خلاف عملی

جدوجہد کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ یہ ملاقات پچاس منٹ تک جاری رہی اور پھر عظیم اشتراکی سلطنت کے خلاف طویل وجامع آپریشن کرنے کافیصلہ کرلیا۔ ریاست اور چرچ ' سیاست اور مذہب نے مل کر اشتراکی عفریت کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ یہ سوچ جنرل اختر عبدالرحمان کے افغانستان میں اشتراکیوں کے خلاف "عسکری منصوبہ بندی" سے اخذ کردہ تھی۔ جسے افغان مجاہدین کی چند سالہ محیرالعقول کامیابیوں نے ریگن اور پوپ کو عملی صُورت دینے کیلئے آج یہاں مل بیٹھنے کا حوصلہ دیا تھا۔ دوسرے کمرے میں آگٹینو کارڈینل کسارولی اور آرچ بشپ آچیل سلوسٹرینی (پوپ کے نمائندے) امریکی وزیر خارجہ الیگزینڈر ہیگ اور امریکی صدر کی قومی سلامتی امور کے مشیر جج ولیم کلارک بھی سر جوڑے معاملات طے کر رہے تھے۔ اشتراکیت اور سوویت یونین کی عسکری قوت سے ٹکر لینے کی منصوبہ بندی کی جارہی تھی۔ پولینڈ مشرقی یورپ میں اشتراکی گڑھ بھی تھا اور پوپ جان پال کی جائے پیدائش بھی۔ پچھلے سال یعنی ۱۹۸۱ء میں پولش حکومت نے اینٹی کمیونسٹ مزدور تحریک کو خلاف قانون قرار دے کر بڑی طرح کچل دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہاں ہر قسم کی "سیاسی سرگرمیوں" پر پابندی عائد کر دی گئی تھی۔ کسی قسم کی سرگرمی سیاسی یا غیر سیاسی خلافِ قانون تھی۔ پولش حکومت نے معاملات پر کڑی نگرانی رکھنی شروع کر دی تھی۔ سی آئی اے نے افغانستان کی صورتحال کا تجزیہ کیا۔ ۱۹۸۰ء تا ۱۹۸۲ء تک مزاحمتی تحریک کی کامیابیوں کا مطالعہ کیا تو انہیں اندازہ ہوا کہ اگر افغانستان میں ایک لاکھ روسی افواج کی موجودگی میں مزاحمتی تحریک نہ صرف زندہ رہ سکتی ہے بلکہ اپنے وجود کا اظہار بھی کر سکتی ہے تو پھر کیا وجہ کہ پولینڈ میں مزدور تحریک کو زندہ کیوں نہیں رکھا جا سکتا۔ کیا افغانستان جیسی صورتحال پولینڈ میں بھی پیدا نہیں کی جا سکتی ' اور سب سے اہم افغانستان کی صورتحال کو اشتراکیوں کیلئے مزید خطرناک کیوں نہیں بنایا جا سکتا۔ اشتراکیوں کے خلاف مورچہ زن مجاہدین کو منظم کرنے والے جنرل اختر کا خیال ہی نہیں بلکہ یقین محکم بھی یہی تھا کہ "افغانستان روسیوں کا ویت نام بن سکتا ہے۔" بدلتے حالات ایک سمت میں اشارہ کر رہے تھے۔ "اشتراکی عسکری طور پر ناقابلِ تسخیر نہیں ہیں" ۔ "افغانستان میں ان کا فوجی بھرم کھل رہا تھا۔" تحریکِ مزاحمت نے افغانستان کو روسیوں کیلئے ایک ایسی دلدل بنا دیا تھا جس سے ان کا سلامت نکلنا مشکل دکھائی دے رہا تھا۔"

پوپ جان پال اور رونالڈ ریگن نے اصولی طور پر اتفاق کیا کہ افغانستان میں مزاحمتی تحریک کی تین سالہ کامیابیوں کے علی الرغم پولینڈ کو بھی سوویت پنجے سے نکالا جا سکتا ہے ' اگر سالیڈیریٹی تحریک کو کسی نہ کسی طریقے سے زندہ رکھا جائے تاکہ پولش حکومت کو چین نصیب نہ ہو۔ ویٹی کن اور

امریکی وسائل کے ذریعے سالیڈیریٹی تحریک کو خفیہ طور پر زندہ رکھ کر پولش حکومت کو کمزور کرنے کی پالیسی اختیار کی گئی۔ ریگن ' پال کی نگرانی میں ایک ایسا نیٹ ورک قائم کیا گیا جس کا مقصد نہ صرف سالیڈیریٹی تحریک کی قیادت کو لمحہ بالمحہ بدلتے ہوئے حالات کے مطابق رہنمائی اور راست اقدامات کے لئے تیار رکھنا تھا بلکہ ایسے مادی وسائل کی فراہمی بھی تھا جن کے ذریعے زیر زمین تحریک زندہ رہے۔ لیخ ولیسا اور تحریک کے دوسروں رہنماؤں کے ساتھ روابط کا ایک طویل جال قائم کیا گیا۔ یہ رابطے چرچ پادریوں سے لے کر امریکی و یورپی لیبر ایکسپرٹوں اور دیگر ایسے افراد کے ذریعے ہوتے تھے جو پولش حکومت میں سرکاری عہدوں پر فائز ہوتے تھے۔ انہی افراد کے ذریعے پولش حکومت کی پالیسیاں ماسکو کے ساتھ ہونے والے رابطے اور صلاح مشورے بھی امریکیوں کے علم میں آ جاتے۔ ان کے علاوہ سی آئی اے نے اپنے جاسوسوں کا بھی ایک جال پھیلا رکھا تھا جو ہر لمحہ صورتحال پر نظر رکھتے تھے۔ تحریکی سرگرمیوں کو جاری رکھنے کیلئے سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں ٹن سامان بشمول فیکس مشینیں' پرنٹنگ مشینیں' ٹرانسمیٹر 'کمپیوٹر ٹائپ رائیٹر اور دیگر سامان خفیہ ذرائع سے سمگل کر کے پولینڈ پہنچایا گیا۔ ان خفیہ ذرائع میں امریکی ایجنسیوں کے علاوہ امریکن فیڈریشن آف لیبر اینڈ کانگریس آف انڈسٹریل آرگنائزیشن (AFL-CIO) کے نمائندے اور یورپی مزدور تحریکوں کے افراد شامل تھے۔ سالیڈیریٹی کو زندہ رکھنے کے لئے مالی ذرائع سی آئی اے اور ویٹی کن میں مغربی ٹریڈ یونینوں کے خفیہ فنڈوں پر مشتمل تھے۔ خفیہ تحریک کے ذریعے پولینڈ میں اشتراکیوں کو ناکامی سے ہمکنار کرنے کا مطلب 'مشرقی یورپ میں اشتراکیوں کے خاتمے کی ابتدا تھا۔ یالٹا کانفرنس میں یورپ کی تقسیم کے ذریعے مشرقی یورپ پر روسی عملداری تسلیم کر لی گئی تھی۔ اس کے بعد ۱۹۸۰ء تک ہر اس علاقے پر روسی عملداری تسلیم کی جاتی رہی تھی جس پر سوویت یونین اپنا حق جتاتا۔ حتیٰ کہ پولینڈ پر بھی اشتراکی اثر و نفوذ بالفعل تسلیم کر لیا گیا تھا۔ جب ۱۹۸۱ء میں پولینڈ میں سالیڈیریٹی تحریک کو خلافِ قانون قرار دے کر ملک میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا تھا۔ جون میں پوپ جان پال کے ساتھ اپنی اس خفیہ ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے رونالڈ ریگن نے بتایا کہ "ہم نے یالٹا میں کئے گئے تقسیم یورپ کے فیصلے کو بڑی غلطی تسلیم کیا اور فیصلہ کیا کہ اس بارے میں کچھ کرنا چاہئے۔ افغانستان میں تحریکِ مزاحمت کے بارے میں رپورٹوں کے حوالے سے سوویت یونین کی کمزوریوں اور اس حوالے سے" اشتراکیوں کے خلاف مورچہ زنی نہیں ہو سکی تھی' کیونکہ "کارکنوں کی یونین" سے بُری چیز شاید ہی کوئی اور ہو جو روسیوں کیلئے ناپسندیدہ ہو۔" یہی وجہ

ہے کہ روسیوں نے ۱۹۸۱ء میں اس پر پابندی لگادی تھی۔ پوپ جان پال اور صدر ریگن کی اس خفیہ ملاقات کے بعد چھ ہفتوں کے وقفے سے دونوں پر قاتلانہ حملے ہوئے اور حیرت انگیز طور پر دونوں نے بچنے کے بعد ایک ہی طرح کے بیانات دیئے۔ امریکی قومی سلامتی کے مشیر کلارک نے قاتلانہ حملوں کے بعد امریکی صدر رونالڈ ریگن اور پوپ جان پال کی ایک گفتگو کے حوالے سے بتایا کہ ان دونوں نے قاتلانہ حملوں کو "شیطانی قوّتوں کی حرکت" اور اپنے بچ جانے کو "معجزہ" قرار دیا۔ دونوں "مقدّس مشن" کی تکمیل کیلئے بچ رہے۔ اس "مقدّس مشن" کی تکمیل کا سہرا سی آئی اے کے ڈائریکٹر ولیم کیسی کے سر بندھتا ہے کیونکہ ولیم کیسی کو جنرل اختر عبدالرحمان کی طرح اس بات پر یقینِ محکم ہو گیا تھا کہ "اشتراکی ناقابلِ تسخیر" ہرگز نہیں ہیں۔ مشرقی یورپ کے امور کا پولش ماہر سابق کانگرس ممبر ایڈورڈ ڈرونسکی کے بقول "ولیم کیسی کو پختہ یقین تھا کہ اشتراکی نظام کھوکھلا ہو گیا ہے۔ اسے دھکّا دے کر گرایا جاسکتا ہے اور مشرقی یورپ میں یہ کام پولینڈ میں سالیڈیریٹی تحریک کے ذریعے پایہ تکمیل تک پہنچایا جاسکتا ہے۔" ولیم کیسی نے پولینڈ میں پرانی طرز پر کام کیا۔ ولیم کیسی دوسری جنگِ عظیم کے دوران (STRATEGIC SERVICES OFFICE) میں تعیناتی کے دوران اس طرح کے کاموں کا خاصا تجربہ کر چکے تھے۔ سی آئی اے میں اپنی تعیناتی کے ابتدائی ایام میں بھی ولیم کیسی اسی قسم کے تجربات سے گزر چکے تھے۔ یہ ولیم کیسی کا ہی کمال تھا کہ انہوں نے سوشلسٹ انٹرنیشنل کے بچے کھچے عناصر کو سالیڈیریٹی تحریک کے پرچم تلے جمع کر دیا تھا۔ مغربی یورپ میں بھی سی آئی اے نے ایسی سوشل ڈیموکریٹک پارٹیاں قائم کی تھیں جو جنگِ عظیم دوم کے بعد مختلف ممالک میں اینٹی کمیونسٹ حکومتیں قائم کرنے میں مددگار ثابت ہوئی تھیں۔ ولیم کیسی کو ایسے کاموں میں ایک خاص ملکہ حاصل تھا۔ پولینڈ میں یہ کام عیسائیوں کی اکثریّت کو جمع کر کے ایک جمہوری طرزِ حکومت قائم کر کے کیا جانا تھا۔ یہاں یہ بات جان لینا ضروری ہے کہ مشرقی اور مغربی یورپ میں سی آئی اے کے سارے کھیل سیاسی الٹ پھیر پر مشتمل تھے، جبکہ پولینڈ کے اس خفیہ آپریشن میں اس بات کا بھرپور امکان تھا کہ اشتراکی اپنی فوجی قوت کو بھی میدان میں لے آئیں گے۔ امریکی اشتراکی فوجی قوّت کا سامنا کرتے ہوئے ہمیشہ کتراتے رہے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ روس نے جہاں بھی فوجی طاقت استعمال کی، سی آئی اے نے وہاں سے مراجعت کر لی۔ کیونکہ سوویت یونین کے فوجی اقدامات کے بارے میں پینٹا گون اور سی آئی اے کے اہلکاروں کا پختہ خیال تھا کہ وہ ناقابلِ واپسی (IRREVERSIBLE) ہوتے ہیں۔ داخلی مزاحمت کے بغیر کسی جارح طاقت کو دور سے آکر مراجعت پر مجبور نہیں کیا جا

سکتا ہے۔ ویسے بھی اب تک مزاحمتی تحریکوں کو اشتراکی فوجی بُری طرح کچلنے میں خاصے مشہور تھے' اس لئے امریکی ان سے نفسیاتی طور پر بھی دبتے تھے۔ لیکن افغانستان کی تحریکِ مزاحمت نے تین سالوں (۸۳۔ ۱۹۸۰ء) میں حیرت انگیز استقامت اور مقاومت کا مظاہرہ کر کے "اشتراکی افواج کے ناقابلِ تسخیر ہونے کے تصوّر" کو مشکوک بنا دیا تھا اس لئے اب سی آئی اے نے بڑے محتاط اور طے شدہ اندازوں کے مطابق آپریشن کا آغاز کیا تھا۔

پولینڈ میں مارشل لاء کے نفاذ کے حوالے سے امریکی سی آئی اے کے ایجنٹ پولینڈ کے ڈپٹی منسٹر آف ڈیفنس کا کہنا ہے کہ "اگر ۱۳ دسمبر ۱۹۸۱ء میں پولینڈ میں مارشل لا کے ذریعے حالات پر قابو نہ پالیا جاتا تو یہ بات طے شدہ تھی کہ روسی افواج پولینڈ میں داخل ہونے کیلئے بالکل تیار تھیں۔ " یہی وجہ ہے کہ پوپ جان پال نے روسی حکّام کو باضابطہ طور پر اطلاع بھجوا دی تھی کہ "اگر روسیوں نے پولینڈ میں مداخلت کی تو وہ فوراً پولینڈ پہنچ جائیں گے اور پولش عوام کے درمیان رہنا شروع کر دیں گے" لیکن یہ نوبت ہی نہ آ سکی اور پولینڈ میں مارشل لاء کے ذریعے سالیڈیریٹی کو خلافِ قانون قرار دے کر اس کے ہزاروں کارکنوں اور لیڈروں کو جیلوں میں بند کر دیا گیا تھا۔ ولیم کیسی نے جو اس سے پہلے افغانستان میں تحریکِ مزاحمت کے نشیب و فراز کا بغور مطالعہ کر رہے تھے 'پولینڈ میں نئی صورتحال کو افغانستان میں پنپنے والی مزاحمتی تحریک کے تجربے کے حوالے سے پرکھا اور پھر فوری منصوبہ بندی کے ذریعے اس خلا کو پُر کرنے کی کوشش کی جو مارشل لاء کے نفاذ اور سالیڈیریٹی پر پابندی کے باعث پیدا ہوا تھا۔ سالیڈیریٹی تحریک کو خفیہ امداد کے ذریعے زندہ رکھ کر پولش حکومت کو کمزور کرنے اور بالآخر ختم کرنے کا منصوبہ بنایا گیا۔ سی آئی اے کے ڈائریکٹر ولیم کیسی اور ریگن کے قومی سلامتی کے امور کے مشیر جج ولیم کلارک نے امریکی صدر رونالڈ ریگن اور پوپ جان پال کے مشوروں اور نگرانی میں کام کرنا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ اور مشرقِ وسطیٰ کے تمام دوروں کے دوران ولیم کیسی نے پوپ جان پال سے ضرور ملاقات کی۔ دوسری طرف یہی ولیم کیسی کئی بار پاکستان کے دورے پر بھی آیا۔ جنرل اختر سے ملاقاتوں کے دوران اس نے افغان تحریکِ مزاحمت کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ آئی ایس آئی کا طریقہ کار دیکھا' سمجھا اور پھر "افغانستان کو سوویت یونین کا ویتنام" بنانے کے مشن میں شریک ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ امریکی یہاں بھی اسی انداز میں سوویت یونین کا مقابلہ کرنا چاہتے تھے جس طرح وہ پولینڈ میں معاملات پر اپنی گرفت قائم کر کے آگے بڑھ رہے تھے۔ سفارتی سطح پر پاکستان کی پذیرائی' معاشی امداد' فوجی رسد غرض وہ ہر قسم کے معاملات میں پاکستان

کے شانہ بشانہ چلنے کیلئے تیار تھے، لیکن اس کے جواب میں وہ صرف اپنی پالیسیوں کی تائید ہی نہیں بلکہ ان پالیسیوں کو نافذ کرنے والی انتظامی مشینری پر اپنی سیادت بھی چاہتے تھے۔ افغانستان کو سوویت یونین کا ویتنام بنانے کی حد تک تو پاکستان کی افغان پالیسی امریکی خواہشات کے عین مطابق تھی۔ یہی وجہ ہے کہ امریکی کئی دیگر معاملات میں ہم آہنگی کی عدم موجودگی کے باوجود پاکستان کی اقتصادی وفوجی امداد بحال کرنے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ پاکستان کی افغان پالیسی کا اوّلین نقطہ ''سوویت افواج کا افغانستان سے غیر مشروط انخلا'' تھا اور امریکیوں کی خواہش بھی یہ تھی کہ سوویت یونین کو افغانستان میں پھنسا دیا جائے تاکہ اس کی عسکری چودھراہٹ کا بھرم کھل جائے۔ شروع میں تو امریکی یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ افغان تحریکِ مزاحمت روسی افواج کے سامنے ٹھہر بھی سکتی ہے لیکن کچھ دیر بعد انہیں یقین آنے لگا کہ تحریکِ مزاحمت زندہ ہے اور روسی افواج کو چیلنج کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ بعد میں جب انہوں نے پاکستان کی امداد بحال کرنے اور تحریکِ مزاحمت کی پشت پناہی کا فیصلہ کیا تو ان کا نقطہ نظر صرف یہ تھا۔ کہ روسیوں کو یہاں پریشان کیا جائے۔ اس لئے تحریکِ مزاحمت کو اس قدر توانا اٹھایا جائے تاکہ وہ روسی استعماری ہتھکنڈوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرے اور انہیں مشکلات میں پھنسا دے۔ امریکیوں کو افغانوں کے معاشرتی حالات کے بارے میں کچھ زیادہ معلومات نہیں تھیں۔ بقول نصیراللہ بابر ''امریکیوں کو افغانوں کی قدیم وجدید تاریخ کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں تھیں، انہیں یہاں کے تاریخی حالات کا بھی علم نہیں تھا۔ انہیں یہ ہرگز معلوم نہیں تھا کہ یہاں سکندرِ اعظم آیا، لیکن ٹھہر نہ سکا۔ چنگیز خان مشرق سے آیا لیکن یہاں ٹھہر نہ سکا اور اسے مغرب کی طرف سے نکل جانا پڑا۔ منگولوں نے بھی یہاں طبع آزمائی کی کوشش کی لیکن ٹھہر نہ سکے۔ برطانیہ عظمیٰ کو دنیا پر اپنا جھنڈا لہرا لینے کے باوجود یہاں کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ انہیں بے نیل وترام یہاں سے ذلیل وخوار ہو کر واپس لوٹنا پڑا۔ یہاں کوئی بھی نہیں ٹھہر سکا۔ یہ سرزمین گوریلا طرزِ جنگ کیلئے بہت موزوں ہے۔'' انہی نکات کو مرکز بنا کر جنرل اختر عبدالرحمان نے ''اشتراکیوں کی عسکری ہزیمت'' کی شاندار منصوبہ بندی کی۔ امریکی ''افغانستان کو روس کا ویتنام'' بنانا چاہتے تھے اس لئے پاکستان کی افغان پالیسی'' اور امریکی خواہشات میں ایک حد تک موافقت پیدا ہو گئی تھی۔ اس مرحلے پر بھی ایک خفیف سا اختلاف موجود تھا جس کی وجہ سے امریکی سی آئی اے والے جنرل اختر کو پسند نہیں کرتے تھے۔ جنرل اختر کے پیشِ نظر ''اشتراکی افواج کی مکمل ہزیمت'' تھی جس کے بارے میں انہیں ایمان کی حد تک پختہ یقین تھا۔ ان کی ساری حکمتِ عملی بھی اسی نقطہ نظر کے گرد گھومتی تھی،

جبکہ امریکیوں کو اشتراکی افواج کی واپسی کے بارے میں زیادہ ''خوش فہمی'' نہیں تھی اس لئے وہ صرف انہیں یہاں الجھا کر رکھنا چاہتے تھے تا کہ وہ اسے افغانستان میں پھنسا کر دنیا کے دیگر خطوں میں من مانی کر سکیں۔ اس لئے امریکیوں کی یہ منصوبہ بندی تھی کہ کوہ ہندوکش میں لڑی جانے والی افغان جنگ ان کی کمان میں رہے تا کہ وہ اسے حسبِ خواہش حالات کے مطابق موڑ سکیں۔ اس طرح انہیں روس کے ساتھ سودے بازی کرنے میں بھی آسانی رہتی لیکن جنرل اختر عبدالرحمان اپنے منصوبے کو اپنی حکمتِ عملی کے ذریعے ہی کامیابی سے ہمکنار کرنے کے خواہش مند تھے۔ اس مقصد کے لئے ضروری تھا کہ میدان جنگ ان کے سامنے رہے۔ جنگ کی شدّت و کمی پر انہیں اختیار حاصل ہو۔ اس لئے انہوں نے اس بات کی ہمیشہ مخالفت کی کہ امریکی ' افغان کمانڈروں سے براہِ راست رابطے قائم کریں۔ جنرل ضیاءالحق نے کیونکہ دیگر سفارتی وسیاسی معاملات بھی طے کرنے ہوتے تھے اس لئے وہ اس بارے میں بے لچک روّیہ اختیار نہیں کر سکتے تھے۔ امورِ حکمرانی اور سیاست کے جھمیلوں میں پڑ کر مسئلہ افغانستان کے حوالے سے ان کا روّیہ اور طرح کا تھا۔ بقول گلبدین حکمت یار ''جنرل ضیاءالحق کو ابتدا میں جہادِ افغانستان کے حوالے سے کچھ زیادہ سمجھ بُوجھ نہیں تھی۔ ان کا اخلاص تو اللہ کو معلوم ہے لیکن وہ امریکیوں کے زیرِاثر ضرور تھے۔ امریکی حکومت کے ساتھ معاملات طے کرتے وقت ان کا روّیہ بے لچک نہیں ہوتا تھا۔ حتّیٰ کہ وہ انہیں کسی صورت میں بھی ناراض نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ان کا یہ روّیہ آخری دم تک قائم رہا۔ ایک دفعہ انہوں نے امریکی صدر رونالڈ ریگن سے بھی وعدہ کر لیا کہ امریکہ کا دورہ کرنے والا افغان وفد ان سے ملاقات ضرور کرے گا۔ صدر ریگن اس دور میں روسی رہنما گورباچوف کے ساتھ مذاکرات کرنے والے تھے۔ ریگن کا ستارہ عرُوج پر تھا۔ وہ عالمی سطح پر بڑے بڑے کارنامے سرانجام دے کر اپنے عالمی رہنما ہونے کا امیج بنا رہے تھے۔ روس کا دورہ کرنے سے پہلے افغان وفد سے ملاقات کا مقصد یہ تاثّر دینا تھا کہ ''روس کو افغانستان میں پریشان کرنے کا سہرا انہی کے سر ہے۔'' اس وفد کی قیادت میں کر رہا تھا۔ میں نے امریکی صدر سے ملنے سے انکار کر دیا۔ میرے دیگر ساتھی اس ملاقات کیلئے آمادہ بھی تھے لیکن میں ریگن سے مل کر مجاہدین کی کامیابیوں کا سہرا امریکیوں کے سر نہیں باندھنا چاہتا تھا۔ پاکستانی وزارتِ خارجہ کے اہلکار ملاقات کیلئے بار بار اصرار بھی کر رہے تھے لیکن میں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ جہاد افغان قوم نے اس وقت شروع کیا تھا جب سی آئی اے اور پینٹا گون کے عقلی گھوڑے اشتراکی جارحیّت کے سامنے سرنگوں ہو چکے تھے۔ وہ افغانستان کی بُھولی بسری داستان سمجھنے پر اصرار کر رہے تھے۔ جہاد کے آغاز اور پھر استقرار کے بعد امریکیوں کی بھی آنکھیں کھلیں اور انہیں ہماری

اہمیّت کااندازہ ہوا۔ وہ جہاد کی کامیابیوں کواپنے حق میں استعمال کرناچاہتے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ بات اصولاً غلط تھی اس لئے میں نے اس ملاقات سے انکار کر دیا۔ جنرل ضیاء الحق توصرف اتنا جانتے تھے کہ امریکہ کوناراض نہیں کرنا ہے۔ انہیں افغانوں کی اہمیّت اور غیرت کا شاید اندازہ نہیں تھااس لئے انھوں نے ریگن سے ہماری ملاقات کی حامی بھرلی تھی لیکن باوجود دباؤ کے میں نے یہ ملاقات نہیں کی۔ " امریکی زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتے تھے کہ پاکستان کو دی جانے والی اقتصادی اور فوجی امداد بند کر دیتے۔ وہ توپہلے ہی سے بند تھی۔ افغان تحریکِ مزاحمت تو۱۹۷۸ء سے بغیر امریکی امداد کے جاری تھی۔ پھر ۱۹۷۹ء میں اشتراکی فوجوں کے داخلے کے بعد بھی اس تحریک نے اپنے زندہ رہنے کا عملی ثبوت فراہم کر دیا تھااور اس وقت بھی کر رہی تھی جب امریکی جنرل اختر پر دباؤ ڈال رہے تھے کہ وہ انہیں براہِ راست میدان جنگ تک رسائی کے مواقع فراہم کریں۔ ایسے حالات میں اگر امریکہ اس سارے منظر سے پرے رہتاتو تحریکِ مزاحمت اور پاکستان کو تھوڑے نقصانات ہو سکتے تھے۔ ان کے برعکس امریکہ کی "چودھراہٹ" دھری کی دھری رہ جاتی۔ اس لئے امریکی مجبور ہوئے کہ پاکستان اور مجاہدین ومہاجرین کوامداد مہیا کریں۔ تاکہ اگر جہاد جنرل اختر کے منصوبے کے مطابق کامیاب ہو جاتا ہے اور روسی افواج کوواپس لوٹنا پڑتا ہے تو پھر بھی امریکہ کو شاباش ملے گی کہ اس نے تحریکِ مزاحمت کو سپورٹ کیا' زندہ رکھااور اس طرح بالآخر روسیوں کو شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ دوسری صورت میں اگر تحریکِ مزاحمت روسیوں کو افغانستان میں الجھائے رکھتی ہے توپھر بھی امریکہ کو کریڈٹ ملتا رہے گا کہ "دیکھو ہماری امداد سے چلنے والی تحریکِ مزاحمت نے روسیوں کو پھنسا رکھا ہے" امریکی ناپسندیدگی کے باوجود پاکستان اور تحریکِ مزاحمت کو مالی اور اسلحی طور پر سپورٹ کرنے پر مجبور رہے۔ اس دور میں تحریکِ مزاحمت کی کامیابیوں کے باوصف امریکی پاکستان کے جوہری پروگرام سے بھی صرفِ نظر کرنے پر مجبور ہوئے۔ یہاں اسلامائزیشن کے عمل نے بھی انہیں پریشان نہیں کیایہاں پر ہونے والی انسانی حقوق کی پامالیوں نے بھی امریکیوں کو پریشان نہیں کیا۔ ہیروئن سازی اور اس کی مغرب کی طرف ترسیل سے بھی پاک امریکہ تعلقات میں رخنہ اندازی نہ ہو سکی۔ پاکستان کے جوہری پروگرام کے متعلق امریکی صدر نے خود ہی کلیئرنس سرٹیفکیٹ جاری کر دیا۔ "سمگھٹن ترمیم" کی تلوار بھی پاکستان کے جوہری پروگرام پر اثرانداز نہ ہو سکی۔ جماعتی سیاسی سرگرمیوں پر پابندیاں اور اپوزیشن پر سختیاں بھی جنرل ضیاء الحق کی حکومت کے جواز کو چیلنج نہ کر سکیں۔ یہ سب تحریکِ مزاحمت کی کامرانیوں کا صلہ تھا۔ یہ اس طویل مدّتی منصوبہ بندی کاکمال تھاجو جنرل

اختر عبدالرحمٰن نے روسی افواج کی افغانستان آمد کے بعد ترتیب دی تھی۔ اس منصوبہ بندی میں امریکیوں کا کہیں ہاتھ نہیں تھا اور نہ ہی ان کی دخل اندازیوں کی کہیں گنجائش رکھی گئی تھی۔ ۱۹۸۳ء میں جب تحریکِ مزاحمت اپنے عروج کی طرف محوِ پرواز تھی اشتراکی افواج کے حوصلے جوان اور رسد کی لائن مربوط تھی تو تحریکِ مزاحمت ابھی طویل مدتی منصوبے کے مطابق بچپن سے نکل کر جوانی و مضبوطی کے مراحل طے کر رہی تھی۔ امریکی بڑی بے تابی سے اس مسئلے میں مرکزی حیثیت اختیار کرنے کیلئے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ امریکی ماہرین (اقتصادی اور فوجی) بار بار پاکستان کا دورہ کر رہے تھے۔ جنرل ضیاء الحق پر دباؤ بڑھایا جارہا تھا کہ وہ افغان جہاد کے حوالے سے "بند دروازے" (CLOSE DOOR) کی بجائے "کھلے بازوؤں" (OPEN ARMS) کی پالیسی اپنائیں۔ مقصد یہ تھا کہ امریکیوں کو بھی براہ راست اس "جنگی کھیل" (WAR GAME) میں شامل کرلیا جائے۔ اسی دور میں سی آئی اے کے ڈائریکٹر ولیم کیسی نے جنرل اختر عبدالرحمان سے ملاقات کی اور انہیں پوپ جان پال کا پیغام پہنچایا جس میں انہیں اشتراکیوں کے خلاف "مقدّس جنگ" شروع کرنے پر مبارکباد دی گئی تھی اور یہ درخواست بھی کی گئی کہ انہیں بھی اس مقدّس جنگ میں شریک سمجھا جائے اور شیطان (سوویت یونین) کے خلاف اس جنگ میں انہیں معاون برادر " HELPING BROTHER " کا کردار ادا کرنے کا موقع دیا جائے۔" اس درخواست کے بین السطور میں ولیم کیسی کی یہ خواہش واضح طور پر پڑھی جاسکتی ہے کہ انہیں اس جنگ میں براہِ راست کردار ادا کرنے کا موقع فراہم کیا جائے۔ جنرل اختر عبدالرحمٰن نے ولیم کیسی کو آئی ایس آئی کے ہیڈ کوارٹر کا دورہ کروایا۔ انہیں اپنے طریقِ کار سے آگاہ کیا۔ افغانستان کے طول و عرض میں ☆پھیلی ہوئی "سپلائی لائن" اور "کمانڈروں تک رسائی" کے نیٹ ورک کے بارے میں تفصیلات مہیا کیں۔ "اگر عیسائی دنیا افغانستان میں مجاہدین کے جہاد کو واقعی ایک مقدس جنگ تصوّر کرتے ہیں تو انہیں اس مقدّس کام کی تفصیلات بتانے میں کوئی حرج نہیں۔ ہم امریکی خلائی سیارے کے ذریعے میدان جنگ کا نقشہ ترتیب دینے میں اگر مدد حاصل کر رہے ہیں تو انہیں افغانستان میں لڑی جانے والی جنگ کی تفصیلات بتانے میں بھی کوئی نقصان نہیں ہوگا۔" ولیم کیسی ان تفصیلات کو جان کر اس قدر متاثر ہوا کہ پھر اس کی سفارش پر پاکستان کو دی جانے والی امداد ۱۹۸۵ء میں دگنی کر دی گئی۔ لیکن امریکیوں کو میدانِ جہاد تک براہ راست رسائی کی اجازت پھر بھی نہیں دی گئی۔ افغان کمانڈروں سے براہ راست رابطہ صرف آئی ایس آئی کے اہلکاروں کا ہی رہا۔ اس

حوالے سے امریکی خواہشات ۱۹۸۷ء تک پوری نہ ہو سکیں۔ حتیٰ کہ جنرل اختر کو آئی ایس آئی سے ہٹا کر چیئرمین جوائنٹ چیف آف آرمی سٹاف کمیٹی مقرر کر دیا گیا۔ اس کے بعد مارچ ۱۹۸۹ء تک امریکی اپنی اس دیرینہ خواہش کو کس حد تک پورا کر چکے تھے اس بات کا اندازہ آپریشن جلال آباد کے شروع ہونے اور پھر حتمی مراحل میں داخل ہونے کے بعد پیش آنے والے واقعات کے مطالعے سے لگایا جاسکتا ہے۔ آپریشن جلال آباد کی ناکامی کے حوالے سے جنرل حمید گل کا کہنا ہے کہ "میں نے یکسوئی سے افغان مجاہدین کی کامرانی کیلئے منصوبہ بندی کی۔ ان کے کاز کو اپنا کاز سمجھا اور انہیں فاتح بنانے کی کوشش کی، لیکن بے نظیر نے میرے ساتھ تعاون نہیں کیا۔ امریکی بھی مجاہدین کی فتح کے مخالف تھے۔ انہوں نے بھی ایڑی چوٹی کا زور لگایا کہ مجاہدین فاتح کی صُورت میں نہ ابھر سکیں۔ حتّٰی کہ انہوں نے افغان مجاہدین کی صفوں میں بھی نقب لگائی............ حکمت یار کی اس آپریشن میں شمولیّت کے باعث شاید آفندی کے وہ کمانڈر ناراض ہو گئے جو ثمر خیل تک پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے گڑبڑ شروع کر دی وہ پہلے بھی امریکیوں کے زیرِ اثر ہی لڑ رہے تھے۔" یعنی جنرل اختر عبدالرحمان کے درمیان سے ہٹتے ہی امریکی میدانِ جنگ تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ انہوں نے میدانِ جہاد کے معاملات پر براہ راست اثر انداز ہونا شروع کر دیا تھا۔ جنرل اختر کے دور میں آئی ایس آئی کا ایک رعب تھا دبدبہ تھا "لوگ آئی ایس آئی سے خوف زدہ یا کم از کم خدشات میں ضرور مبتلا رہتے تھے۔ عساکرِ پاکستان بلکہ خود بری فوج میں بھی آئی ایس آئی اور ان کے افسران کو شک وشبہ کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا فوج کے سینئر افسران کا خیال تھا کہ آئی ایس آئی ان پر کڑی نگرانی رکھے ہوئے ہے اور اس کے ذریعے جنرل ضیاء جرنیلوں کی سرگرمیوں سے پوری طرح واقف رہتے ہیں۔ یہ خیال بڑی حد تک درست بھی تھا۔ ان حالات میں آئی ایس آئی کے ڈائریکٹر جنرل کے عہدے پر فائز ہونا اور ہر روز براہِ راست صدر پاکستان تک رسائی رکھنا بلاشبہ ایک ایسی پوزیشن تھی جو اس عہدے کے حامل شخص کو نہایت طاقتور اور با اثر بنا دیتی ہے۔" ۱۹۸۷ء میں جب جنرل اختر کو ترقی دے کر آئی ایس آئی سے الگ کیا گیا تو افغانستان میں مجاہدین کی عسکری فتح بہت قریب دکھائی دے رہی تھی۔ روسی افغانستان سے رخصت ہونے کی باتیں کر رہے تھے اس سارے منظر کے حوالے سے اگر عظیم فتح کی حکمتِ عملی اور منصوبہ سازی کیلئے کسی فردِ واحد کا نام لیا جاسکتا ہے تو وہ جنرل اختر عبدالرحمٰن ہی تھا۔ بعد میں پیش آنے والے واقعات نے اس نظریئے کی عملی طور پر تائید بھی کر دی ہے۔ تحریکِ مزاحمت کا آخری مرحلہ جنرل اختر کی آئی ایس آئی سے علیحدگی اور جنرل حمید گل

کے آئی ایس آئی کے ڈائریکٹر جنرل کے طور پر چارج سنبھالنے سے شروع ہوتا ہے جو آپریشن جلال آباد میں ناکامی اور پھر جنرل حمید گل کی آئی ایس آئی سے برطرفی تک جاری رہا۔ یہی وہ دور ہے جس میں حقیقی ویقینی فتح کو نہ صرف عسکری محاذ پر بلکہ سفارتی محاذ پر بھی رگید ڈالا گیا۔

جب ۱۹۸۶ء میں گورباچوف کی طرف سے افغانستان کو رستا ہوا زخم قرار دیا گیا۔ تو سفارتی محاذ پر ایک نئے کھیل کا آغاز کر دیا گیا۔ گوریلا جنگ میں مجاہدین کی فوجی فتح کے آثار نمودار ہونے شروع ہو گئے تھے۔ قدیم وجدید عسکری ماہرین کے مطابق اگر عسکری قوت سے گوریلا مزاحمت کو دبایا نہ جا سکے تو اسے گوریلوں کی فتح ہی تصور کیا جاتا ہے۔ روسی افواج چھ سال تک بھی اس گوریلا قوت کو دبا نہیں سکے تھے بلکہ مجاہدین کے ہاتھوں روسی افواج کو لگنے والے چھوٹے چھوٹے زخموں نے اب ایک ایسے گھاؤ کی صورت اختیار کر لی تھی جس میں سے خون نے رسنے کی بجائے بہنا شروع کر دیا تھا۔ گورباچوف روس کو معاشی بدحالی سے بچانے کے لئے گلاسناسٹس اور پریسٹورائیکا کے انجکشن بھی لگا رہے تھے لیکن بات بنتی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ افغانستان میں کروڑوں نہیں بلکہ اربوں روپوں سالانہ کے اخراجات اٹھ رہے تھے اور نتیجہ منفی نکل رہا تھا اس لئے انہوں نے روسی افواج کی واپسی کا واضح عندیہ دے دیا تھا۔ مجاہدین کی عسکری فتح قریب سے قریب تر ہوتی جا رہی تھی۔ روسی افواج کی واپسی کے اعلان سے امریکی مقاصد کسی حد تک پورے ہونے کے قریب تھے۔ افغانستان روس کا ویت نام بن چکا تھا۔ روس پر معاشی بوجھ اس قدر زیادہ ہو گیا تھا کہ کمیونسٹ معیشت اسے سنبھال نہیں پا رہی تھی۔ سوویت یونین افغانستان کے بوجھ تلے دبا چلا جا رہا تھا۔ مجاہدین فتح کی سمت میں بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ ان کی قربانیاں، عزم وہمت اور استقلال رنگ لا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ امریکی دباؤ بھی بڑھتا گیا کہ "سیاسی سمجھوتہ" کر لیا جائے۔ جنیوا بات چیت تو جاری تھی اس میں حقیقی رنگ بھرنے اور حتمی فیصلے تک پہنچنے کے لئے امریکی بے قراری قابل دید تھی۔ اس دور میں آئی ایس آئی نے وسط ایشیاء روس کے ۲۰ کلومیٹر اندر تک جا کر بڑے کامیاب آپریشن کروائے تھے۔ ان علاقوں میں موجود کئی فوجی تعینات کے علاوہ کئی چھوٹے چھوٹے طیاروں کو بھی راکٹوں کے ذریعے تباہ کیا تھا۔ یہ علاقہ روس کا "نرم پیٹ" کہلاتا تھا اور اسی کی حفاظت کی آڑ میں افغانستان میں اشتراکی پٹھو حکومتیں قائم کرنے کی بھی کوششیں کی جا چکی تھیں لیکن بالا آخر روسیوں کو خود ہی یہاں پہنچنا پڑا۔ طویل جدوجہد کے باوجود روسی اپنے "نرم پیٹ" کو نہیں بچا سکے تھے جب ۸۵۔ ۱۹۸۶ء میں روس کے اس حصے پر شدید ضربیں لگیں تو اس نے وحشیانہ انداز میں بمباری شروع کی اس بمباری کی زد میں افغانستان

کے بے گناہ اور معصوم شہری بھی آئے اور پاکستان کے افراد بھی اس وحشت کی بھینٹ چڑھ گئے۔ اسی دور میں روسی سفیر نے بڑے دھمکی آمیز انداز میں پاکستان کو متنبہ کیا کہ وہ ایسی سرگرمیوں سے باز رہے۔ وزارت خارجہ میں کھلبلی مچ گئی اور انھوں نے آئی ایس آئی پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا کہ وہ اس قسم کی "شرانگیز کارروائیوں" سے باز آجائیں۔

۱۹۸۶ء کے بعد جنرل محمد ضیاء الحق نے بھی مجاہدین پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا کہ وہ انتہا پسندی کا راستہ چھوڑ کر اعتدال کی راہ اختیار کریں اور وسیع البنیاد حکومت کے قیام پر راضی ہو جائیں جس میں نجیب اللہ کے ساتھ ساتھ ظاہر شاہ یا اس کے حامیوں کو شامل کیا جائے لیکن مجاہدین نہیں مانے۔ مجددی، نبی محمدی اور سید احمد گیلانی جیسے رہنماؤں کی تو میدان جہاد میں اس قدر اہمیت نہیں تھی کہ ان کے انکار یا اقرار سے کچھ زیادہ فرق پڑتا لیکن حکمت یار، سیاف ربانی اور خالص جیسے مجاہد لیڈر جنرل ضیاء الحق کی اس تجویز سے اتفاق نہیں کر رہے تھے۔ حتیٰ کہ آئی ایس آئی کی طرف سے ترتیب کردہ ایک میٹنگ میں جنرل ضیاء الحق نے "وسیع البنیاد حکومت" پر پھبتیاں شروع کی اور مجاہدین کو مجبور کیا کہ وہ اس پر راضی ہو جائیں حتیٰ کہ جنرل ضیاء نے "صلح حدیبیہ" کا حوالہ بھی دیا۔ جنرل ضیاء کا خیال تھا کہ اس طرح کی حکومت کے قیام سے مغرب بھی راضی ہو جائے گا اور روسیوں کو افغانستان سے واپس بھجوانے کی سبیل بھی ہو جائے گی۔ دراصل جنرل ضیاء الحق گورباچوف کی اعلان کردہ افغان پالیسی سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ انہیں اس بات کا خدشہ تھا کہ اگر اب بھی روس پر فوجی دباؤ بڑھایا گیا تو ممکن ہے کہ روس کے واپسی کی طرف جاتے ہوئے قدم کہیں پھر نہ رک جائیں اور مجاہدین کو ایک بار پھر نئے سرے سے صفیں ترتیب دینی پڑیں۔ اس میٹنگ میں اچھی خاصی تلخی بھی ہوئی۔ مولوی محمد یونس خالص نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ "اگر ہم پر زیادہ دباؤ ڈالا گیا تو ہم اپنے مراکز داخل افغانستان منتقل کر لیں گے"۔ جنرل ضیاء الحق انہیں صلح حدیبیہ کے حوالے سے صلح کی ایسی شرائط ماننے پر آمادہ کر رہے تھے جو انہیں قبول نہیں تھیں فتح کی سمت بڑھتے ہوئے قافلے کو شکست خوردہ فریق کے طور پر شرائط ماننے کے لئے آمادہ کیا جا رہا تھا۔ عبدالرب رسول سیاف نے تو جنرل ضیاء الحق کو یہاں تک کہہ دیا کہ "آپ کے ماتھے پر محراب سج نہیں رہا ہے"۔ خیر بات آئی گئی ہو گئی لیکن جنرل ضیاء الحق پر امریکی دباؤ بڑھتا چلا جا رہا تھا کہ مسئلہ افغانستان کے سیاسی حل کی طرف پیش رفت کریں۔ اس مسئلے کے روز اول سے ہی "سفارتی شعبہ" یا "وزارت خارجہ" اور اس کی خارجہ پالیسی جنرل ضیاء الحق کی براہ راست نگرانی میں تھی۔ صاحبزادہ یعقوب خان اس شعبے میں جنرل ضیاء الحق کے رہنماء یا گائیڈ تھے۔ صاحبزادہ صاحب فوج میں کیونکہ جنرل ضیا کے سینئر تھے اس حوالے سے

جنرل ضیاء الحق صاحبزادہ صاحب کی عزت واحترام بھی کرتے تھے۔ فوجی نفسیات کے عین مطابق صاحبزادہ یعقوب خان وزیر خارجہ کی حیثیت میں بھی جنرل ضیاء الحق کو جونیئر ہی سمجھتے رہے اور جنرل ضیاء الحق بھی صاحبزادہ کو اپنے مشیر کے طور پر ہی لیتے رہے ان کا یہ رویہ افغان مسئلے کے حل پر بھی اثرانداز ہوا۔ پاکستان کے فارن آفس کی ناقص کارکردگی کا اس سے بڑا اور ثبوت کیا ہو گا کہ ۱۹۸۶ء کے بعد جب گوربارچوف نے روسی افواج کی واپسی کا عندیہ دیا تو ان کے پاس معاملات طے کرنے کے لئے کوئی متبادل ایجنڈا موجود نہیں تھا۔ پچھلے پانچ سالوں سے ہمارا فارن آفس ٹامک ٹوئیاں مارتا رہا تھا۔ روسی عسکری ہزیمت کے جس خواب کو افغان مجاہدین نے آئی ایس آئی کی نگرانی میں حقیقت کے قریب پہنچادیا تھا۔ ہمارا فارن آفس اس کو مجاہدین کی سیاسی فتح میں تبدیل نہ کر سکا بلکہ اس دور میں فارن آفس کا رویہ جیسے روسی وامریکی مفادات کے محافظ نگران کا ہو گیا تھا صاحبزادہ یعقوب خان نے روز اول سے ہی ایک ایسی پالیسی اپنار کھی تھی جو "افغان مجاہدین" کی عسکری کامیابیوں کے ساتھ منسلک نہیں کی گئی۔ جنرل ضیاء الحق نے بھی اس حوالے سے زیادہ تردد نہیں کیا ہمارا فارن آفس مجاہدین کی میدان جہاد میں حاصل کردہ کامیابیوں کو سفارتی میدان میں CASH. کروانے کی بجائے انہیں رکوانے میں مصروف رہا۔ فارن آفس میں کئی اہلکار "بیرون ملکی مفادات کے نگران" کے طور پر کام کرتے رہے۔ ہر قدم پر آئی ایس آئی کی مہمات کے خلاف باتیں ہوتیں رہیں۔ فارن آفس کے زیر اثر ویسے تو جنرل ضیاء الحق نے ۱۹۸۶ء سے ہی افغانستان کے "سیاسی حل" کی کاوشیں تیز کر دی تھیں۔ مجاہدین پر دباؤ بھی ڈالا جانے لگا تھا۔ اس معاملے میں جنرل اختر کی طے کردہ "افغان پالیسی" آڑے آرہی تھی۔ ۱۹۸۰ء میں جنرل اختر نے "روسیوں کی عسکری ہزیمت" اور "کابل میں مجاہدین" کی حکومت کے قیام کا جو خواب دیکھا تھا اس کی تعبیر کا وقت قریب آرہا تھا۔ روسی افواج افغان مجاہدین کے لگائے ہوئے زخم چاٹ رہی تھیں۔ امریکی پاکستان پر دباؤ بڑھا رہے تھے روسیوں کی عسکری ہزیمت طے شدہ تھی جسے امریکی مجاہدین کی سیاسی فتح میں تبدیل نہیں ہونے دینا چاہتے تھے۔ ۱۹۸۷ء میں جنرل اختر کو آئی ایس آئی سے الگ کرنا اسی امریکی دباؤ کا نتیجہ تھا۔

اس کے بعد وزارت خارجہ کو معاملات کو اپنی مرضی کے مطابق آگے بڑھانے میں کافی حد تک خود مختاری حاصل ہو گئی۔ جنرل حمید گل، جنرل ضیا سے اس حد تک متاثر تھے کہ ان کی ہر بات بلاچون وچرا مان لیا کرتے تھے افغان مجاہدین لیڈروں کو "سیاسی سمجھوتے" پر آمادہ کرنے کے لئے ضروری۔ تھا کہ ان کی "عسکری بالادستی کے بھرم" (MYTH OF SUPERMACY) کو توڑا جائے .... جنرل حمید گل جنرل ضیاء کے اس منصوبے کو حقیقتاً

جہاد افغانستان کی روح کے عین مطابق سمجھتے تھے یہی وجہ ہے انہوں نے بنیاد پرست اور عسکریت پسند افغان لیڈروں کو رام کرنے کی کوشش کی۔ اس دور میں ہتھیار اور گولہ بارود سات افغان تنظیموں کے حوالے سے میدان جہاد تک پہنچانے کی طے شدہ پالیسی سے بھی انحراف کیا گیا۔ اب گولہ بارود اور امداد براہ راست کمانڈروں کو بھی دیا جانے لگا۔ اس کا مقصد نہ صرف لیڈروں کی اہمیت کو کم کرنا تھا۔ بلکہ "جہاد کی رفتار" کو بھی کنٹرول کرنا تھا جنرل حمید گل کی جہاد افغانستان کے عملی امور سے واقفیت بڑی کم تھی یہی وجہ ہے کہ جب انہیں روسی طیارے گرائے جانے کی رپورٹیں دی گئیں تو انہیں یقین نہیں آیا۔ انہوں نے سگنل کے بریگیڈیئر کو بلایا اور آئی ایس آئی کی طرف سے مہیا کردہ رپورٹوں کی تصدیق کرنے کو کہا۔ ابتدا میں جنرل حمید گل "سیاسی سمجھوتے" کو ہی افغان جہاد کی حتمی کامیابی سمجھتے تھے۔ اس لئے عسکریت پسند لیڈروں کو اعتدال میں لانے کی کوششیں کیں۔ یہی وجہ ہے کہ گلبدین حکمت یار کے ساتھ ان کی پہلی ملاقات بڑی ناخوشگوار تھی۔ گلبدین کو رام کرنا یا منانا خاصا مشکل کام ہے۔ جنرل حمید گل نئے نئے آئی ایس آئی کے سربراہ بنے تھے۔ مسئلہ افغانستان سے انہیں جو صی لگاؤ تھا اب اس کے حل کے لئے ذمہ داریاں ان کے کندھوں پر آن پڑی تھیں۔ جنرل ضیاء الحق نے انہیں ایک نئے انداز میں کام کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ ایک "فوجی جرنیل" کو "سیاسی سمجھوتے" کے لئے راہ ہموار کرنے کی ذمہ داری دی گئی تھی۔ گلبدین اس پالیسی کے راستے میں سب سے بھاری پتھر تھا جسے ہٹانا ضروری تھا۔ جنرل حمید گل کی گلبدین سے پہلی ملاقات بڑی دلچسپ تھی۔ جنرل ' مجاہد کو سیاسی سمجھوتے پر آمادہ کر رہا تھا لیکن مجاہد لیڈر مان نہیں رہا تھا بالآخر جنرل حمید گل نے زچ ہو کر گلبدین کو کہا "MR. HIKMATYAR! WE HAVE MADE YOU A LEADER AND CAN BRING YOU BACK."

(مسٹر گلبدین! ہم نے ہی تمہیں لیڈر بنایا ہے اور ہم تمہیں منظر سے ہٹا بھی سکتے ہیں)

وزارت خارجہ کے اہل کار اور آئی ایس آئی کے کل پرزے آخری لمحات تک حکمت یار کو منظر سے ہٹانے کی کوششیں کرتے رہے لیکن حکمت یار آج بھی افغانستان ' پاکستان اور ایران کے سفارتی و عسکری منظر پر چھایا ہوا ہے اور مجاہدین کے ہاتھوں ہونے والی "روسی عسکری ہزیمت" کو "مجاہدین کی سیاسی فتح" میں بدلنے کے لئے کوشاں ہے۔ ویسے کچھ عرصے بعد جنرل حمید گل کو بھی احساس ہونے لگا تھا کہ امریکی سی آئی اے اور پاکستانی وزارت خارجہ کے اہلکار "جہاد افغانستان" کو حتمی مرحلے تک پہنچنے سے روکنا چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے پھر اپنی عسکریت پسند افغان لیڈروں سے بہتر تعلقات استوار کرنے شروع کر دیے تھے کیونکہ انہیں یقین ہو گیا تھا کہ مسئلہ افغانستان کا "فوجی حل" ہی مجاہدین کی حقیقی حکومت کے قیام کی صورت پیدا کرے

گا۔ آپریشن جلال آباد اسی سوچ کا مظہر تھا' لیکن اس وقت تک معاملات ان کے ہاتھوں سے نکل چکے تھے۔

جنیوا معاہدے پر دستخطوں کے ذریعے پاکستان کے ہاتھ باندھے جا چکے تھے۔ اوجھڑی کیمپ کو تباہ کر کے مجاہدین کی عسکریت کو کافی حد تک کمزور کر دیا گیا تھا۔ اسی سال اگست ۱۹۸۸ء میں ۱۳۰ کو خاکستر کر کے پاکستان کی صف اول کی عسکری قیادت بھی منظر سے ہٹائی جا چکی تھی۔ سیاسی و سفارتی منظر گہر آلود ہو چکا تھا اور بے نظیر بھٹو صاحبہ ایوان اقتدار میں آ چکی تھیں۔ اب تمام اشارے حمید کی مجوزہ پالیسیوں کے خلاف جا رہے تھے۔ بدلتے ہوئے یہ حالات کسی نئے افق کی نشاندہی کر رہے تھے جو حمید گل کی خواہشات کے مطابق نہیں تھا۔ آپریشن جلال آباد کی ناکامی نے رہی سہی کسر بھی نکال کر رکھ دی تھی۔ بالآخر جنرل حمید گل کو بھی منظر سے ہٹنا پڑا۔ مسئلہ افغانستان میں وزارت خارجہ کی کارکردگی کے حوالے سے آغا شاہی' صاحبزادہ یعقوب خان اور زین نورانی قابل ذکر ہیں۔ موجودہ وزیر خارجہ جناب صدیق کانجو تو کسی حساب کتاب میں نہیں آتے۔ آغا شاہی اس وقت پاکستان کے وزیر خارجہ تھے جب مسئلہ افغانستان ابھی ابتدائی مراحل میں تھا۔ صورتحال بالکل واضح نہیں تھی لیکن انہوں نے لمحہ لمحہ بدلتے ہوئے حالات پر ایک مشاق ڈپلومیٹ کی طرح کڑی نظر رکھی اور سفارتی محاذ پر روسیوں کے منفی پروپیگنڈے کا مدلل جواب دیتے رہے۔ پھر جب دسمبر ۷۹ء میں روسی افواج افغانستان میں داخل ہوئیں تو آغا شاہی نے ڈپلومیٹ کی حیثیت میں پاکستان کی خارجہ پالیسی کے خدوخال وضع کیے انہوں نے اقوام متحدہ کے طے کردہ اصولوں کے مطابق سفارتی دباؤ کے ذریعے مسئلہ افغانستان کا سیاسی حل تجویز کیا تھا۔ روس کے خلاف کسی مزاحمتی جدوجہد میں پاکستان کی شرکت خارج از امکان قرار دی گئی تھی۔ ان کے بقول "روس کو فوجی دباؤ کے ذریعے افغانستان سے نکالنے کا خیال احمقانہ تھا کیونکہ کسی مزاحمتی تحریک کی مدد کرنے کی صورت میں پاکستان کے خود روس کا شکار ہونے اور اس کے قہرو غضب میں گھر جانے کا قوی امکان تھا۔ مزاحمتی گوریلوں کے ٹھکانوں کو نشانہ بنانے کے بہانے "گرم تعاقب" کرتے ہوئے روسی افواج پاکستانی سرحدوں کو بھی پامال کر سکتی تھیں" پاکستانی فارن آفس افغان مجاہدین کی محیر العقول عسکری کامیابیوں کے باوجود اس حقیقت کو ماننے کے لئے کبھی بھی تیار نہیں ہوا کہ روسیوں کو عسکری طور پر افغانستان میں CONTAIN کیا جا سکتا ہے۔ فارن آفس کے اہلکاروں کا یہ رویہ ہنوز جاری ہے۔ حتیٰ کہ جب کبھی افغان مجاہدین کی عسکری کامیابیاں عروج پر پہنچنے لگتیں' فارن آفس کے اہلکار حکومت کو ڈرانے لگتے کہ "سیاسی حل" کے سلسلے میں فوری پیش رفت کرنا ضروری ہے ورنہ پاکستان پر ناگہانی جنگ و آلام مسلط ہو سکتے

ہیں"۔ دوسری طرف فارن آفس والوں کی اپنی کارکردگی کاپول قوم کے سامنے اس وقت کھلا جب گورباچوف نے افغانستان سے اپنی فوجوں کو نکالنے کا سگنل دیا تو فارن آفس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ صاحبزادہ یعقوب خان کی سربراہی میں محکمہ خارجہ طویل عرصے سے جنیوا مذاکرات میں مشغول تھا لیکن جب حتمی معاہدے پر دستخط کرنے کا سگنل ملا تو روسیوں سے منوانے کے لئے ان کے پاس کچھ شرائط اور ان کی تفصیلات موجود نہیں تھیں آغا شاہی تو روسی افواج کے افغانستان میں داخلے کے کچھ ہی عرصے بعد محکمہ خارجہ کو خیرباد کہہ چکے تھے اصل معاملات تو صاحبزادہ یعقوب خان کی زیر نگرانی آگے بڑھتے رہے تھے۔ وزیر اعظم محمد خان جونیجو صاحبزادہ کو جنرل ضیا کا آدمی سمجھتے تھے حالانکہ اس وقت جنرل ضیاء الحق بھی صاحبزادہ سے زیادہ خوش نہیں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے صاحبزادہ کی وزارت خارجہ سے علیحدگی کے راستے میں رکاوٹ کھڑی نہیں کی۔ محمد خان جونیجو نے صاحبزادہ کو وزارت خارجہ سے چلتا کر کے زین نورانی جیسے شخص کو وزارت خارجہ کا قلمدان سونپ دیا جسے مسئلہ افغانستان کے شاید حروف ابجد سے بھی واقفیت نہیں تھی۔ جنرل ضیاء الحق روسیوں سے شرائط منوائے بغیر جنیوا معاہدے پر دستخطوں کے خلاف تھے۔ محکمہ خارجہ نے اس حوالے سے کوئی مسودہ تیار نہیں کیا تھا جسے پیش کر کے مذاکرات کو طول دیا جا سکتا۔ پھر زین نوانی کو معاملات کے بارے میں ویسے بھی زیادہ معلومات نہیں تھیں اس لئے ان سے کوئی توقع رکھنا عبث تھا۔ یہاں ایک بڑا اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ جنرل ضیاء الحق اگر حقیقتاً جہاد افغانستان کے ساتھ مخلص تھے اور انہیں اس بات پر بھی شرح صدر حاصل تھی کہ جنیوا معاہدے پر بغیر شرائط منوائے دستخط کر دینا مجاہدین اور جہاد افغانستان کی روح کے منافی ہو گا تو پھر انہوں نے محمد خان جونیجو کے ساتھ سخت رویہ کیوں اختیار نہ کیا حالانکہ جونیجو صاحب اس مسئلے پر تمام سیاستدانوں کی گول میز کانفرنس بلا کر اس میں اپنے ارادے بھی ظاہر چکے تھے جنرل ضیاء الحق آ طور پر بھی اور ویسے شخصی اعتبار سے بھی اس قدر بااختیار ضرور تھے کہ جونیجو کو بالجبر ایسا کرنے سے روک دیتے۔ اس بات کا عملی اظہار انہوں نے جنیوا معاہدے پر دستخط ہونے کے اگلے ماہ ۲۹ر مئی ۱۹۸۸ء کو جونیجو حکومت کو بیک جنبش قلم فارغ کر کے کر بھی دیا۔ اس بارے میں توجیح پیش کرنے کا کلی اختیار تو مرحوم جنرل ضیا یا ان کے معنوی جانشینوں کو ہے لیکن باخبر ذرائع کا کہنا ہے کہ آئی ایس آئی کی طرف سے جنرل ضیاء الحق کو یقین دہانی کرادی گئی تھی کہ زین نورانی جنرل ضیاء الحق کی دی گئی ہدایات کے عین مطابق دستخطوں سے پہلے مجاہدین کے مفادات کا تحفظ کرنے والی شرائط پیش کریں گے اور افغانستان میں مجاہدین کی حکومت کے قیام سے متعلق شقیں معاہدے میں داخل کریں گے کیونکہ اس وقت تک زین نورانی "آئی ایس آئی کے باقاعدہ تعلق

دار " تھے۔ اس لئے جنرل ضیاء الحق نے بھی محمد خان جونیجو کی تمام "پھرتیوں اور کارروائیوں" کی پرواہ نہ کرتے ہوئے زین نورانی کو جنیوا معاہدے کے فائنل راؤنڈ میں شرکت کے لئے جانے دیا، لیکن شومئی قسمت آئی ایس آئی کے اندازے غلط ثابت ہوئے۔ زین نورانی نے بغیر کچھ منوائے جنرل ضیاء کی خواہشات اور ہدایات کے برعکس معاہدے کے ڈرافٹ پر جوں کے توں دستخط کر دیئے۔ اس طرح افغان مجاہدین کی حتمی فتح ان سے چھن گئی اور روسیوں کی عسکری ہزیمت کو "مجاہدین کی سیاسی فتح" میں بدلنے سے روک دیا گیا۔ یہ قسمت کا ایک ایسا وار تھا جس کے زخم مجاہدین ابھی تک سہلا رہے ہیں لیکن افاقہ ہوتا دکھائی نہیں دے رہا ہے۔ محمد خان جونیجو اور زین نورانی نے سفارتی محاذ پر اور جنرل حمید گل نے عسکری محاذ پر مجاہدین کی یقینی فتح کو ناکامی و شکست میں بدل دیا۔ جنیوا معاہدے پر جس انداز میں دستخط کئے گئے، اس سے سفارتی سطح پر مجاہدین و پاکستان کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ بغیر کوئی شرط منوائے مجاہدین کیلئے کوئی خیر کی شق معاہدے میں داخل کئے بغیر بھاگتے ہوئے دشمن اور جارح روس سے کسی قسم کی ندامتی اور شکست خوردگی کا اقرار حاصل کئے بغیر جنیوا معاہدے پر دستخط کر دینا ایک ایسی شرمناک حرکت تھی جس کے لئے تاریخ محمد خان جونیجو کو کبھی معاف نہیں کرے گی۔ یاد رہے یہ سب کچھ ایسے وقت میں ہوا جب جنرل محمد ضیاء الحق ابھی زندہ تھے اور کرسئ صدارت کے علاوہ سپہ سالاری کے منصبِ عالیہ پر بھی جلوہ افروز تھے۔ پاکستان کا اقتدار اعلیٰ اور اقتدار حقیقی دونوں ان کی دسترس میں تھے۔ اس وقت ان کا کہا ہوا ایک ایک لفظ قانون کا درجہ حاصل کرنے کیلئے تیار رہتا تھا۔ ان کی ہر خواہش الفاظ کے رُوپ میں آ کر ملکی قانون کا درجہ اختیار کر لیتی تھی۔

جس کا عملی اظہار انہوں نے آئین میں آٹھویں ترمیم کی منظوری کے وقت بھی کر دیا تھا۔ اثبات کے ساتھ ساتھ نفی پر بھی انہیں قوی قدرت حاصل تھی۔ شریعت بل کی منظوری کیونکہ ان کی خواہش نہیں تھی۔ اس لئے ان کی زندگی میں یہ بل قانون کا رُوپ نہ دھار سکا۔ ۲۹ مئی ۱۹۸۸ء میں محمد خان جونیجو کی "منتخب شدہ حکومت" کو ان کے با اختیار قلم کے چند لفظوں نے پارلیمنٹ کے ایوانوں سے اٹھا کر باہر کھڑا کر دیا تھا کیونکہ اگر جنرل ضیاء الحق محمد خان جونیجو کو یہ راہ نہ دکھاتے تو جونیجو صاحب جنرل ضیاء الحق کو ایک نئی راہ دکھانے کا پروگرام طے کر چکے تھے۔ جونیجو صاحب کو چلتا کر کے ضیاء الحق نے شاید اور تو بہت کچھ حاصل کر لیا ہو لیکن سفارتی میدان میں جہادِ افغانستان کو پہنچنے والا نقصان کسی طرح بھی پورا نہیں ہو سکتا تھا۔ ہاں ایک صُورت تھی کہ جنرل اختر کی طے کردہ افغان پالیسی کے دوسرے نکتے "افغانستان میں مجاہدین کی حکومت کے قیام" کو یقینی بنایا جاتا۔ اس ضمن میں جنرل حمید گل نے اپنے طور پر کئی کاوشیں بھی کیں۔

"آپریشن جلال آباد" اس سلسلے کی ایک کڑی تھی لیکن۔ اس آپریشن میں ناکامی کے سبب مجاہدین کو عسکری محاذ پر بھی شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا۔ جہادِ افغانستان کے نفسیاتی اثرات اور نو سالہ عسکری برتری کا خواب حتمی حقیقت بننے سے پہلے ہی دم توڑنے لگا تھا۔ تحریکِ مزاحمت کی شاندار کامیابیاں ہوا میں تحلیل ہوتی نظر آنے لگیں۔ جہاد دشمن اور پاکستان دشمن عناصر کو ایک بار پھر پروپیگنڈہ کرنے کا موقع ملا کہ "افغانستان کی جنگ تو امریکیوں نے لڑی اور انہوں نے ہی روسیوں کو افغانستان سے نکلنے پر مجبور کیا۔ اگر مجاہدین اتنے ہی مضبوط اور مؤثر تھے تو جلال آباد فتح کیوں نہیں کر سکے۔" کسی حد تک یہ سوال درست بھی تھا۔ پروپیگنڈہ ایسے حقائق پر مبنی تھا جن کی آسانی سے تردید ممکن نہیں تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ ان حقائق کے پس پردہ بھی سازشوں اور چالوں کی ایک داستان چھپی ہوئی تھی۔ لیکن حقیقت کے پس پردہ سچائی کچھ بھی ہو ایک بات طے شدہ ہے کہ اس ناکامی کا سہرا جنرل حمید گل کے سر ہی بندھا۔ حمید گل جو افغان مجاہدین کے ساتھ اپنے "تعلقاتِ خصوصی" اور جہادِ افغانستان سے ایک "خصوصی وابستگی" کی وجہ سے شہرت رکھتے تھے۔ آئی ایس آئی کی کمان سنبھالتے ہی ان کی "پبلک ریلیشننگ" (PUBLIC RELATIONING) نے کام دکھانا شروع کیا۔ صحافیوں سے ملاقاتوں اور جہاد کے متعلق جذباتی بیانات نے لوگوں کے خود ساختہ اندازے بہت بلند کر دیئے تھے۔ پہلے آئی ایس آئی کے تمام آپریشن اور منصوبہ بندیاں بڑی خفیہ ہوتی تھیں۔ لوگوں کو آئی ایس آئی کے لوگوں کے بارے میں زیادہ کیا تھوڑا علم بھی نہیں ہوتا تھا۔ حتیٰ کہ جنرل اختر جیسے "زیرک اور افغان فہم" جرنیل کے بارے میں بھی دنیائے صحافت کے عام لوگ زیادہ کیا کم بھی نہیں جانتے تھے۔ جنرل اختر کم آمیز اور نمود و نمائش سے پرے بھاگتے تھے۔ اپنے کام کی لگن 'اپنے طے شدہ اہداف کے حصول 'اور کامیابی و کامرانی کا ایمان دل میں سجائے یہ جرنیل تو جہادِ افغانستان کو اپنی زندگی کا ایک جزولاینفک بنا چکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنے منصوبے کو کامیابی کی حتمی منزل کے قریب پہنچا دیا تھا۔ اس لئے جب ۱۷ اگست ۱۹۸۸ء سی۔ ۱۳۰ کے حادثے کے وقت جب عسکری قیادت منظرِ عام سے ہٹی تو جنرل اختر عبدالرحمان کا نام بلاشبہ پاکستان کے عوام کے لئے بڑی حد تک اجنبی تھا۔ یہاں تک کہ فوج میں بھی صرف چند لوگ جہادِ افغانستان کے ضمن میں جنرل اختر کے بے مثال کردار سے واقف تھے۔ اس کی وجہ کسی حد تک تو یہ تھی کہ ۱۹۷۹ء سے ۱۹۸۷ء تک کے عرصے میں جنرل اختر آئی ایس آئی کے ڈائریکٹر جنرل رہے اور ان کے فرائض کی نوعیت بڑی حد تک رازداری کا تقاضہ کرتی تھی۔ لیکن اس میں جزوی طور پر جنرل کے مزاج کا بھی

بڑا دخل تھا کیونکہ وہ ذاتی تشہیر سے ہمیشہ گریز کرتے تھے۔ آئی ایس آئی غالباً ملک کا سب سے طاقتور اور منظم ادارہ تھا اور آج بھی ہے۔ فوجی اور سیاسی انٹیلی جنس کے فرائض سرانجام دیتے ہوئے اہم خفیہ معلومات جمع کرنا' داخلی سلامتی کے لئے مرکزی رابطے کا کام کرنا آئی ایس آئی کی بنیادی ذمہ داری ہے۔ اس کی سرگرمیوں کو مخفی رکھنا' اس کے منصوبوں کا پوشیدہ رہنا اور اس کے طریقِ کار کا غیر روایتی ہونا اس ادارے کی بنیادی خصوصیات ہیں۔ (جنرل اختر عبدالرحمان اس ادارے کے نو سال تک سربراہ رہے)۔ اتنے طویل عرصے تک جنرل اختر کے اس ادارے کا سربراہ رہنے کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے افغانستان کے جہاد کی منصوبہ بندی انتہائی مہارت سے کی............ جنرل اختر کی مصروفیات میں سے کم از کم نصف وقت افغانستان کی جنگ اور اس سے متعلقہ معاملات کی نذر ہو جاتا۔ اگرچہ آج روس سپر طاقت کے طور پر دنیا کے نقشے سے محو ہو چکا ہے لیکن کچھ عرصہ قبل تک (۱۹۸۷ء سے) ایک بڑی سپر طاقت کے طور پر اسے میدانِ جنگ میں شکست دینے کا سہرا جنرل اختر ہی کے سر ہے۔ " جب جنرل اختر کو آئی ایس آئی کی سربراہی سے الگ کیا گیا تو اس وقت روس عسکری طور پر اپنی شکست خوردگی کا اعتراف کر چکا تھا۔ اس کی "سپر طاقتی کا بھرم" زیروزبر ہو چکا تھا اور روسی اپنی واپسی کا سامان کر رہے تھے۔ تحریکِ مزاحمت کا ایک شاندار دور نئے مرحلے میں داخل ہونے والا تھا۔ جنرل اختر کی عسکری حکمتِ عملی اپنا کام کر چکی تھی۔ روسی شکست کے بعد مجاہدین کی فتح کی آہٹ سنائی دینے لگی تھی۔ تحریکِ مزاحمت کا حتمی و فیصلہ کن مرحلہ اس وقت شروع ہوا جب روسیوں نے افغانستان کو "رستا ہوا زخم" دے کر یہاں سے واپسی کا پروگرام بنایا۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ افغان مجاہدین کی روسیوں پر معنوی برتری کو حقیقی فتح کا رُوپ دینے کی کوشش کی جاتی۔ عظیم الشان قربانیوں' روسیوں کے مقابلے میں استقامتِ لافانی کا مظاہرہ کرنے والی افغان قوم کی فتح کی طرف بڑھتے ہوئے قدموں کی راہ میں دعاؤں کے ہار بچھاتے۔ انہیں لبِ بام فتح کے حصول کیلئے مادی اور اخلاقی مدد فراہم کرتے' لیکن پاکستان میں بچھی ہوئی بساطِ سیاست کے مہرے چالیں چلنے لگے۔ مجاہدین کے "فتح مبین" کی طرف رواں دواں قافلے کہیں بھٹک گئے۔ "جب روس افغانستان سے اپنی فوجیں نکالنے پر آمادہ ہو گیا تھا تو امریکیوں نے اس لمحے طے کر لیا کہ "مسلمان بنیاد پرستوں" کو کابل سے دور رکھا جائے۔ یہ بات دونوں سپر پاورز کے حق میں تھی کہ میدانِ جنگ میں بنیاد پرستوں کو واضح فتح حاصل نہ ہو۔ اس مقصد کیلئے جو خفیہ منصوبہ تیار ہوا اس کے تحت جنرل اختر کو فور سٹار جنرل کی حیثیت سے ترقی دے کر آئی ایس آئی سے الگ کرنا شامل تھا۔ اس

دن سے مجاہدین کی قوت کا زوال شروع ہو گیا۔ " اس کے ساتھ ہی جنرل حمید گل کو مارچ ۱۹۸۷ء میں آئی ایس آئی کا سربراہ بنادیا گیامزاحمتی تحریک 'افغان جہاد کاانتہائی نازک دور شروع ہوا جو اپریل ۱۹۸۹ء میں جلال آباد پر ناکام حملے کے بعد تک جاری رہا۔ اس کے بعد مئی ۱۹۸۹ء میں جب وزیر اعظم بے نظیر بھٹو نے حمید گل کو آئی ایس آئی سے ہٹا کر ملتان میں کور کمانڈر بنادیا 'اس دور میں مجاہدینِ افغانستان کو میدان جہاد میں بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ بظاہر اس کی بڑی وجہ "بے نظیر حکومت کا رویّہ" بیان کی جاتی ہے۔ ہندوستان کے ساتھ پیپلز پارٹی کی قیادت کے قریب مراسم 'مسلم ممالک کے سوشلسٹ قائدین بشمول حافظ الاسد 'کرنل قذافی اور یاسر عرفات کے ساتھ بھٹّو خاندان کی قربتیں ہی مسئلہ افغانستان کے حل کو پیچیدہ بنانے کا سبب بیان کی جاتی ہیں۔ ویسے یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بے نظیر بھٹّو نے تنظیم آزادی فلسطین کے رہنما یاسر عرفات کو پارلیمینٹ میں دعوتِ خطاب دی تھی۔ یہ وہی یاسر عرفات ہیں جنھوں نے نہرو ایوارڈ حاصل کرتے وقت دہلی میں "مسئلہ کشمیر" کے حوالے سے انتہائی شرمناک باتیں کی تھیں۔ بعد میں ان کے نمائندے ان کے اس بیان کی توجیحات پیش کرتے رہے۔ مذکورہ قائدین نے مسئلہ افغانستان کے حوالے سے بھی منفی کردار ہی ادا کیا۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ انہوں نے ملّتِ اسلامیہ کے متفقہ اور طے شدہ لائحہ عمل کے برعکس رویّہ اختیار کیا۔ پھر بے نظیر دورِ حکومت ہی میں یاسر عرفات صاحب کو حکومت کی طرف سے گلبدین حکمت یار کو رام کرنے کا مشن سونپا گیا تاکہ نجیب اللہ کے ساتھ مل کر "پائیدار امن کے قیام" کی راہیں نکالی جاسکیں۔ بہر حال اس دور میں معاملات کے بگاڑ کی بے نظیر دورِ حکومت بھی ایک بڑی وجہ ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ بات بھی بڑی قابل فہم ہے کہ حمید گل مارچ ۱۹۸۷ء سے لے کر مئی ۱۹۸۹ء تک آئی ایس آئی کے سربراہ رہے۔ اس ادارے کی کامیابیوں کی فہرست خاصی طویل ہے لیکن یہاں ان کا ذکر مقصود نہیں ہے جب افغان تحریکِ مزاحمت کے حتمی اور آخری مشترکہ دورِ جہاد میں آئی ایس آئی کی کارکردگی کا جائزہ لیا جاتا ہے تو سخت مایوسی ہوتی ہے۔ اس دور میں مندرجہ ذیل اہم واقعات پیش آئے۔

۱۔	اپریل ۱۹۸۸ء	اوجھڑی کیمپ کا حادثہ
۲۔	۱۴راپریل ۱۹۸۸ء	جنیوا معاہدے پر دستخط
۳۔	مئی ۱۹۸۸ء	جونیجو حکومت کا خاتمہ
۴۔	فروری ۱۹۸۹ء	روسی افواج کا انخلاء مکمل ہوا

۵۔ مارچ ۱۹۸۹ء مجاہدین کی عبوری حکومت کانفرنس

۶۔ اپریل ۱۹۸۹ء آپریشن جلال آباد میں ناکامی

۷۔ مئی ۱۹۸۹ء آئی ایس آئی سے جنرل حمید گل کی علیحدگی

ان واقعات میں سب سے اہم اوجھڑی کیمپ کا حادثہ ہے جس نے نہ صرف بے شمار قیمتی شہری جانوں کو تلف کیا بلکہ داخلی سیکورٹی کی کمزوریوں کو بھی طشت ازبام کر دیا۔ یہ دھماکہ اس وقت ہوا جب روسی یکطرفہ طور پر اپنی فوجیں افغانستان سے واپس بلانے کا اعلان کر چکے تھے۔ اس دھماکے سے پانچ روز بعد جنیوا معاہدے پر دستخط ہونے بھی طے پا چکے تھے۔ پھر اسی مہینے چترال اور چمن میں بھی گولہ بارود کے ذخیرے اسی طرح تباہ کر دیئے گئے۔ یہ بات تو ظاہر ہے کہ یہ کاروائی اسی سپرپاور کی تھی جس نے ان ذخائر کو قائم کرنے میں پاکستان کی مدد کی تھی۔ کیونکہ روسی افواج کے انخلا کے اعلان سے امریکی مشن تو پورا ہو گیا تھا۔ اس لئے اب اگر یہ سارا گولہ بارود مجاہدین تک پہنچ جاتا تو مجاہدین آگے بڑھتے ہوئے کابل تک بھی پہنچ سکتے تھے، جو امریکیوں کو منظور نہیں تھا۔ اوجھڑی کیمپ کے دھماکے کے بعد سیاسی سطح پر اچھا خاصا شور اٹھا۔ محمد خان جونیجو نے اس سلسلے میں خاصی پُھرتی دکھاتے ہوئے کچھ جرنیلوں کو فارغ کرنے کا پروگرام بنایا۔ بقول مشاہد حسین، جنرل حمید گل صاحب جونیجو کے اپنے مقرر کردہ آدمی تھے لیکن "گندم کے ساتھ گھن پس جانے" کے مصداق جونیجو صاحب کے شکار میں حمید گل کا نام بھی وقتی طور پر شامل ہو گیا تھا۔ پھر آئی ایس آئی کا ادارہ دفاعی پوزیشن پر آ گیا۔ اپنی کمزوریوں اور خامیوں کے دفاع میں مصروف ہو گیا اس لئے وہ اپنی اصلی ذمّہ داریوں کو نہ نبھا سکا۔ یہ وجہ ہے کہ ان کی نظر صدرِ مملکت جنرل ضیاء الحق کے سی ۱۳۰ سے ہٹ گئی۔ جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ یہ طیارہ بھی اوجھڑی کیمپ کا دھماکہ کرانے والی سپر طاقت کی تخریب کاری کی نذر ہو گیا ورنہ بقول بریگیڈیئر محمد یوسف "ماضی میں آئی ایس آئی نے کئی بار صدر ضیاء الحق کو قاتلانہ حملوں سے بچایا تھا۔" اس میں کوئی شک نہیں کہ جنیوا معاہدہ "روسی افواج کی باعزت واپسی" کا ایک ایسا منصوبہ تھا جس میں طویل تحریکِ مزاحمت کو حتمی فتح حاصل کرنے سے دور کر دیا گیا تھا۔ اس معاہدے میں واپس جانے والی روسی افواج کی سلامتی کی ضمانت تو دی گئی تھی، لیکن اس نے کابل حکومت کے خلاف مجاہدین کی کاروائیوں کے خلاف کوئی قدغن نہیں لگائی تھی۔ فریقین کو اپنے اپنے دوستوں سے اسلحہ حاصل کرنے کی آزادی تھی۔ گویا فتح کابل کیلئے مجاہدین کو فوجی راستہ اختیار کرنے کی پوری

آزادی حاصل تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جنیوا معاہدے کے فوراً بعد امریکی صدر ریگن نے اپنے بیان میں واضح کر دیا تھا کہ وہ توقع رکھتے ہیں کہ مجاہدین کابل انتظامیہ کے خلاف اپنی جدوجہد تیز کر دیں گے۔ دوسری طرف کابل انتظامیہ روسی افواج کے انخلا سے اپنے حواس کھو بیٹھی تھی۔ کیونکہ روسی افواج کے انخلا سے مجاہدین کو بڑی واضح برتری حاصل ہو گئی تھی۔ روسی قیادت نے "افغانستان پر لشکر کشی" کے اپنے فیصلے کو نہ صرف غلط قرار دے دیا تھا بلکہ مجاہدین کے ہاتھوں پے در پے نقصانات کا اعتراف کرتے ہوئے افغانستان میں اپنی موجودگی کو ایک رستا ہو زخم (BLEEDING WOUND) قرار دیا تھا۔ اب جبکہ روسی افواج شکست خوردگی کا احساس لئے واپس جا رہی تھیں تو یہ مزاحمتی تحریک کی واضح کامیابی کا اظہار تھا۔ مجاہدین کو سفارتی میدان میں تو جنیوا معاہدے پر دستخطوں کی وجہ سے کامیابی نہیں مل سکی تھی لیکن "عسکری کامیابی" کو حتمی رنگ دیا جا سکتا تھا۔ کابل میں افغان مجاہدین کی حکومت کے قیام سے مجاہدین کی کامیابی مسلّم ہو سکتی تھی۔ مجاہدین حتمی فتح کی تیاری میں لگ گئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ کابل انتظامیہ گھبرا گئی' بے شمار سرحدی چوکیاں انہوں نے از خود خالی کر دی تھیں' اکا دکا پلاٹون اور کمپنی کی سطح کے دستے بھی مجاہدین کے ساتھ ملنے شروع ہو گئے تھے۔ چونکہ کابل پر کسی بھی لمحے مجاہدین کا قبضہ متوقع تھا اس لئے بیشتر سفارتخانوں بشمول امریکی سفارتی عملے کے لوگوں نے اپنے بال بچے کابل سے باہر دیگر ممالک روانہ کر دیئے تھے۔ افغانستان کی حکمران جماعت کے لوگوں نے بھی اپنے بال بچے ماسکو بھجوا دیئے تھے۔ بقول فنی و عسکری ماہرین اس وقت اگر مجاہدین روسی افواج کے بھاگتے قدموں کے نشانوں پر مارچ شروع کر دیتے تو نہ صرف کابل بلکہ تمام افغانستان بالکل اسی طرح مجاہدین کے کنٹرول میں آ جاتا جس طرح امریکی افواج کے انخلا کے بعد سارا ویتنام شمالی ویتنامیوں کے ہاتھ آ گیا تھا۔ لیکن اس نازک اور فیصلہ کن موڑ پر مجاہدین کو فتح افغانستان کے مشن پر لگانے کی بجائے آئی ایس آئی کے اربابِ اختیار نے صرف پشاور والے افغان لیڈروں کو ہی نہیں بلکہ ۶۰۰ کے قریب فیلڈ کمانڈروں کو اگلے مورچوں سے واپس بلا کر یہاں راولپنڈی میں حکومت سازی کے گورکھ دھندوں میں الجھائے رکھا۔ مجاہد جنہیں لڑنا چاہئے تھا وہ ایک ایسی حکومت کے قیام میں مصروف کر دیئے گئے تھے جس کے عملی نفاذ کے لئے ابھی زمین پر قبضہ نہیں کیا جا سکا تھا۔ آئی ایس آئی کے اربابِ اختیار ایک ایسی حکومت کے قیام کے منصوبے بنا رہے تھے جس کے نفاذ کیلئے ابھی زمین حاصل نہیں کی جا سکی تھی۔ دو ہفتے انہی گورکھ دھندوں میں ضائع ہو گئے اس دوران مجاہدین کے اختلافات کھل کر سامنے آنے لگے مختلف جماعتوں اور گروہوں کی

نا اتفاقیاں واضح ہونے لگیں۔ دوسری طرف کابل انتظامیہ کو اپنے حواس بحال کرنے کا موقع مل گیا۔ انہیں نفسیاتی طور پر سمجھنے کے علاوہ اس بات پر بھی شرحِ صدر حاصل ہو گیا کہ افغان مجاہدین اپنی فوجی طاقت کابل کے محاذ پر کبھی بھی مرتکز نہیں کر سکیں گے۔ اس دوران ہائی ویز کھلے دیکھ کر روسی حکام نے کابل انتظامیہ کی مدد کیلئے اسلحے کے انبار جمع کر دیئے۔ کابل میں گولہ بارود کے ڈھیروں نے بھی کابل انتظامیہ کو ڈٹ جانے کا حوصلہ دیا۔ اس طرح مجاہدین کے ہاتھوں "فتح افغانستان" کا ایک سنہری موقع ضائع کر دیا گیا۔ آئی ایس آئی کے اہلکار کوئی بھی کرشمہ نہ دکھا سکے۔ ابھی اس ضمن میں چہ میگوئیاں جاری تھیں کہ مجاہدین کو چھاپہ مار کاروائیوں سے ہٹا کر فوراً ہی جلال آباد جیسے مضبوط اور قلعہ بند شہر پر حملے کی تیاریاں کروانی شروع کر دی گئیں۔ ماوزے تنگ کی چھاپہ مار جنگی حکمتِ عملی کے عین مطابق مجاہدین کو باقاعدہ فوجی انداز میں تربیّت بھی دینی شروع کر دی گئی تھی کیونکہ ماؤزے تنگ تھیوری کے مطابق مزاحمت میں دشمن کو چھاپہ مار کاروائیوں سے زچ کر کے بالآخر دشمن کی افواج کو باقاعدہ تربیّت یافتہ فوج سے ہی شکست دی جا سکتی ہے۔ لیکن آئی ایس آئی کے اربابِ حل وعقد شاید یہ بھول گئے تھے کہ اس باقاعدہ فوج کی تربیّت کیلئے ایک مقبوضہ علاقہ پاس ہونا ضروری ہوتا ہے جہاں باقاعدہ فوج ترتیب دی جاتی ہے۔ بیرون ملک یا میزبان سرزمین پر خفیہ امداد سے باقاعدہ فوج تیار نہیں کی جا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ ماوزے تنگ کی کامیابی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ انہوں نے دشمن کی فوجوں کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا تھا اور اس طرح کا نظام قائم کر لیا تھا کہ دشمن کے دستے اور کمانڈران سے آ کر مل جاتے تھے جبکہ افغان تحریکِ مزاحمت اور ان کے سرپرست اس طرح کے کسی نظام کو استوار کرنے میں بُری طرح ناکام رہے۔ مجاہدین کی نہ تو سیاسی ہائی کمان تیار کی جا سکی اور نہ ہی فوجی کمان متعارف ہو سکی اس لئے کابلی افواج کو اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ نظر نہ آ سکا کہ وہ اپنی پوزیشنوں پر قائم رہیں۔

آپریشن جلال آباد کے حوالے سے دو آرا پائی جاتی ہیں۔ ایک مکتبہ فکر کے مطابق اس آپریشن کی ناکامی بے نظیر حکومت کے رویئے کی وجہ سے ہوئی جبکہ دوسرا مکتبہ فکر اس ناکامی کو جنرل حمید گل کی ناقص منصوبہ بندی سے ملاتا ہے۔ مئی ۱۹۸۹ء میں نیویارک ٹائمز کی ایک رپورٹ میں جنرل حمید گل سے یہ بات منسوب کی گئی تھی کہ جلال آباد پر حملہ وزیر اعظم بے نظیر بھٹو صاحبہ کے حکم پر کیا گیا تھا۔ گویا وہ خود تو اس ناکام حملے کے حق میں نہیں تھے۔ جنرل جیسے بڑے عہدے پر متمکن فرد سے اس قسم کے "عذر لنگ" کی توقّع نہیں کی جا سکتی کیونکہ فوجی آپریشن کسی سول منسٹری کی فائل جیسے نہیں ہوتے جن کی منظوری یا نامنظوری سے کوئی بڑا فرق نہیں پڑتا۔ فوجی آپریشن میں

سینکڑوں ہزاروں جوانوں کی جانیں داؤ پر لگتی ہیں اس لئے سینئر فوجی کمانڈر کوئی ایسا آپریشن قبول نہیں کرتے جس کی کامیابی کی غالب امید نہ ہو۔ اس طرح کی کئی مثالیں ہماری عسکری تاریخ میں محفوظ ہیں۔ خود جنرل حمید گل نے ٹینک فیکٹری میں جانے کیلئے سرکاری حکم قبول نہ کر کے ایسی ہی ایک اور مثال قائم کی ہے۔ پھر کیا بہتر نہ ہوتا کہ جنرل صاحب جلال آباد پر حملہ کرنے کا حکم قبول نہ کرتے اور اس طرح نہ صرف پاکستان خفت سے بچ رہتا بلکہ سینکڑوں کی تعداد میں شہید ہونے والے مجاہدین کی جانیں بھی بچ رہتیں۔ دوسری طرف آپریشن جلال آباد کے حوالے سے جنرل نصیراللہ بابر کے بقول "آپریشن جلال آباد جنرل حمید گل کی اختراع تھی۔ انہوں نے ہی اس کی منصوبہ بندی بھی کی۔ انہوں نے مجاہدین کی عبوری کونسل قائم کر کے ایک نئی راہ دکھائی۔ پھر اسے منظور کروانے پر تل گئے۔ ہم نے انہیں کہا کہ افغانستان کے اندر چلے جاؤ' چغہ سرائے اور کنڑ کے نام بھی تجویز کئے۔ مقصد یہ تھا کہ ڈیورنڈ لائن کے دوسری طرف جانے سے ہماری پوزیشن بہتر ہو جائے گی۔ وہاں جا کر مجاہدین اپنا نظم مملکت قائم کریں۔ میں نے عبوری حکومت سیکریٹریٹ قائم کرنے کی ہدایات بھی جاری کیں تاکہ مجاہدین امورِ مملکت چلانا سیکھیں۔ ان کا تشخّص بحال ہو۔ ہم نے امداد بھی پھر انہی وزارتوں کے ذریعے دینے کا پروگرام مرتّب کر لیا تھا تاکہ ہمیں بین الاقوامی سطح پر اس حکومت کو منوانے میں آسانی ہو' لیکن جنرل حمید گل نے یہ سب کچھ نہیں ہونے دیا بلکہ پھر اچانک آپریشن جلال آباد کا منصوبہ لے آئے۔ ہم اس دور میں بھی سیاسی حل پر زور دے رہے تھے۔ میری پختہ رائے تھی کہ مجاہدین کو جلال آباد فتح کر کے حکومت قائم کرنے کی بجائے مفتوح علاقوں میں عبوری حکومت قائم کرنی چاہئے تاکہ معاملات پُرامن طریقے سے حل ہو جائیں۔ لیکن جنرل حمید گل عسکریّت پر زور دیتے رہے اور جب انہیں اپنے عسکری جوہر دکھانے کا موقع ملا تو وہ اس میں بُری طرح ناکام ہوئے۔ اس طرح نہ صرف ان کی پیشہ وارانہ زندگی اختتام پذیر ہو گئی بلکہ مجاہدین کو بھی شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا۔"

206

207

اللہ کا سپاہی

جہادِ افغانستان میں جنرل اختر عبدالرحمان کے طلسماتی کردار کی کہانی

209

افغانستان پر اشتراکیوں کا حملہ مغرب نے ٹھنڈے پیٹوں برداشت کر لیا تھا۔ افغانستان بظاہر ایک ایسی طاقت کے قبضہ قدرت میں آگیا تھا جس نے کبھی اپنے اٹھے ہوئے قدم روکے نہیں تھے۔ قبضہ کئے ہوئے علاقے کو چھوڑا نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اسے "ریچھ" سے تشبیہ دی جاتی تھی جو کسی چیز کو اگر چمٹ جائے تو پھر چھوڑتا نہیں ہے۔ لیکن اس کے برعکس افغانستان کے پہاڑوں میں ایک نئی تاریخ لکھی جانے کی تیاریاں کی جارہی تھیں۔ ظاہر شاہ کے دورِ حکمرانی کے خاتمے کے بعد سردار محمد داؤد کے دور کو "روسی دوستی کے آغاز کا دور سمجھا جانے لگا تھا۔ لیکن جب سردار محمد داؤد نے آزاد خارجہ پالیسی اختیار کرنے کی کوشش کی تو انہیں راستے سے ہٹا کر نور محمد ترکئی اور پھر حفیظ اللہ امین کو کابل میں حکمرانی کی مسند پر بٹھا کر روسی اپنے مقاصد میں کامیاب ہوتے رہے تھے۔ ببرک کارمل کو حکمران بنانے کے ساتھ ہی جب روسی فوجیں افغانستان میں داخل ہوئیں تو کریملن کے منصوبہ سازوں کو پختہ یقین تھا کہ انہیں بہت زیادہ مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا کیونکہ مزاحمت کو تو سردار داؤد سے لے کر ببرک کارمل دورِ حکومت تک بڑی شدت سے کچل دیا گیا تھا اور مزاحمت کے ممکنہ مدد گار ایران اور پاکستان بھی اپنے مسائل میں الجھے ہوئے تھے اس لئے بظاہر ایسا کوئی امکان نہیں تھا کہ افغانستان میں روسی جارحیت کے خلاف مزاحمت منظم ہو سکے گی اور اگر تھوڑی بہت منظم ہو بھی جائے تو روسیوں کے

لئے قرار واقعی خطرہ بن سکے۔

لیکن تاریخ نے ایسی کروٹ لی کہ رواں صدی کی سیاسی و جغرافیائی کائنات ہی بدل گئی۔ پچھلی دہائی (۹۰ - ۱۹۸۰) کے آغاز میں امریکہ میں ڈیمو کریٹک پارٹی کی شکست کے بعد ریپبلکن پارٹی کے رونالڈ ریگن نے اقتدار میں آنے کے تھوڑے ہی عرصے بعد عمر رسیدگی کی انتہائی منازل کی طرف گامزن اشتراکیت کے خلاف "مؤثر کارروائی" کا فیصلہ کر لیا تھا۔ یہ کارروائی عسکری اور سفارتی دونوں محاذوں پر ہونا تھی رونالڈ ریگن اپنی پارٹی کے نظریات کے عین مطابق قدامت پرست یا مذہبی ہونے کے ناطے امریکہ میں غیر یہودی کیمپ میں رہ کر صدارتی الیکشن جیتے تھے' جبکہ ان سے پہلے صدر جمی کارٹر اپنی یہود نواز پالیسیوں کی وجہ سے امریکی عوام میں خاصے غیر مقبول ہو چکے تھے۔ امریکہ میں ڈیمو کریٹک پارٹی اور ریپبلکن پارٹی اپنے قدامت پسند اور یہود نواز نظریات کی وجہ سے ہی عوامی تائید یا مخالفت کا سامنا کرتی ہیں ذرائع ابلاغ' مالیاتی اداروں' زری اداروں اور دیگر مؤثر تنظیموں پر یہودی اثرات یا ان کے کنٹرول کے سبب امریکی الیکشن مہم خاصی متاثر ہوتی ہے۔ دسمبر ۷۹ء میں جب روسی افواج نے افغانستان پر چڑھائی کی تو امریکہ میں ڈیمو کریٹک پارٹی کی حکومت تھی اس لئے جمی کارٹر نے افغان عوام کی مدد کرنے کی بجائے افغانستان کو ایک "قصہ پارینہ" سمجھتے ہوئے چند ڈھیلے ڈھالے مذمتی بیانات دینے پر اکتفا کیا۔ اس کی بنیادی وجہ یہودی لابی تھی جو یہودیوں کی سب سے بڑی معنوی ریاست "اشتراکی روس" کے خلاف امریکی صدر کو کوئی بھی قدم اٹھانے سے باز رکھے ہوئے تھی۔ ویسے بھی ڈیمو کریٹس نہ صرف امریکی یہودیوں کے زیر اثر جماعت کے طور پر مشہور ہیں بلکہ ڈیمو کریٹک پارٹی کی صدارتی مہم کے لئے سرمایہ کی فراہمی بھی یہودی ہی کرتے ہیں اس لئے اشتراکی افواج کے جارحانہ اقدامات' بالخصوص جب وہ ایک مسلم قوم یا ملک کے خلاف ہوں تو یہود نواز پارٹی کی طرف سے ایسے اقدامات کی صرف "مذمتیں" ہی ہو سکتی تھیں اور ایسا ہی ہوا۔ جمی کارٹر انتظامیہ نے "افغانستان" کو دنیا کے نقشے سے حرف غلط کی طرح مٹا ہوا فرض کر لیا۔ افغانستان میں صدر داؤد کا تختہ الٹنے کے بعد ماسکو نواز عناصر جو کھیل اپنے اشتراکی آقاؤں کے اشارے پر کھیل رہے تھے' کارٹر انتظامیہ کی اس سے بے اعتنائی اور بے علمی کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ حفیظ اللہ امین کے قتل اور ببرک کارمل کے کابل میں آنے کے درمیانی وقفے تک کابل میں ہونے والی انقلابی سرگرمیوں کے بارے میں تقریباً پورا ایک دن اور ایک رات بیرونی دنیا کو کچھ بھی پتہ نہ چل سکا حتیٰ کہ سالانگ ہائی وے پر گامزن طویل روسی فوجی قافلے اور کابل و جلال آباد اور

باگرام ایئرپورٹوں پر لمحہ بہ لمحہ اترنے والے دیوہیکل روسی فوجی طیارے بھی امریکیوں کی نظروں سے اوجھل رہے۔ حتیٰ کہ ماسکو سے آنے والے ببرک کارمل نے ریڈیو کابل پر "اپنے حکومت سنبھالنے" اور "روسیوں کو افغان معاملات کو سنبھالا دینے کی "دعوت" کا اعلان کیا تو پھر امریکیوں اور دیگر ممالک کو پتہ چلا کہ افغانستان بھی اشتراکی افواج کی ٹھوکروں تلے روندا جاچکا ہے امریکی صدر نے روایتی انداز میں تیار کردہ ایک "مذمتی بیان" جاری کیا اور بس، معاملہ ختم کر دیا۔ اس وقت صدارتی الیکشن بھی قریب تھے اس لئے جمی کارٹر اور ان کی پارٹی اشتراکی روس کے مسلم کش عمل کی قرارواقعی مذمت اور جوابی کارروائی کر کے اپنے یہودی سرپرستوں کو ناراض نہیں کر سکتی تھی اس لئے افغانستان پر روسی جارحیت کو ٹھنڈے پیٹوں برداشت کر لیا۔ لیکن دوسری طرف امریکی عوام کو مطمئن کرنا بھی مقصود تھا۔ برسرِاقتدار ڈیموکریٹک پارٹی اور بالخصوص جمی کارٹر کی حکومت کو کمیونزم کے پھیلاؤ اور اس سے چھوٹے یورپی وایشیائی ممالک کو درپیش خطرات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ بلکہ امریکی صدر تو خود ساختہ انسانی حقوق کے نعرے کی پیروی میں کچھ اس قدر مصروف تھے اور ہر اس حکومت یا ملک کے خلاف اقتصادی ومالی پابندیاں عائد کرنے کی فکر میں رہتے تھے جہاں ان کے بقول انسانی حقوق پامال ہو رہے ہوں کہ انہیں کسی اور مسئلے سے دلچسپی ہی نہیں رہی تھی۔ سوویت یونین کی طاقت اور بڑھتے ہوئے اثرورسوخ کا عالم یہ تھا کہ مشرقی یورپ میں ہنگری، چیکوسلواکیہ اور مشرقی جرمنی کے علاوہ پولینڈ میں انسانی آزادیوں کی تو بات ہی کیا ٹریڈ یونین سرگرمیوں کی بھی اجازت نہیں تھی حتیٰ کہ پولینڈ میں ابھرتی ہوئی ٹریڈ یونین سرگرمیاں پوری قوت کے ساتھ کچل کر رکھ دی گئی تھیں سوویت یونین افریقہ اور ایشیا کے کئی ممالک بشمول ایتھوپیا، جنوبی یمن، ویت نام، شام، اور عراق میں بھی مصروفِ عمل تھا۔ اس کے علاوہ کیوبا کے رضا کاروں کے ذریعے بھی مختلف ممالک میں چھیڑ چھاڑ کی جارہی تھی۔ فروری ۷۹ء میں ایرانی شاہ کے زوال کے بعد آیت اللہ خمینی تہران پہنچ چکے تھے اور ایران کو اسلامی جمہوریہ قرار دینے کے بعد پاسداران انقلاب نے امریکی سفارتخانے کے عملے کو یرغمال بنالیا تھا۔ کارٹر انتظامیہ کی اپنے عملے کو چھڑوانے کی فضائی کوششیں بری طرح ناکام ہوچکی تھیں علاقے میں امریکہ کا بہت بڑا حلیف شہنشاہ ایران، خمینی سے شکست کھاچکا تھا یہودی لابی کے زیر اثر جمی کارٹر نے پاکستان کی امداد بھی بند کر رکھی تھی ایسے حالات میں جب روسی افواج علاقے میں داخل ہوئیں تو شکست خوردہ ذہنیت کے ساتھ کارٹر انتظامیہ ایک مذمتی بیان جاری کرنے کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتی تھی، گرتی ہوئی امریکی ساکھ کو سنبھالا دینے کے لئے انہوں نے پاکستان کی امداد بحال کرنے کا

پروگرام بھی بنایا اور ۴۰ کروڑ ڈالر کی پیش کش بھی کی جسے صدرِ پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق نے "مونگ پھلی" کہہ کر مسترد کر دیا کیونکہ جنرل ضیاء الحق کے نزدیک "اتنے بڑے دشمن" اور "اتنی بڑی جارح طاقت" کا سامنا کرنے کے لئے "چالیس کروڑ" کی امداد "اونٹ کے منہ میں زیرے" کے مترادف تھی، اور یہ بات بڑی حد تک درست بھی تھی۔ اس کی کئی توجیہات ممکن ہیں لیکن دو باتیں بڑی واضح ہیں اوّلاً یہودیّت نواز ڈیمو کریٹک صدر کو ایک مسلم ملک پر اشتراکیوں کی یلغار سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ دوم مختلف محاذوں پر روس کی پے در پے کامیابیوں اور بڑھتے ہوئے اثرات نے امریکی قیادت کو اس قدر مفلوج بنا دیا تھا کہ وہ بروقت" اور "راست ردِ عمل" پیش کرنے کی پوزیشن ہی میں نہیں تھی امریکی سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ اپنے طور پر یہ سمجھ چکا تھا کہ روسی حلقہ اثر میں نقب لگانا ناممکن ہو چکا ہے۔ اس لئے افغانستان میں کسی قسم کی "مؤثّر کارروائی" پر وقت و وسائل کا ضیاع احمقانہ حرکت ہو گی۔ یہی وجہ ہے کہ امریکیوں نے ابتداء ہی سے افغانستان کو سرِ دست ایک بھُولی بسری داستان سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ پاکستان کو امداد کی پیش کش بھی "مہاجرین کی آباد کاری" کے سلسلے میں تھی جسے جنرل ضیاء الحق نے مسترد کر دیا تھا۔ ایرانیوں کے امریکیوں کے ساتھ جارحانہ سلوک کے باعث امریکی رائے عامہ بھی اہلِ اسلام کے خلاف تھی سی آئی اے اور امریکی فوجی ہیڈ کوارٹر "پینٹا گون" کے اہلکاروں نے کارٹر انتظامیہ کو رائے دی تھی کہ "پاکستان افغانستان کے سلسلے میں مزاحمت کا مدد گار بننا قبول کرے یا انکار کرے افغانستان کو ایک ہاری ہوئی بازی سمجھنا چاہیئے۔ کیونکہ گوریلوں پر مشتمل ایک بے ترتیب یا منظم فوج 'ایک باقاعدہ' جنگی سازو سامان سے لیس فوج کو جسے جدید ہوائی چھاتہ بھی مہیا ہو شکست نہیں دے سکتی اس لئے افغانستان کو ایک ہاری ہوئی بازی سمجھنا چاہیئے۔ انہی تجزیہ نگاروں کے مطابق روسی افواج چند ہفتوں کے اندر اندر افغانستان پر مکمل کنٹرول حاصل کر لیں گی۔ افغانستان ویسے بھی عرصہ طویل سے روسی حلقہ اثر میں رہا تھا۔ اس لئے مزاحمتی گروہوں کی مدد کر کے بلاوجہ قومی دولت (امریکی وسائل) پھونکنے اور روس کو ناراض کرنے سے کیا فائدہ" یہی وجہ ہے کہ کارٹر انتظامیہ نے ۴۰ کروڑ ڈالر کی خطیر امداد کی پیش کش کر کے .... FACE SAVING کی کوشش کی، جسے جنرل ضیاء الحق نے مونگ پھلی قرار دے کر مسترد کر دیا تھا۔

"دوسری طرف جنرل ضیاء الحق نے ڈائریکٹر جنرل آئی ایس آئی جنرل اختر عبدالرحمان سے رابطہ قائم کیا جنرل اختر نہ صرف پاکستان کے ایسے حساس ترین ادارے کے سربراہ تھے جس

کے ذمّے فوجی اور سیاسی انٹیلی جنس کے فرائض سرانجام دیتے ہوئے اہم خفیہ معلومات جمع کرنا اور داخلی سلامتی کے لئے مرکزی رابطے کا کام تھا بلکہ تقسیم ہند سے قبل بھی وہ جنرل ضیاء الحق کے ساتھ رہے تھے آج دونوں ایک بار پھر اکٹھے ہو رہے تھے۔ ان میں سے ایک افواج کا سالار اعلیٰ اور مملکت کا سربراہ تھا جبکہ دوسرا قومی سلامتی کا نگران۔ جنرل ضیاء الحق نے جنرل اختر پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ صدرِ مملکت کو بخوبی اندازہ تھا کہ پاکستان انتہائی خطرناک جغرافیائی صورتحال سے دوچار ہے۔ مشرق میں ۸۰ کروڑ ہندوؤں کی کانگریسی ریاست جارحانہ عزائم لئے بیٹھی ہے مغرب میں روس کی سرخ فوج افغانستان پر قبضہ جما چکی ہے اس بات کا شدید خطرہ تھا کہ پاکستان ان طاقتور دشمنوں کے درمیان آکر چکی کے دو پاٹوں میں پس کر نہ رہ جائے اس خارجی صورتحال کے ساتھ ساتھ داخلی صورتحال بھی خوشگوار نہیں تھی۔ اندرونِ ملک جنرل ضیاء کی مقبولیت زیادہ قابلِ رشک نہیں تھی ان کا اقتدار ووٹوں کی قوت سے نہیں فوجی قوت کے بل بوتے پر قائم تھا اور ملکی نظم و نسق فوجی قوائد و ضوابط کے تحت چلایا جا رہا تھا۔ جنرل ضیاء الحق چیف مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر تھے سابق وزیرِ اعظم ذوالفقار علی بھُٹو کو ایک متنازعہ عدالتی فیصلے کے تحت پھانسی دینے کے باعث ساری دنیا جنرل ضیاء الحق کے بارے میں غیر ہمدردانہ اور بڑی حد تک مخاصمانہ رویّہ رکھتی تھی۔ یوں عملاً جنرل ضیاء الحق نام نہاد مہذّب دنیا سے کٹ کر رہ گئے تھے۔ اس پس منظر میں افغانستان میں روسی فوجوں کی آمد کے معاملے کو زبردست اہمیت حاصل ہو گئی کیونکہ پاکستان کا ردِّعمل نہ صرف ملک کی تقدیر بلکہ خود ضیاء الحق کے مقدر پر اثرانداز ہونے والا تھا۔ صدر ضیاء الحق نے جنرل اختر سے کہا کہ وہ فوری طور پر قومی تناظر میں اجتماعی صورتحال کا تجزیہ پیش کریں تاکہ پاکستان کے ردِّعمل کے بارے میں حتمی فیصلہ کیا جاسکے۔ "

دراصل جنرل ضیاء الحق یہ فیصلہ کرنا چاہتے تھے کہ "سرپر موجود اس سرخ ریچھ" سے کس انداز میں نمٹا جائے۔ کیا اسے حیلوں بہانوں سے ہی دور رکھا جائے یا اسے چھڑی دکھائی" جائے۔ یعنی کیا اس کے ساتھ سفارتی اور روایتی ضوابط کے مطابق برتاؤ کیا جائے یا پھر طاقت کے ذریعے اسے سرحدوں سے پرے رکھنے کی پالیسی اختیار کی جائے۔ پہلا اندازِ فکر آزمودہ تھا۔ مسئلہ کشمیر ہو یا فلسطین کا ایشو، پچھلے ۳۵ سال سے اسی انداز میں حل کرنے کی کوششیں کی جارہی تھیں لیکن معاملات جوں کے توں تھے۔ ان مسائل کے حل میں کوئی پیش رفت نہیں ہوئی تھی جبکہ دوسرا انداز اختیار کرنے میں بہت سے خطرات کا سامنا کرنا پڑ سکتا تھا۔ پاکستان کا اولیں مددگار "امریکہ" ایک عرصے سے ناراض تھا اقتصادی اور فوجی امداد بند تھی۔ اس لئے دوسرے انداز

کو اختیار کر کے مزید خطرات مول نہیں لئے جاسکتے تھے۔ " جنرل ضیاء الحق اس نئی صورتحال میں یکسوئی حاصل کرنا چاہتے تھے کیونکہ پاکستان کے ردِّعمل پر ہی افغانوں کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا تھا۔ روسی شاید پاکستان کے ردّعمل کو اتنی اہمیّت نہیں دے رہے تھے کیونکہ امریکہ نفسیاتی طور پر روسی جارحانہ عزائم کے سامنے جھک چکا تھا۔ ان ہی دنوں میں ایرانی شاہ کی حکومت کے خاتمے کے بعد یہاں امریکی مفادات کے نگران ناپید ہوگئے تھے۔ امریکہ علاقے میں بُری طرح ہزیمت کا شکار ہو چکا تھا ایسی صورتحال میں جنرل ضیاء الحق نے جنرل اختر سے رائے طلب کر کے ایک ایسی ذمہ داری ان کے کاندھوں پر ڈال دی تھی جس کی درست ادائیگی نہ صرف پاکستان اور افغانستان کے مستقبل پر اثر انداز ہونے والی تھی بلکہ ایک عالمی طاقت کی طویل مدتی منصوبوں کی کامیابی یا ناکامی کا انحصار بھی پاکستان کے اس ردِّعمل پر تھا جس کے بارے میں جنرل ضیاء الحق نے ان سے رائے طلب کی تھی۔ ویسے جنرل ضیاء الحق کی ذاتی سوچ کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے جنوری ۱۹۸۰ء میں اسلامی ممالک کے وزرائے خارجہ کی کانفرنس اسلام آباد میں طلب کر کے "روسی جارحیّت" کو سفارتی محاذ پر ہی للکارنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور وزرائے خارجہ کانفرنس نے کیا کیا "مذمت" اور "مطالبہ"۔ افغانستان پر روسی عسکری جارحیّت کی مذمت اور "روسی افواج کے انخلا کا مطالبہ" ایسی مذمتیں اور ایسے مطالبات رواں صدی کے آغاز سے ہی استعماری و سامراجی طاقتوں کے خلاف یا ان کے حضور پیش کئے جارہے تھے۔ افریقہ 'یورپ اور مشرقِ بعید کے علاوہ ایشیا میں بھی یہ استعماری اور سامراجی قوتیں چھوٹی اور کمزور اقوام پر عرصۂ حیات تنگ کر رہی تھیں۔ یہ چھوٹی اقوام یا تو براہِ راست مسلم سلطنتِ عثمانیہ کی زیرِ نگرانی تھیں یا اس کے زیرِ اثر۔ مسلمانوں کی دوسری بڑی مغلیہ سلطنت اس سے پہلے ہی نصرانی ہتھکنڈوں کا شکار ہو چکی تھی رواں صدی میں صلیبیوں اور صیہونیوں نے مل کر خلافتِ عثمانیہ پر ہاتھ صاف کئے تھے۔ مسلمان صرف "مذمتیں" اور "مطالبات" ہی کر سکے تھے دوسری جنگِ عظیم کے بعد مشرقِ وسطیٰ میں عرب اسرائیل تنازعہ اور جنوبی ایشیا میں پاک بھارت تنازعہ کی تاریخ یہود و ہنود کی چیرہ دستیوں اور مسلم علاقوں پر دست درازیوں اور مسلمانوں کی طرف سے ان اقدامات کی "مذمتوں" سے عبارت تھی۔ تقریباً ۳۵ سال گزرنے کے باوجود نہ تو فلسطین آزاد ہو چکا تھا اور نہ ہی کشمیری مسلمانوں کو ہندوؤں کی چیرہ دستیوں سے نجات دلائی جاسکی تھی اس لئے وزرائے خارجہ کانفرنس کی قراردادوں کا جو اثر ہو سکتا ہے اس کے بارے میں کچھ زیادہ غور و فکر کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ویسے تو اسی مہینے میں اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی کے خصوصی اجلاس میں بھی

۱۰۴ ووٹوں کی تائید سے روس کے خلاف ایک "مذمتی قرارداد" منظور کی جاچکی تھی جس میں "روسی افواج کے فی الفور اور بلاشرط انخلاء کا مطالبہ بھی شامل تھا اقوامِ متحدہ ایسے مطالبات پہلے بھی کئی اقوام کے جارحانہ اقدامات کے خلاف پیش کر چکی تھی لیکن فیصلے کہیں اور ہی ہوتے تھے۔

جنرل اختر عبدالرحمان نے معاملے کی نزاکت اور اہمیّت کو پیشِ نظر رکھ کر معاملات کا جائزہ لینا شروع کیا۔ افغانستان میں روسیوں سے مقابلہ کرنے سے پہلے جنرل اختر بھارت کے خلاف بھی تین بار مورچہ زن ہو چکے تھے۔ قیامِ پاکستان کے وقت جنرل اختر توپ خانے کے جونیئر افسر تھے یہ دور تقسیمِ ہند کا دور تھا ہر طرف قتل وغارت گری کا بازار گرم تھا ہجرت بھی جاری تھی ہندو اور سکھ مسلمانوں کا قتلِ عام کر رہے تھے اس طرح جنرل کے دل میں کفار کے خلاف نفرت کا بیج پہلے ہی بویا جاچکا تھا۔ پاک بھارت جنگوں میں انہوں نے عسکری مہم جُوئی اور کامرانی کا تجربہ بھی کر لیا تھا۔ ۱۹۴۸ء میں معرکہ کشمیر میں بھی شامل تھے اس دوران انہیں قبائلی لشکروں کے ساتھ کام کرنے کا موقع بھی ملا تھا جس کی وجہ سے انہیں قبائلیوں کی نفسیات اور اندازِ فکر و حرب سے بھی واقفیت تھی۔ سب سے اہم بات ان کا افغان خاندانی پس منظر تھا ان کی رگوں میں بھی افغان خون دوڑ رہا تھا۔ ان تمام حالات نے جنرل اختر کو ۱۹۸۰ء کی ابتدا میں مملکتِ خداداد پاکستان کو درپیش نئی صورتحال کا واقعاتی تجزیہ کرنے اور پھر حکمتِ عملی ترتیب دینے میں مدد کی۔

جنرل اختر نے حالات وواقعات کا تجزیہ کرتے وقت روسیوں کی نفسیات کے ساتھ ساتھ ان کی صدیوں پر پھیلی ہوئی توسیع پسندی کی حکمتِ عملی پر بھی غور کیا۔ کوئی بھی پالیسی اختیار کرنے کے بعد جارح روس کے ممکنہ ردّعمل پر غور کرتے وقت بڑے بڑے تجزیہ نگار اور محقق کانپ اٹھتے تھے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ افغانوں کی قبائلی واسلامی روایت کے علاوہ صدیوں پر پھیلی ہوئی حریّت فکر وعمل کی تاریخ بھی تھی جس میں یہ واضح الفاظ میں درج تھا کہ انہوں نے کبھی بھی کسی ملکی یا غیر ملکی جارح کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کیا۔ اشوکا اعظم کے زمانے سے لے کر برطانوی سامراج کے دور تک افغانوں کی تاریخ عملی جدوجہدِ حُریّت سے بھری پڑی تھی لیکن دوسری طرف زار شاہی اور اشتراکی روسیوں نے بھی اپنے آگے بڑھتے ہوئے قدم کبھی واپس نہیں لوٹائے تھے روسیوں کی ہر پالیسی توسیع پسندی کی غماز رہی تھی ایسے متذبذب حالات میں جنرل اختر نے مومنانہ فراست اور پیشہ وارانہ مہارت کے ساتھ جنرل ضیاء کو ایک ایسی پالیسی پیش کی جس سے جنرل ضیاء الحق نے اتفاق تو کر لیا کیونکہ اس کے علاوہ شاید دوسرا چارہ کار نہیں تھا لیکن اس کی

حقانیت وصداقت پر اتنی دیر تک یقین نہ آیا جب تک پورے افغانستان میں تحریکِ مزاحمت کسی موسمی گل رنگی کی طرح نہ پھوٹ پڑی۔ جنرل اختر نے صورتحال کا تجزیہ پیش کرتے وقت افغانستان کے جغرافیائی محلِ وقوع کی خصوصیات ' اس کے ذرائع مواصلات اور ڈیورنڈلائن کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ افغانوں کی قبائلی اور مہم جویانہ طبائع کو بھی سامنے رکھا جنرل اختر کو اس بات پر پختہ یقین تھا "شجاع ماضی آزادی کی تڑپ اور اس کی خاطر قربانیاں دینے اور زبردست قوتِ برداشت کے حامل افغان قبائل اپنے اندر اللہ کی راہ میں جہاد کا جذبہ بھی رکھتے ہیں اس لئے انہیں اگر مناسب تربیت کی سہولیات فراہم کی جائیں تو یہ " ناقابل شکست گوریلا فوج " کی شکل بھی اختیار کر سکتے ہیں اسی تجزیئے میں ایران کی صورتحال ' روس کی حکمتِ عملی ' خطے میں امریکی مفادات اور بھارت کے امکانی ردِّعمل کا جائزہ بھی شامل تھا۔ تمام پہلوؤں کو دیکھتے ہوئے جنرل اختر نے جو نظری منصوبہ جنرل ضیاء الحق کو پیش کیا وہ "فوجی حکمتِ عملی" کا ایک ایسا مجموعہ تھا جس میں سیاسی فتح حاصل ہونے کے امکانات کی نشاندہی بھی کی گئی تھی جنرل اختر نے پُرزور سفارش کی کہ پاکستان کو نہ صرف موجودہ تحریکِ حریّت ومزاحمت کا ساتھ دینا چاہئے۔ بلکہ اسے آخری حدوں تک مؤثر بنانے کی کوشش بھی کرنی چاہئے ان کی دلیل یہ تھی کہ افغانستان پاکستان کی پہلی دفاعی لائن ہے اور وہاں اشتراکیوں کے قبضے کے بعد بلوچستان کی طرف سے پاکستانی علاقے میں ان کی دخل اندازی اور توسیع پسندی کے خطرات ڈرامائی انداز سے بڑھ گئے ہیں۔ افغانستان پر حملہ دراصل ایک کافر قوم کا ایک مسلم قوم پر حملہ ہے۔ انہوں نے جنرل ضیاء الحق کو مشورہ دیا کہ اگر ہم پردہ داری کے ساتھ ' پس منظر میں رہتے ہوئے افغانوں کی تحریک مزاحمت کی حمایت کرتے ہوئے اسے ایک گوریلا جنگ میں تبدیل کر دیں تو اس سے نہ صرف اشتراکیوں کے بڑھتے ہوئے قدم یہاں افغانستان میں روکے جا سکتے ہیں بلکہ انہیں افغانستان سے باہر بھی دھکیلا جا سکتا ہے " انہوں نے بڑے پُرعزم انداز میں کہا کہ "افغانستان ایک ویت نام بن سکتا ہے اور روس بھی اسی انجام سے دوچار ہو سکتا ہے جس سے امریکی دوچار ہوئے تھے " انہوں نے بالکل واضح اور کھلے انداز میں "فوجی راستہ " اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔ اس کا مطلب بڑا واضح اور صاف تھا کہ پاکستان افغان تحریکِ مزاحمت کے "بیس کیمپ " کی صورت اختیار کرے گا یعنی پاکستان خفیہ طور پر افغان گوریلوں کی مدد کرے۔ انہیں مالی امداد دی جائے ' اسلحہ وگولہ بارود فراہم کیا جائے۔ ٹریننگ کی سہولتیں فراہم کی جائیں۔ اس طرح تحریکِ مزاحمت نہ صرف زندہ رہے بلکہ پھلتی پھولتی بھی رہے۔ ایسی پالیسی کے لئے ضروری تھا کہ صوبہ سرحد اور بلوچستان کی افغانستان

سے ملنے والی سرحدوں کو مہاجرین اور مجاہدین دونوں کی پناہ گاہ کے طور پر کھلا رکھا جائے تاکہ وہ آزادانہ طور پر ڈیورنڈ لائن کے آر پار حرکت کر سکیں کیونکہ ایک پیشہ وارانہ حکمت کار کے طور پر جنرل اختر کو بخوبی اندازہ تھا کہ اس طرح کی کسی بھی مہم کی کامیابی کے لئے ایک محفوظ پناہ گاہ کا ہونا بنیادی شرط ہے جہاں سے مزاحمتی گوریلوں اور اسلحہ کو بحفاظت افغانستان کے اندر تک مطلوبہ "محاذوں" تک پہنچایا جا سکے۔ جنرل اختر سیدھے سادھے انداز میں جنرل ضیاء الحق کو دنیا کی دوسری بڑی طاقت، عظیم عسکری طاقت سے پنجہ آزمائی کا مشورہ دے رہے تھے، جس کے نتیجے میں روس کے مشتعل ہونے اور پھر مشتعل ہو کر پاکستان کے خلاف کھلی جارحیت پر اُتر آنے کا امکان بھی تھا۔ ایسی صورت میں ممکنہ نتائج کا خیال ہی ہولناک تھا، لیکن پھر کیا ہو سکتا تھا، پاکستان ایک نازک صورتحال کا شکار ہو چکا تھا اور اس سے بہرحال نمٹنے کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ جنرل ضیاء نے بھی جنرل اختر سے اتفاق کیا۔ انہوں نے اس حقیقت کو تسلیم کیا کہ کمیونسٹوں کے خلاف تحریکِ مزاحمت کی حمایت نہ صرف "اسلامی جہاد" ہے بلکہ اس طرح روسیوں کو مغربی سرحد پر پاکستان کی پہلی دفاعی لائن پر ہی روکا جا سکتا ہے۔ سب سے بڑی بات خود "ضیا حکومت" تھی جس کے بارے میں جنرل ضیاء نے اندازہ لگا لیا کہ افغانستان میں روسیوں سے ٹکر لے کر وہ بین الاقوامی سطح پر اپنا کھویا ہوا وقار بڑی حد تک بحال کر سکتے ہیں۔ روسیوں سے ٹکر لینے کی صورت میں اسلامی و مغربی دنیا کے علاوہ "کمیونسٹ دشمن" عناصر کی مالی و سیاسی امداد کے علاوہ سفارتی پشت پناہی بھی حاصل ہو سکتی تھی۔

ایک جرنیل سیاسی نقطہ نظر سے اس مسئلے کی پشت پناہی کے ذریعے حاصل ہونے والے مفادات دیکھ رہا تھا "اپنی حکومت کا جواز، عالمی سطح پر مارشل لائی اندازِ حکومت کی قبولیت، معاشی و سفارتی امداد سے سب کچھ حاصل ہو سکتا تھا۔ روسیوں کو افغانستان میں الجھا کر یہ سب کچھ حاصل ہو سکتا تھا۔ تمام فوجی اور سیاسی عوامل ایک ہی سمت میں اشارہ کر رہے تھے۔ جنرل ضیا نے اپنے رفیق کار کے منصوبے کی تائید کی اور اس کے ساتھ ہی وہ تاریخی دور شروع ہوا جس میں جنرل اختر عبدالرحمان نے آئی ایس آئی کو نہ صرف دنیا کی بہترین ایجنسیوں کی صف میں لا کھڑا کیا بلکہ طویل اور مشکل ترین محاذِ جنگ پر رسد اور عسکری نقل و حمل کے لئے ایک ایسا جال قائم کیا جس کی مثال دوسری جنگِ عظیم کے بعد کہیں اور دکھائی نہیں دیتی ہے۔ جنرل اختر نے اپنے آٹھ سالہ دورِ قیادت میں آئی ایس آئی کو حقیقی معنوں میں ایک ایسے ادارے کی صورت دے دی جس نے دنیا کی عظیم ترین جنگی مشینری کے تار و پود ایسے بکھیرے کہ افغانستان سے واپسی کے بعد وہ دنیا کے

نقشے سے ایک سپر طاقت کے طور پر محو ہونے کے بعد اب صرف اپنا آپ ہی سنبھالنے کے لئے مضطرب ہے۔

تاریخی تجزیئے کے اس موڑ پر دو بڑی غلط فہمیوں کا ازالہ کرنا ضروری ہے تاکہ اس کے بعد پیش آنے والے واقعات کو ٹھیک اور حقیقی پس منظر میں سمجھنے میں آسانی پیدا ہو سکے۔ ویسے ہمارے ہاں تحقیق و جستجو کی روایت زیادہ روشن نہیں ہے۔ ہمارے دانشور اور صحافی مغربی ذرائع ابلاغ اور وہاں کے دانشوروں کے تجزیوں کو من و عن اپنی زبان میں کہہ کر یا لکھ کر "بین الاقوامی سوچ رکھنے والے" دانشور بنتے رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اپنی تاریخ پر نازاں و فرحاں نہیں ہو سکے ہم اپنی نئی نسلوں کو بھی آگہی نہیں دے سکے اس کی وجہ یہی ہے کہ ہم واقعات کی تحقیق و جستجو میں محنت نہیں کرتے۔ افغانستان سے روسی افواج کا انخلاء اور پھر سوویت یونین کا خاتمہ ایک دوسرے سے جڑے ہوئے واقعات ہیں۔ سوویت یونین کا قیام ایک نظریئے ایک تحریک کا مرہونِ منّت ضرور تھا، لیکن اس نظریئے نے روس کے ساتھ چودہ دیگر ریاستوں کے الحاق میں کوئی کردار ادا نہیں کیا تھا۔ اشتراکیّت نے ان مختلف تہذیبی و ثقافتی اکائیوں کو جوڑنے کا کام کبھی بھی نہیں کیا۔ اس لئے اب اگر سوویت یونین قائم نہیں رہا تو اسے اشتراکیّت کی ناکامی قرار دینا بھی درست نہیں ہے۔ سوویتوں کی یونین نہ کبھی پہلے اشتراکی نظریات کی مرہونِ منّت رہی تھی اور نہ اب ہے۔ اس لئے مغرب کا یہ کہنا کہ کمیونزم ناکام ہو گیا، پروپیگنڈے کے زمرے میں آتا ہے۔ یہاں کمیونزم کے محاسن یا قباحتیں سے بحث مطلوب نہیں ہے۔ اس کی کامیابیاں یا ناکامیاں زیرِ بحث نہیں ہیں، بلکہ بتانا یہ مطلوب ہے کہ آخر اتنی بڑی سپر طاقت کو کیا ہوا کہ ستر کی دہائی کے آغاز میں اشتراکی افغانستان میں نقب زن ہوئے تو آخر ان کا یہ فیصلہ ان کے زوال کا نقطہ آغاز کیوں بن گیا۔ حالانکہ امریکہ اور اس کے حواری، پولینڈ میں باوجود کوششوں کے وہاں کے عوام کو اشتراکی گرفت سے نہیں بچا سکے تھے۔ یہ وہ تلخ سوالات ہیں جن کا جواب حقائق سے نقاب کشائی کر سکتا ہے۔ اس لئے ان حقائق کو جاننا انتہائی ضروری ہے تاکہ غلط فہمیاں دور ہو سکیں۔

یہ بات نہ صرف نظری اعتبار سے درست ہے بلکہ عملی طور پر بھی ثابت ہو چکی ہے کہ اشتراکیت ریاستی جبر اور تشدد کی اندھی طاقت کے ذریعے ہی "سوویتوں کی یونین" پر نافذ العمل رہی۔ بالشویک انقلاب کے بعد کمیونسٹ پارٹی نے لینن کی زیرِ قیادت جبر و تشدد کے جس دور کا آغاز کیا تھا، لیونڈ برژنیف کا دورِ حکومت اس کی انتہائی کڑی تھی اور افغانستان پر لشکر کشی کا فیصلہ اشتراکیوں کے ریاستی جبر و قہر کے ذریعے "یونین" قائم کرنے کے جنون کی انتہا۔ اس وقت تک

اشتراکی روس کے بارے میں اس قدر سراسیمگی پیدا ہو چکی تھی کہ امریکہ اور دیگر اقوامِ مغرب نے اشتراکیوں کے اس فیصلے کو "ناقابل واپسی" سمجھ لیا تھا اور وہ کسی حد تک اس میں حق پر بھی تھے۔ ۱۹۸۸ء میں اشتراکی افواج کی واپسی کا تعلق سوویت نظامِ مملکت میں کسی گڑبڑ یا نظریاتی کشمکش میں ناکامی سے ہرگز نہیں تھا بلکہ بڑے سادہ انداز میں یہ "عسکری ہزیمت" قبول کرنے کا فیصلہ تھا۔ کسی اشتراکی رہنما نے یہ نہیں کہا کہ "کیونکہ ہم افغانستان میں اشتراکی نظام قائم نہیں کر سکے اس لئے ہم یہاں سے واپس جا رہے ہیں"۔ کیونکہ اشتراکی نظام قائم کرنے کی کاوشیں تو انہوں نے ظاہر شاہی نظام کے خاتمے کے بعد ہی شروع کر رکھی تھیں پھر اپریل ۱۹۷۸ء میں انقلاب ثور کے بعد نور محمد ترکئی کے ذریعے یہ کاوشیں بڑے منظم اور فعال انداز میں جاری رہیں۔ سردار داؤد کے دورِ حکومت میں جن افغان گروپوں کو پاکستانی حکومت منظم کر کے کابل حکومت کے خلاف گوریلا سرگرمیوں کے لئے امداد فراہم کرتی تھی' انقلابِ ثور کے وقت تک وہ امداد بھی مکمل طور پر بند ہو گئی تھی۔ وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کے دورِ حکومت میں گورنر سرحد جنرل نصیر اللہ بابر نے افغان مزاحمتی لیڈروں کی پشت پناہی کا جو سلسلہ شروع کیا تھا' جنرل ضیاء الحق دور کے شروع ہوتے ہی وہ بھی ختم کر دیا گیا تھا۔ اس لئے سردار داؤد کے بعد سے لے کر ببرک کارمل کے دورِ حکمرانی کے آغاز تک اشتراکیوں کو افغانستان میں من مانیاں کرنے کی کھلی چھٹی تھی شہری مراکز پر ماسکو نواز عناصر چھائے ہوئے تھے۔ سول بیوروکریسی سے لے کر فوج اور فضائیہ کے اعلیٰ عہدیداروں تک سب کا تعلق یا تو پیپلز ڈیموکریٹک پارٹی آف افغانستان سے تھا یا وہ اس سے ہمدردی رکھتے تھے۔ کے جی بی ریاستی امور کی نگرانی کرتی تھی تو سوویت مشیروں کے اشاروں پر معاملات طے پا رہے تھے۔ ایسے میں جب افغانستان کو دسمبر ۷۹ء میں سوویت یونین کے ساتھ ملانے کا فیصلہ کیا گیا تو اس میں نظام کا کہیں سقم دکھائی نہیں دیتا۔ لیکن ۱۹۸۸ء میں اشتراکی افواج کی واپسی کو اشتراکی نظام کی ناکامی قرار دینا بالکل غلط ہے کیونکہ اشتراکیوں نے جو نظریاتی کھیل ۱۹۷۳ء میں ظاہر شاہی خاتمے کے بعد شروع کیا تھا' وہ انہی کی مرضی کے مطابق ۱۹۷۹ء تک جاری رہا اور پھر دسمبر ۷۹ء میں اشتراکی افواج کے افغانستان میں داخلے کے بعد بھی جاری رہا بلکہ اس میں تیزی آ گئی۔ اب معاملات "بالواسطہ" نہیں بلکہ براہِ راست ماسکووی حکمرانوں کے ہاتھوں میں آ گئے تھے۔ نظری بنیادوں پر جاری کام کو اور بھی تیز کر دیا گیا تھا۔ آخر پھر ۱۹۸۸ء میں روسیوں کو یہاں سے ذلیل و خوار ہو کر یوں نکلنا پڑا۔ پہلی غلط فہمی' اس سوال کے اس جواب میں پوشیدہ ہے جسے مغربی ذرائع ابلاغ نے ہمارے ہاں پھیلا دیا ہے۔ یعنی "روس کو افغانستان سے اس لئے نکلنا پڑا

کہ کمیونزم ناکام ہوچکا تھا" حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ کمیونزم اس وقت بھی اتنا ہی "توانا" تھا۔ (نظری اعتبار سے) جتنا ستر کی دہائی کے آخر میں جب پولینڈ میں ابھرتی ہوئی اشتراکیت تحریک" کو بری طرح کچل کر رکھ دیا گیا تھا۔ لیکن جب پولینڈ میں "سالیڈیریٹی تحریک" کو کچلا گیا تو اشتراکی افواج بہت توانا اور طاقت ور تھیں۔ لیکن جب ۱۹۸۸ء میں اشتراکی افواج نے افغانستان سے نکلنا شروع کیا تو وہ شکست خوردہ ہوچکی تھیں۔ افغان مجاہدین کا مقابلہ کر کر کے اور ان سے بار بار شکست کھا کر ان کا مورال بری طرح پست ہو چکا تھا۔ جاہ و جلال اور تسخیرِ عالم کا جذبہ پٹ چکا تھا۔ اشتراکی "جنگی مشین" کی چولیں ہل چکی تھیں۔ آٹھ سال تک جدید ذرائع جنگ حاصل ہونے کے باوجود افغانوں کے جذبہ جہاد کو شکست نہیں دے سکے تھے۔ اس پر مستزاد وہ جنگی نقصانات تھے جن کا بوجھ ہرروز اشتراکی روس کی معیشت پر بُری طرح اثر انداز ہو رہا تھا۔ افغان مجاہدین کے ہاتھوں ہونے والے نقصانات کو اگر مجموعی طور پر دیکھا جائے تو وہ دینا کی بڑی سے بڑی سلطنت بھی برداشت نہیں کر سکتی تھی، اور ایسا ہی ہوا۔ گورباچوف نے ۱۹۸۱ء سے لے کر ۱۹۷۹ء سے پہلے تک ہونے والی جنگی مہمات کے کئی فیصلے کو غلط نہیں کہا۔ بلکہ ۱۹۸۰ء (دسمبر ۱۹۷۹ء) میں افغانستان پر لشکر کشی کے فیصلے کو غلط کہا کیونکہ اس مہم جُوئی کے دوران جس قدر زیادہ "جنگی نقصانات" کا بوجھ اُٹھانا پڑا اس نے سوویت معیشت پر خوفناک حد تک بُرے اثرات مرتب کئے۔ یہی وجہ ہے کہ "اس فیصلے کا غلط ہونے کا اقرار کرتے ہوئے گورباچوف نے معاشی بدحالی کا ذکر بھی کیا۔"

افغانستان پر لشکر کشی کے بعد جہاں ایک طرف جنگی نقصانات نے سوویت معیشت پر بُرے اثرات ڈالنے شروع کر دیئے تھے وہاں افغانستان میں اشتراکی افواج کی پٹائی نے سوویت افواج کے مورال پر بھی بُرا اثر ڈالنا شروع کر دیا تھا سوویت یونین کے قیام اور بقا کا تعلق جس "عسکری طاقت" (MILITARY MUSCLE) سے تھا۔ وہ بھی کمزور ہونا شروع ہو گئی تھی۔ معاشی بدحالی کے ساتھ ساتھ عساکر کے مورال میں زوال پذیری نے سوویت معاشرے میں پائے جانے والے فطری تضادات کو ابھرنے کا موقع دیا۔ عساکر کے مورال کی پستی نے ان تضادات کی خلیج کو اس قدر وسیع کر دیا کہ بالآخر ریاستی جبر کے سہارے قائم عظیم اشتراکی سلطنت صفحہ ہستی سے ہی معدوم ہو گئی۔

اس بحث سے یہ بات بالکل واضح ہو جانی چاہئے کہ سوویت یونین کے قیام اور بقا کا تعلق عسکری قوّت سے تھا۔ اشتراکی روس کی عظمت بھی اس کے عسکری طور پر "ناقابلِ تسخیر"

ہونے کے تصور سے قائم تھی اس عسکری قوت کو ہندوکش کے پہاڑوں میں افغان مجاہدین کے ہاتھوں رسوا کروایا گیا اور اس طرح اس کے "ناقابلِ تسخیر" ہونے کا تصوّر بھی پاش پاش ہوا۔ افغانستان میں ناقابلِ برداشت جنگی نقصانات نے اشتراکی معیشت کو دیوالیہ پن کے قریب پہنچایا۔ انہی عسکری نقصانات اور افغان مجاہدین کے ہاتھوں پے درپے شکستوں نے اشتراکی افواج کے مورال کو پست کیا اور پھر وہ "عسکری طاقت" کمزور پڑ گئی جو "مختلف ریاستوں کی یونین" کو قائم رکھے ہوئے تھی ریاستی جبر میں دبی ہوئی اقوام اٹھ کھڑی ہوئیں اور سوویت یونین کے خاتمے کا اعلان ہو گیا۔

دوسری بڑی غلط فہمی کا تعلق افغانستان میں روسیوں کی عسکری ہزیمت کے "خالق و مصوّر" سے ہے۔ ۱۷ اگست ۱۹۸۸ء سے پہلے تک ملکی ذرائع ابلاغ جنرل ضیاء الحق کے "جہادِ افغانستان سے محبّت کے افسانوں" سے بھرے ہوئے تھے۔ جنرل ضیاء الحق نے جو فوج کے سالارِ اعلیٰ ہونے کے ساتھ ساتھ سول اقتدارِ اعلیٰ کے بھی مالک تھے۔ مسئلہ افغانستان کے حل کے لئے جہاد کی ادائیگی اور پاکستان میں اسلامی نظام کے نفاذ کی ذمہ داریوں پر اپنے آپ کو فائز کر لیا ہوا تھا۔ ان دونوں حوالوں سے کسی دوسرے شخص کا نام منظرِعام پر تو آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ حتّٰی کہ جماعت اسلامی جیسی انتہائی منظّم اور مؤثّر جماعت بھی جہادِ افغانستان میں براہِ راست شامل ہونے ،مہاجرین و مجاہدین کی اوّلین معاون و مدد گار ہونے کے باوجود ،اس مسئلے کے حوالے سے پیدا ہونے والے سیاسی منظر پر نمایاں نہیں ہو سکی تھی۔ نظامِ اسلام کے حوالے سے کام کرنے والی جماعتیں بشمول جماعتِ اسلامی، جمعیت العلماء پاکستان، جمعیت العلماء اسلام اور اہل حدیث جماعت بھی سیاسی منظر پر نمایاں نہ ہو سکیں جنرل ضیاء الحق نے دیندار طبقے کو اسلامی نظام کے نفاذ کے متعلق اپنے بیانات اور زکوٰۃ و عشر و حدود آرڈیننس کے نفاذ کے ذریعے اپنا گرویدہ بنا رکھا تھا۔ یہ جنرل ضیاء الحق کی شخصیت کا سحر تھا کہ عام علماء و مشائخ بھی انہیں اپنا ہم خیال تصوّر کرتے رہے جبکہ لادین و سیکولر عناصر اداکار و کھلاڑی بھی انہیں "اپنا ہی آدمی" تصوّر کرتے رہے ضیاء الحق کی جس قدر دوستیاں و رابطے علماؤ دین دار طبقے کے چیدہ چیدہ لوگوں سے تھے اسی طرح کے تعلّقات کھلاڑیوں و فلمی دنیا کے لوگوں سے تھے۔ بابرہ شریف ، بدر منیر اور ملکہ ترنم نور جہاں جیسی شخصیّات بھی ان کے حلقۂ ارادت میں شامل تھیں بین الاقوامی سطح پر بھی ان کا رویّہ ایسا ہی تھا سالم عزّام جیسے عالمی شہرت کے حامل اسلامی سکالروں کے ساتھ ساتھ شترو گھن سنہا جیسے انڈین فلم سٹاروں سے بھی ان کے مضبوط اور گھریلو قسم کے تعلقات تھے۔ نعتِ رسولِ مقبول

صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کی تلاوت سُن کر آبدیدہ ہونے کے ساتھ ساتھ وہ کبھی کبھی اپنے آزاد منش اور ترقّی پسند ہونے کا اعلان بھی کرتے رہتے تھے "میں اتنا بھی کٹر نہیں ہوں" کہہ کر وہ اپنی اس سوچ کا اظہار بھی کر دیتے تھے۔ انفرادی زندگی میں شعائرِ اسلامی کی پابندی اور نجی طور پر اسلام سے وابستگی کے ساتھ ساتھ اپنے اقتدار سے ان کی والہانہ محبّت بھی آخری دم تک قائم رہی ان کی زندگی میں بھی ان کے یہ تضاد رویّے بار بار اپنا اظہار کرتے رہے لیکن کسی کو کھُل کر ان تضادات پر کچھ کہنے یا لکھنے کی جرأت نہ ہو سکی۔ مارشل لاء اور پھر ریاست کی اندھی و بے لگام قوّت کے سامنے بڑے بڑے جغادری دانشوروں اور صحافیوں کے چراغ نہ جل سکے۔ کچھ لوگوں نے اگر کچھ کہا یا لکھا تو اسے پذیرائی نہ مل سکی کیونکہ سرکاری و تجارتی ذرائع ابلاغ پر جنرل ضیاء سرکار کا قبضہ تھا اور ان سے بالا بالا اگر کوئی بات چھپتی بھی تو اثر پذیر نہیں ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جنرل ضیاء الحق کے منظر سے ہٹنے کے بعد ان کی شخصیّت کے ان متضاد پہلوؤں پر بہت کچھ لکھا گیا۔ جنرل ضیاء الحق کی شخصیّت کے گرد بنا ہوا تانا بانا بکھرنے لگا۔ مارشل لاء کے خاتمے اور جنرل ضیاء الحق کی وجیہ شخصیّت کے درمیان سے اٹھنے کے بعد "شخصیّت کے گرد قائم آہنی حصار" ٹوٹ گیا اور پھر ضیاء الحق کی اصل شخصیّت کے خدوخال سامنے آنے لگے۔ پچھلے چار سالوں کے دوران جنرل ضیاء الحق کی "شخصیّت اور کارناموں" کے متعلق جو کچھ لکھا گیا تھا اس سے جنرل ضیاء الحق کی شخصیّت کے ان پہلوؤں پر بھی روشنی پڑتی ہے جو ان کی زندگی میں یا تو نمایاں نہیں تھے یا پھر پوشیدہ تھے۔ اس طرح جنرل ضیاء الحق کی شخصیّت فطری اور بے ساختہ انداز میں اُبھر کر سامنے آ رہی ہے اور ان کی شخصیّت کے گرد "جہادِ افغانستان سے محبّت" اور "نظامِ اسلام کے نفاذ کی تڑپ" کا سنہری و تابناک حصار ختم ہو گیا ہے۔ یہاں جنرل ضیاء الحق کی "نظامِ اسلام کے نفاذ کی تڑپ" سے بحث مطلوب نہیں ہے ویسے بھی "نفاذِ اسلام کا سنہری خواب" تو ان کی زندگی میں ہی پریشان ہو گیا تھا اسلام کے ساتھ ان کا مذاق لوگوں نے ان کی زندگی میں ہی سمجھ لیا تھا۔ شریعت کو حقیقتاً ریاست کا قانونِ اعلیٰ بنانے کے سلسلے میں جو حیلے بہانے جنرل ضیاء الحق دور میں استعمال کئے گئے اس نے لوگوں کے دلوں میں "جنرل ضیاء الحق کے نفاذِ اسلام کے ساتھ اخلاص" کو نہ صرف مشکوک بنا دیا بلکہ عام لوگوں کے دلوں میں نفاذِ اسلام کے لئے قربانیاں دینے کا جذبہ بھی سرد پڑ گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جنرل ضیاء الحق کی زندگی میں ہی "شریعت بل" اور "نفاذِ شریعت کا عمل" نزاعی مسئلہ بن گیا تھا۔ حتّٰی کہ دینی جماعتوں اور علماء کرام نے اس مسئلے پر تحریک چلانے کا اعلان بھی کر دیا تھا۔ جماعت اسلامی جیسی ضیاء الحق کی حمایتی و مددگار

جماعت نے بھی کبھی یہ نہیں کہا تھا کہ ہم جنرل ضیاء الحق کے ساتھ شریعت کے نفاذ کے لئے ہیں " بلکہ انہوں نے ہمیشہ یہی کہا کہ اگر ایک مارشل لاء کو ہٹانے کی کوشش کی گئی تو اس کے نتیجے میں اس سے بھی زیادہ طاقتور مارشل لاء آجائے گا۔ اس لئے جماعتی قیادت جنرل ضیاء کو جمہوریت کی بحالی پر ہی مجبور کرتی رہی۔ دوسری اہم بات جو جنرل ضیاء الحق کے ساتھ منسوب کی جاتی ہے یا جس کے بارے میں جنرل ضیاء الحق خود بڑے فخر سے ذکر کیا کرتے تھے وہ "جہادِ افغانستان " ہے۔ جنرل ضیاء نے اس مسئلے کو اپنے ذاتی اقتدار کے لئے جس طرح استعمال کیا وہ پاکستان کی تاریخ کا ایک " یادگار باب " ہے۔ تاریخی واقعات کا تجزیہ کرتے وقت مؤرخ و تجزیہ نگار کو ذاتی پسند و ناپسند سے بالاتر ہو کر لکھنا چاہئے کیونکہ یہی تحریریں آنے والے وقتوں میں قوموں کی رہنمائی کا فریضہ سرانجام دیتی ہیں ہمارے ہاں تو ابھی تک تقسیمِ ہند کی بے لاگ تاریخ بھی شاید نہیں لکھی گئی کیونکہ قیامِ پاکستان کے بعد پاکستان میں مسلم لیگ یا مسلم لیگی ذہن کے لوگ برسرِ اقتدار آگئے تھے اور ہندوستان میں کانگریسی حکومتوں کا دور شروع ہوا۔ پاکستان میں جمہوری نیم جمہوری یا مارشل لائی جمہورتیوں کا دور دورہ رہا۔ مارشل لائی حکمرانوں نے بھی اپنے اقتدار کو استحکام دینے یا طوالت بخشنے کے ایسے ہی افراد و خاندانوں کا سہارا لیا جو کسی نہ کسی طرح سے شریک اقتدار رہتے آتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے یہاں لکھی جانے والی تاریخ میں قیامِ پاکستان اور مابعد ادوار کے روشن پہلو ہی سامنے نہیں آئے۔ کسی نے ان واقعات کا تجزیہ کرنے کی کوشش نہیں کی جن کے نتیجے میں نظریۂ پاکستان، تحریکِ پاکستان اور پھر قیامِ پاکستان کے مقاصد حاصل نہیں کئے جا سکے۔ پاکستان میں دستور سازی کے سلسلے میں مشکلات ملک کا بار بار جمہوریت کی پٹڑی سے اُتر کر مارشل لاء کے پُرپیچ راستے پر چل نکلنا، پاکستان کا دو ٹکڑوں میں تقسیم ہونا باقی ماندہ پاکستان میں لسانی، گروہی اور فرقہ وارانہ نظریات کا پرورش پانا، ایسے موضوعات پر کچھ بھی نہیں لکھا گیا۔ پچھلی پوری دہائی جنرل ضیاء الحق کی پالیسیوں سے عبارت رہی۔ جنرل ضیاء الحق کا پاکستان عالمی اُفق پر فعال اور متحرک کردار ادا کرتا رہا۔ رواں دہائی میں ان پالیسیوں سے ہٹنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں جس کے نتیجے میں قوم نظری طور پر گروہوں میں بٹ کر باوجود یکسوئی حاصل نہیں کر پا رہی ہے۔

جنرل ضیاء الحق کی "افغان پالیسی" نے ہی رواں صدی کے آخری عشرے (۱۹۸۰ - ۹۰ء) میں عالمی و علاقائی تاریخ کا دھارا موڑا۔ ۱۷ اگست ۱۹۸۸ء میں ۱۳۰۔ کے حادثے کے بعد جنرل ضیاء اپنے رفقاء بشمول جنرل اختر عبدالرحمان منظر سے ہٹے تو مرکز اور

صوبہ سندھ و سرحد میں پیپلز پارٹی کی حکومتیں قائم ہو گئیں اور پھر مسئلہ افغانستان پر ایک زور دار بحث مباحثہ شروع ہو گیا۔ اینٹی پیپلز پارٹی مشینری نے انہیں "شہیدِ افغانستان" کا رتبہ دے کر ایک عالی مرتبے پر بٹھانے کی کوشش کی۔ اسلامی جمہوری اتحاد کی حکومت نے وزیر اعلیٰ پنجاب میاں نواز شریف کی زیر قیادت اسلام آباد میں فیصل مسجد کے پہلو میں دفن جنرل ضیاء الحق کے مرقد کو ایک "مرکز طاقت" کے طور پر نمایاں کیا۔ اور پھر برسی منانے کا سلسلہ چل نکلا۔ ۱۷ راگست۔ اسلام آباد کی فیصل مسجد ایک سیاسی قوّت کے اظہار کا ذریعہ بنی رہی۔ پیپلز پارٹی کی نابالغ قیادت نے بھی کئی ایسے اقدامات اٹھائے جن کے ردِ عمل کے طور پر بھی اینٹی پیپلز پارٹی عناصر متحد ہو گئے لیکن پھر جب "عمل ورد ِعمل" کا سلسلہ کچھ مدھم پڑا اور ۶ راگست ۱۹۹۰ء میں پیپلز پارٹی کی ۲۰ ماہی حکومت ختم ہو گئی تو "پروپیگنڈہ اور جواب پروپیگنڈہ" کی گرد چھٹنے کے بعد حقائق نے آہستہ آہستہ سر اُبھارنا شروع کر دیا۔ اسی دوران مسئلہ افغانستان کے حوالے سے جنرل ضیاء الحق کے ایک اور معتمد جرنیل اور آئی ایس آئی کے چیف جنرل حمید گل نے سیاسی و عسکری منظر پر خاصی جگہ پالی تھی۔ بے نظیر دُور میں آپریشن جلال آباد کی ناکامی کے بعد یہ بات بڑے شدّومد کے ساتھ زیرِ بحث آنا شروع ہو گئی کہ کیا بے نظیر نے مجاہدین کو ہزیمت سے دوچار کروانے کی منصوبہ بندی کی تھی لیکن جب جنرل حمید گل کا نام سامنے آتا تو پھر ایسے خدشات دُم توڑ دیتے کیونکہ "جہادِ افغانستان" "مجاہدینِ افغانستان" اور "جنرل حمید گل" اس طرح لازم و ملزوم کی حیثیّت میں سامنے آ چکے تھے کہ کسی ایسی "مبیّنہ سازش" کی کامیابی کا امکان دکھائی نہیں دیتا تھا۔ پھر اس بات پر بحث شروع ہو گئی کہ جنرل ضیا کی "افغان پالیسی" کیا تھی اس کا اصل خالق اور مصوّر" کون تھا۔ کیونکہ اگر جنرل ضیا کی اپنی کوئی تخلیق کردہ پالیسی تھی تو اس کا حشر نشر تو محمد خان جونیجو حکومت کے جنیوا معاہدے پر دستخط کرنے کی عجلت نے کر دیا تھا۔ دوسری طرف اگر ان کے کوئی عسکری منصوبے تھے تو ان پر جنرل حمید گل نے عمل کرنے کی کوشش کی لیکن ان پر عمل در آمد کرتے یا ان میں ناکامی کے باعث مجاہدین کی سبکی ہوئی۔ اس لئے لوگ یہ جاننا چاہتے تھے کہ جنرل ضیاء الحق کی "افغان پالیسی" کا خالق کون تھا؟ اور وہ حقیقتاً کیا تھی؟؟

جنرل ضیاء الحق کی "ا افغان پالیسی" وہی تھی جس کے نہ صرف خدوحال ۱۹۸۰ء کے بالکل اوائل میں آئی ایس آئی کے ڈائریکٹر جنرل ' جنرل اختر عبد الرحمٰن نے وضع کئے بلکہ اس پالیسی کو ایک عملی اور کار آمد منصوبے کی شکل دے کر بروئے کار لانے کا کام بھی انہوں نے ہی شروع کیا تھا۔ لیکن جنرل ضیا الحق نے اس پالیسی کو قبول اس لئے کیا تھا کیونکہ اس پر عمل در آمد کی

صُورت میں انہیں ''سیاسی مفادات'' حاصل ہونے کی توقع تھی۔ جنرل اختر عبدالرحمان نے نہ صرف ''افغان پالیسی'' مرتّب کی اور اسے ایک قابلِ عمل ''فوجی منصوبے'' کی شکل میں ڈھالا بلکہ روسیوں کو دریائے آمو کے اس پار واپس دھکیلنے کے اس منصوبے کو ایک جیتی جاگتی حقیقت کی شکل بھی دی۔ اس لئے یہ کہنا کہ ''جنرل ضیاالحق نے روسیوں کو افغانستان میں روکنے کا فیصلہ کیا اور جنرل اختر نے اس منصوبے کو عملی شکل دے کر کامیاب بنایا'' بالکل غلط ہے۔ افغانستان میں روسیوں کو عسکری طور پر روکنے اور پھر انہیں واپس دھکیلنے کی افغان پالیسی کے ''مصوّر اور معمار'' کا نام جنرل اختر عبدالرحمان ہے جس نے رواں صدی کی عسکری تاریخ میں ہٹلر کے جنرل رومیل کے بعد پہلی دفعہ ایک عظیم سپر طاقت کو ''خفیہ عسکری سرگرمیوں'' کے ذریعے شکست سے ہمکنار کیا پھر یہی شکست سوویت یونین کو ہی لے ڈوبی۔ جنرل اختر کی اس افغان پالیسی کا محوری نقطہ افغانستان سے روسیوں کی عسکری ہزیمت کے بعد کابل میں افغان مجاہدین کی حکومت کا قیام تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جنرل ضیا الحق بھی افغانستان میں اسلامی حکومت کے قیام کی باتیں کیا کرتے تھے اسی منصوبے کے تحت انہوں نے افغانستان اور پاکستان کی کنفیڈریشن قائم کرنے کی باتیں بھی شروع کر دی تھیں ان کی اقتدار سے محبت کا اس سے بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے اپنے آپ کو اس کنفیڈریشن کا نامزد سربراہ بھی مقرر سمجھنا شروع کر دیا تھا وہ یہ سمجھتے تھے کہ افغان مجاہدین انہیں اپنا سربراہ قبول کر لیں گے اس لئے کہ وہ افغان جہاد کے چمپئن ہیں ان خیالات کا اظہار وہ اپنی نجی محفلوں میں کیا کرتے تھے۔ اس بات کی تصدیق ان کے قریبی اور معتمد صحافی ساتھی جناب ضیاءالاسلام انصاری نے جنرل ضیا الحق پر لکھی جانے والی کتاب ''جنرل ضیاء شخصیّت اور کارنامے'' میں بھی کیا ہے بہرحال جنرل اختر کی تیار کردہ ''افغان پالیسی'' بڑی کامیابی سے اپنی طے شدہ منازل عبور کرتی ہوئی کامیابی سے ہمکنار ہونے کے قریب تھی کہ ۱۹۸۷ء میں اس پالیسی کے خالق و مصوّر کو فل جنرل بنا کر آئی ایس آئی سے الگ کر دیا گیا۔ بظاہر یہ ان کی خدمات کا اعتراف تھا کہ انہیں چیئرمین جوائنٹ چیف آف سٹاف کمیٹی مقرر کر دیا گیا تھا' جو عہدے کے اعتبار سے انتہائی بلند اور باوقار عہدہ تھا لیکن بالحاظ اختیار نمائشی۔ جنرل اختر کو پروموش دیتے ہوئے جنرل ضیاء الحق نے بڑے تاریخی الفاظ بھی کہے' لیکن عملاً انہیں جہادِ افغانستان کی کامیابی کے حتمی مرحلے پر منظر سے ہٹا دیا گیا تھا۔

جنرل ضیاء الحق کا یہ فیصلہ کس قدر درست تھا۔ ؟' آنے والے وقت نے ان کے اس فیصلے پر ''غلط'' کی نہیں۔ بلکہ ''انتہائی غلط'' کی مہر ثبت کر دی۔ جنرل حمید گل اپنی تمام تر

نظری، نمائشی اور مبینہ خوبیوں کے علی الرغم ان صلاحیتوں کا لوہا نہ منوا سکے جو جنرل اختر عبدالرحمان کی پیشہ ورانہ زندگی کا خاصہ تھیں۔

جنرل اختر عبدالرحمان کی شخصیت جہاد کی کامیابی کی ضمانت بن چکی تھی روسیوں کی عسکری ہزیمت کے بعد جنرل کی "افغان پالیسی" کے حتمی مرحلے پر عمل در آمد شروع ہونے والا تھا کہ جنرل حمید گل کو میدان عمل میں اتارا گیا اور پھر جہاد افغانستان کی تاریخ کا وہ المناک باب شروع ہوا جس کے کسی ورق پر بھی "فتح مبین" نہیں لکھا جا سکا اور جہاد افغانستان کا وہ المناک باب ہنوز جاری ہے۔ بطروس غالی کے ایجنٹ بینن سیوان سے لے کر سابق افغان حکمران نجیب اللہ، ایران سرکار، بھارت سرکار اور پاکستان میں افغان مجاہدین سے خدا واسطے کا بیر رکھنے والے آئی ایس آئی کے سابق سربراہ جنرل اسد درّانی اور خارجہ سیکرٹری اکرم ذکی (جن کی بیوی مبیّنہ طور پر ہندو ہے اور ان کے گھر میں اب بھی مورتیاں موجود ہیں) جیسے عناصر اس المناک باب کو اپنے منطقی انجام تک پہنچانے کے لئے کوشاں ہیں اور یہ منطقی انجام افغان مجاہدین کی فتح مبین ہرگز نہیں ہو سکتا ہے۔

اپریل ۱۹۸۹ء میں آپریشن جلال آباد کی ناکامی کے بعد وزیر اعظم بے نظیر بھٹو نے جنرل حمید گل کو اگلے مہینے آئی ایس آئی کی قیادت سے الگ کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی پاکستان کی افغان پالیسی پر عمل در آمد گی کے وہ دروازے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند ہو گئے جو افغان مجاہدین کی طویل جدوجہد آزادی کے سبب کھلے تھے افغانوں کے سرخ خون سے روشن امید و کامیابی کی وہ شمع ٹمٹمانے لگی جسے انہوں نے سرخ آندھی کے دوران بھی پوری آب و تاب کے ساتھ روشن کئے رکھا تھا۔ اشتراکی فوجوں کی واپسی کے بعد امریکیوں کے اہداف بھی بدل چکے تھے۔ اب آئی ایس آئی بھی وہ کامیابی نہیں دکھا سکی تھی جس کی بنیاد پر حکومت پاکستان امریکیوں اور کابل انتظامیہ کے ساتھ معاملات بہتر انداز میں طے کر سکتی۔ مجاہدین کو امریکی فوجی امداد کی بندش اور جلال آباد آپریشن میں ناکامی کے بعد مجاہدین تنہا رہ گئے۔ اس کے بعد دفاعی اور مزاحمتی حکمت عملی اختیار کرنے کی بجائے مجاہدین نے آگے بڑھ کر کابل انتظامیہ میں "نقب لگانے" کی عملی پالیسی اختیار کی۔ افغان وزیر دفاع جنرل تنائی کی بغاوت اسی حکمت عملی کا اظہار تھی۔ ۱۵ر فروری ۱۹۸۹ء میں روسی افواج کے انخلا کے بعد حکمران جماعت کے پرچمی و خلقی دھڑوں کے درمیان اختلافات کھل کر سامنے آنے لگے۔ فوج میں موجود بہت سے خلقی افسروں پر "مجاہدین کے ایجنٹ" ہونے کا الزام لگایا گیا بہت سے گرفتار بھی ہوئے۔ حتیٰ کہ وزیر دفاع جنرل شاہ نواز تنائی کو نظر بند بھی کر دیا گیا۔ دسمبر ۱۹۸۹ء میں بے شمار ایسے فوجی افسروں کو بھی

گرفتار کر لیا گیا جن پر حکمت یار کے حامی ہونے کا الزام تھا۔ نجیب اللہ کا تعلق پرچم دھڑے سے تھا اور وہ خلقیوں کو دبانے کی پالیسی پر عمل پیرا رہا تھا جنرل تنائی کا تعلق خلقیوں کے اس دھڑے سے تھا جس کی سربراہی گلاب زئی کر رہا تھا۔ دسمبر ۸۹ء میں جنرل تنائی اور ایئر چیف ولی شاہ کی قیادت میں نجیب اللہ کے خلاف بغاوت کی صورت پیدا ہو گئی کابل انتظامیہ نے اس سازش کو کامیاب ہونے سے پہلے ہی بے نقاب کر کے کچل دیا۔ جنرل ولی شاہ (ایئر ڈیفنس) جنرل عالم جان کمیونیکیشن، جنرل امام الدین چیف آف ۵۲ویں رجمنٹ، بریگیڈیئر محمد اعظم (ایئر فورس)، چیف آف سٹاف بریگیڈیئر عمر، پائلٹ افیسر اور دیگر اعلیٰ سرکاری افسروں کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس طرح نجیب اللہ کا اقتدار وقتی طور پر بچ گیا لیکن خلقیوں نے بھی ہار نہیں مانی بلکہ ایک نئے منصوبے پر عمل شروع ہوا۔ خوست میں تنائی قبیلہ آباد ہے۔ خوست چھاؤنی میں تعینات افغان فوج بھی جنرل تنائی کی حامی تھی۔ جلال الدین حقانی کے طویل محاصرہ خوست میں تنائی کا رابطہ جلال الدین حقانی سے ہوا۔ پھر اسے گلبدین حکمت یار تک رسائی حاصل ہوئی اور خلقیوں کا نیا منصوبہ آگے بڑھا۔ پہلے پرچم پارٹی نے داؤد کے ساتھ مل کر ظاہر شاہ کی حکومت کا تختہ الٹا تھا پھر ۱۹۷۸ء میں خلقیوں نے داؤد کے خلاف خونی انقلاب برپا کیا اس بغاوت کو کامیاب بنانے میں افغان فوج کے جنرل عبدالقادر نے انتہائی اہم کردار ادا کیا تھا۔ یہی جنرل نجیب اللہ کی حکومت کا تختہ الٹنے میں جنرل تنائی کا مرکزی ساتھی تھا جو بغاوت کی ناکامی کے بعد پاکستان آ گیا تھا۔

مارچ ۱۹۸۹ء میں عبوری حکومت کا قیام بھی بڑے دلچسپ انداز میں ہوا تھا۔ ۱۵ر فروری ۱۹۸۹ء میں روسی افواج کے مکمل انخلا کے بعد پیدا ہونے والے خلا کو پر کرنے اور افغانستان میں مجاہدین کی حکومت کے قیام کے لئے افغان مجاہدین کی ۴۴۰ رکنی شوریٰ کا ایک اجلاس طلب کیا گیا۔ یہ اجلاس مدینۃ الحجاج اسلامی آباد میں ۱۰ر فروری سے لے کر ۲۴ر فروری تک جاری رہا۔ ایران میں مقیم شیعہ گروپوں نے نشستوں کی تقسیم پر اعتراض کیا اور بائیکاٹ کر کے واپس چلے گئے۔ مجاہدین کا کہنا تھا کہ ایران میں جتنی نمائندگی سنی مسلمانوں کی آبادی کی بنیاد پر دی گئی ہے اسی فارمولے کے مطابق افغانستان میں بسنے والے شیعہ حضرات کو بھی نمائندگی دی جا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ دیگر تنظیموں کے اختلافات بھی کھل کر سامنے آنے لگے۔ ۲۱ر فروری کو جب کچھ مجاہدین گروپوں نے شوریٰ کے اجلاس کا بائیکاٹ کیا تو حالات اور بھی نازک ہو گئے افغانوں کا روایتی قبائلی انداز فکر غالب آنے لگا تھا۔ اس دوران مولانا جلال الدین حقانی نے اپنے خصوصی خطاب میں شرکا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "ہم نے روس کو شکست دی ہے لیکن اس کا طفیلی نجیب اللہ ابھی باقی ہے۔ افغانستان آزاد ہونا ہے اور ہمیں وہاں

اسلامی مملکت کی بنیادیں بھی رکھنی ہیں۔ اگر ہم اس مرحلے پر اتحاد قائم نہ کر سکے تو شہیدوں کے خون کا حساب ہمیں ہی خداوند تعالیٰ کے حضور پیش کرنا ہوگا افغانستان سے آئے ہوئے کمانڈروں اور علماء کرام نے مولانا جلال الدین کے موقف کی تائید کی اور انہیں ثالث مقرر کیا۔ مولانا نے ہر جماعت کے سربراہ سے دو دو افراد نامزد کروائے اور پھر سربراہوں سے قرآن پر حلف لیا کہ وہ ۱۴ رکنی مصالحتی مشن کے فیصلے کو تسلیم کریں گے۔ ۲۳ فروری کو مصالحتی مشن نے مولانا کی قیادت میں مصالحتی شوریٰ کا اجلاس منعقد کیا اور اس میں طے پایا کہ "۴۴۰ رکنی شوریٰ کے ہر رکن کو دو دو مختلف امیدواروں کو ووٹ ڈالنے کا اختیار دیا گیا اور ساتوں جماعتوں کے سربراہوں کو پابند کیا گیا کہ وہ انتخابات میں حصہ لیں اور متعلقہ لیڈروں کو پڑنے والے ووٹوں کے تناسب سے مجوزہ افغان عبوری حکومت میں مختلف عہدوں اور وزارتوں کی تقسیم کی جائے گی۔ اس معاہدہ میں یہ مطالبہ بھی شامل تھا کہ سربراہان بذات خود وزارت قبول کریں گے تاکہ ایک مضبوط اور مستحکم حکومت کی تشکیل ہو سکے"۔ اسی دن مولانا نے شوریٰ کا اجلاس طلب کیا اور مصالحتی کمیشن کے اس فیصلے کا اعلان کیا۔ مولانا نے الیکشن کمشنر کے فرائض سرانجام دیئے تمام اراکین نے ایک بجے دوپہر یا ۵ بجے شام ان انتخابات میں حصہ لیا۔ بیلٹ پیپر تقسیم ہوئے اور خفیہ رائے شماری کے ذریعے انتخابات مکمل ہوئے۔ جن کے نتائج کے مطابق مندرجہ ذیل کابینہ تشکیل پائی۔

نام سربراہ	جماعت	حاصل کردہ ووٹ	عہدہ وزارت
۱۔ پروفیسر صبغت اللہ مجددی	جبہ نجات ملی	۱۷۴	صدر
۲۔ پروفیسر عبدالرب رسول سیاف	اتحاد اسلامی	۱۷۳	وزیر اعظم
۳۔ محمد نبی محمدی	حرکت انقلاب اسلامی	۱۳۶	وزیر دفاع
۴۔ انجینئر گلبدین حکمت یار	حزب اسلامی (حکمت یار)	۱۲۶	وزیر خارجہ
۵۔ مولوی محمد یونس خالص	حزب اسلامی (خالص گروپ)	۱۰۲	وزیر داخلہ
۶۔ پروفیسر برہان الدین ربانی	جمعیت اسلامی	۹۹	وزیر تعمیر نو

۷۔ پیر سید آفندی گیلانی   محاذ ملی   ۸۶   چیف جسٹس

اس کے علاوہ تیرہ اور وزارتوں کو بھی اسی طے شدہ فارمولے کے مطابق تقسیم کیا گیا جب کہ کچھ وزارتیں ایرانی جماعتوں کے لئے خالی چھوڑ دی گئیں۔

اس عبوری حکومت کی تشکیل میں بھی کچھ لیڈروں کو اعتراض تھا لیکن کیونکہ وہ حلف اٹھا چکے تھے اس لئے اس سے پھرنا ممکن نہیں تھا۔ اس عبوری حکومت کے ذمے افغانستان میں انتخابات اور منتخب حکومت کے قیام کے ذریعے 'انتقال اقتدار کا کام لگایا گیا تھا۔ اس مقصد کے لئے ایک ٹائم ٹیبل بھی طے کیا گیا۔ اس عبوری حکومت کے قیام کے وقت انجینئر گلبدین حکمت یار اور پیر سید احمد گیلانی نے خوش دلی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ پیر آفندی کے مجاہدوں نے بذات خود ہی جلال آباد پر یلغار کی اور ان کے کمانڈر ثمر خیل تک جا پہنچے۔ تو پھر دیگر جماعتوں نے بھی دیکھا دیکھی "چلتی ٹرین کا مسافر" بن کر فتح جلال آباد میں شرکت کی کوشش کی لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے اور "سولو فلائٹ" کا تجربہ ناکام ہو گیا۔ اس کے بعد عبوری حکومت کے صدر پیر صبغت اللہ مجددی نے شمالی افغانستان کا دورہ شروع کر دیا اور جمعیت اسلامی کے کمانڈر احمد شاہ مسعود کو اعتماد میں لیا صبغت اللہ مجددی کے اس دورے کے بارے میں عبوری حکومت کے ذرائع نے کہا کہ "نجیب انتظامیہ کے خلاف شمالی افغانستان میں کاروائیاں تیز کرنے اور مجاہدین کمانڈروں سے صلاح و مشورہ کے لئے صدر صاحب نے اس دورے کا پروگرام بنایا ہے" جبکہ دیگر حلقوں کے مطابق صبغت اللہ مجددی نے گلبدین کے خلاف احمد شاہ مسعود اور ان کی شوریٰ نظام کا تعاون حاصل کرنے کے لئے 'یہ دورہ ترتیب دیا گیا تھا۔ یہ بات اس لحاظ سے بھی قابل فہم ہے کہ احمد شاہ مسعود حزب اسلامی (حکمت یار) کے سخت مخالفین میں شمار ہوتے ہیں اور صبغت اللہ مجددی کے بھی حکمت یار سے اچھے روابط نہیں ہیں اس بات کا اظہار افغانستان کی عبوری حکومت (قائم کردہ مئی ۱۹۹۲ء) کے قیام کے بعد صبغت اللہ مجددی کی پہلی پریس کانفرنس سے بھی ہوتا ہے جس میں انہوں نے حکمت یار کو وارننگ دی۔ بحر حال ان حالات میں گلبدین حکمت یار نے فتح کابل کا ایک قابل عمل منصوبہ ترتیب دیا جس کا مرکزی کردار جنرل تنائی تھا۔ جنرل تنائی اس سے پہلے صوبہ پروان میں حزب اسلامی کے کمانڈر استاد فرید سے رابطہ قائم کر چکا تھا اور سلسلہ جنبانی شروع تھی۔ مجاہدین کے ساتھ ملنے کے لئے تنائی نے کچھ شرائط پیش کیں۔ اس کی اور اس کے دیگر ساتھیوں کے جان و مال کے تحفظ کی ضمانت اور فتح کے بعد اقتدار میں شمولیت/ حصہ داری جیسے معاملات زیر بحث آئے۔ حزب اسلامی کے ذرائع کا کہنا ہے کہ شرکت اقتدار کے مطالبے کو یکسر مسترد کر دیا گیا تھا جبکہ جان و مال کے تحفظ کی ضمانت کے بارے میں اسے

بتادیا گیا کہ عبوری حکومت عام معافی کا اعلان تو پہلے ہی کر چکی ہے۔ اس کے مطابق تنائی اور اس کے ساتھی بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں"۔ اس منصوبے کے بارے میں حزب اسلامی کا کہنا ہے کہ "فروری ۱۹۸۹ء میں بننے والی افغان عبوری حکومت اپنے طے شدہ اہداف حاصل کرنے میں ناکام ہو چکی ہے اور اس نے نجیب اللہ کو ہٹانے کی منصوبہ بندی بھی نہیں کی اور نہ ہی انتخابات کا انعقاد کر کے انتقال اقتدار کی سبیل پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس لئے حکمت یار نے خود کابل پر حملہ کرنے کی منصوبہ بندی کرنی شروع کر دی ہے۔

اسی دوران دوسری طرف کئی کمانڈر نجیب حکومت سے رابطہ قائم کر چکے تھے یا ایسا کرنے کے بارے میں سنجیدگی سے سوچ رہے تھے۔ پشاور میں مقیم تنظیمات کے رہنما، مختلف ذرائع سے ملنے والی امداد بجائے میدان جہاد تک پہنچانے کے یہیں دفاتر و گاڑیوں کے پٹرول پر خرچ کر رہے تھے۔ اس دور میں مجاہدین تک نہ تو روٹی پہنچی اور نہ ہی انہیں گولہ بارود مل سکا۔ مہاجرین کی حالت بھی کچھ زیادہ اچھی نہیں۔ تھی گلبدین حکمت یار کے خلاف پروپیگنڈہ بھی شروع ہو چکا تھا۔ شوریٰ کے ممبران اور فیلڈ کمانڈر گلبدین پر دباؤ ڈال رہے تھے کہ عبوری حکومت میں دوبارہ شمولیت اختیار کر لی جائے حکمت یار نے معاملات کو ایک نہج پر چلانے کے لئے اپنے ساتھیوں سے مہلت مانگی اور اسی مہلت کے دوران جنرل تنائی سے حتمی بات چیت کو آگے بڑھایا۔ گو دسمبر ۱۹۸۹ء میں افغان فوج کے بہت سے ایسے فوجی گرفتار کئے جا چکے تھے جو گلبدین کے حامی تھے لیکن اس کے باوجود گلبدین کو فوجی بغاوت کی کامیابی کا یقین تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ مسئلہ افغانستان کا اب یہی ایک حل ہے کہ فوج نجیب اللہ کا تختہ الٹ کر اقتدار مجاہدین کے حوالے کر دے۔ گلبدین کا خیال تھا کہ بغاوت ہوتے ہی دیگر افغان تنظیمیں بھی باغی فوج سے مل کر نجیب اللہ کا خاتمہ کرنے کے لئے متحد ہو جائیں گی۔ بغاوت ہوتے ہی جنرل تنائی اور حکمت یار نے انقلابی کونسل بنانے کا اعلان کیا تا کہ کامیابی کی صورت میں وہ نجیب اللہ کی جگہ لے سکے لیکن عبوری حکومت نے اس سارے مسئلے کو نجیب تنائی تنازعہ سمجھا اور پرانے پرچمی و خلقی تنازعے کے پس منظر میں دیکھا۔ عبوری حکومت کے ذرائع نے تنائی کو کٹر کمیونسٹ اور گیارہ سالوں سے افغانوں کا خون بہانے کا مجرم قرار دیا۔ عام معافی کے حوالے سے عبوری حکومت کے ذرائع نے کہا کہ عام معافی اسی صورت میں دی جا سکتی ہے جب وہ توبہ کرے اور مجاہدین کے سامنے ہتھیار

ڈال دے۔ بہت سے فیلڈ کمانڈروں کی رائے تھی کہ ہمیں پرچمی وخلقی تنازعے سے فائدہ اٹھانا چاہئے تھا لیکن عبوری حکومت نے حکمت یار کی مخالفت میں اس موقع سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ جنرل تنائی کی بغاوت ناکام ہو گئی اور نجیب اللہ زیادہ طاقتور حکمران کے طور پر ابھرا۔ مجاہدین کے عسکری رعب ودبدبے میں کمی آئی۔ عبوری حکومت کے انتشار اور عدم تعاون کی وجہ سے جنرل تنائی ' حکمت یار فارمولا طے شدہ نتائج مرتب نہ کر سکا۔ اس بغاوت میں روسی فضائیہ اور بعض اطلاعات کے مطابق امریکی انٹیلی جینس ایجنٹوں نے بھی نجیب اللہ کی مدد کی۔ فیلڈ کمانڈر باغی فوجیوں کے ساتھ مل کر نجیب حکومت کے خلاف لڑنے کی بجائے ان سے ہتھیار ڈالنے کا مطالبہ کرتے رہے۔ اس کے علاوہ باغی گروپوں کے رابطے اور منصوبہ بندی کے فقدان نے بھی بغاوت کو ناکام بنایا۔ سب سے اہم مجاہدین کے پاس اسلحے کی کمی بھی تھی اور کسی موثر منصوبہ بندی کی عدم موجودگی نے بھی اس بغاوت کو ناکام بنادیا اور مجاہدین فاتحانہ کابل میں داخل نہ ہو سکے۔ مسئلہ افغانستان کے فوجی حل کے نظریئے کو ایک اور ضرب لگی۔ مجاہدین کی عسکری قوت کے بارے میں موجود عمومی تاثر بری طرح مجروح ہوا اور جگ ہنسائی کا باعث بنا۔ لیکن اس بغاوت نے پرچمی و خلقی فوجیوں کے ذہنوں میں یہ تاثر پیدا کیا کہ مجاہدین کے ساتھ مل کر معاملات طے ہو سکتے ہیں۔ اس سے پہلے نجیب اللہ اور اس کے گماشتوں نے یہی تاثر دے رکھا تھا کہ مجاہدین اپنے ساتھ آ ملنے والے فوجیوں کو قتل کر دیتے ہیں۔ اس بغاوت سے ظاہر شاہ کی آمد کا راستہ بھی کسی حد تک رک گیا اور معاملات مستقبل میں اندرون افغانستان ہی طے ہونے کی امید پیدا ہو گئی۔ اس کاوش کے نتیجے میں گلبدین حکمت یار کے قد کاٹھ میں اضافہ ہوا لیکن یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ مجاہدین کے حقیقی اتحاد کے بغیر کوئی بھی مہم جوئی کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکتی ہے۔

بعض دیگر مجاہدین حلقوں کا کہنا ہے کہ اس مہم جوئی میں گلبدین حکمت یار جنرل تنائی کے بچھائے ہوئے جال میں پھنسے کیونکہ تنائی نے گلبدین کے ساتھ اس وقت رابطہ قائم کیا جب بغاوت ناکامی کے حتمی مراحل میں داخل ہو چکی تھی۔ فوج وزارت دفاع اور فضائیہ میں جنرل تنائی کے ساتھ شامل اہلکاروں کے متعلق نجیب اللہ انتظامیہ کو پتہ چل چکا تھا۔ یہ بات جنرل تنائی کو بھی معلوم تھی کہ حکومت "کریک ڈاؤن" کرنے والی ہے اس لئے جنرل تنائی نے گلبدین سے رابطہ

قائم کیا لیکن انہیں درست صورتحال نہیں بتائی کہ "حکومت کو اس سازش کی بھنک پڑ چکی ہے اور وہ سازیشوں پر حتمی وار کرنے والی ہے"۔ یہی وجہ ہے کہ حکمت یار نے تنائی کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا۔ حتیٰ کہ بغاوت میں کامیابی کی صورت میں جنرل نجیب اللہ کے ہٹائے جانے کے بعد انتقال اقتدار کا معاملہ بھی طے کر لیا گیا۔ ایک عبوری حکومت اور اس میں شامل افراد کے ناموں پر اتفاق رائے بھی ہو گیا تھا۔ اس وقت کی افغان مجاہدین کی عبوری حکومت نے گلبدین کا یہ فارمولا اس لئے مسترد کر دیا تھا کہ اس میں کمیونسٹ بھی شامل تھے۔ جنرل تنائی کو سب سے بڑا کمیونسٹ کہا جاتا تھا اور اسے افغان عوام کا قاتل بھی گردانا۔ جاتا۔ بحر حال حکمت یار نے جنرل تنائی کا ساتھ دیا لیکن مواصلات کے نظام میں رکاوٹوں کے باعث مختلف باغی یونٹوں کو "ایکشن سگنل" نہ مل سکا۔ دوسری طرف افغان فضائیہ کے باغی اہلکاروں کو پہلے ہی گرفتار کر لیا گیا جس کی وجہ سے باغیوں کو "فضائی چھاتہ" بھی میسر نہ آسکا وگرنہ گلبدین کے دستے باغیوں کے ساتھ مل کر کابل پر قبضہ کرنے کے لئے چاک وچوبند اور مستعد کھڑے تھے۔ مجموعی طور پر یہ ایک موثر لیکن ناکام بغاوت تھی جس کی کامیابی کی صورت میں مجاہدین (خواہ گلبدین کے ہی ہوتے) فاتحانہ شان سے نجیب کو ہٹا کر عسکری شکست دے کر کابل میں داخل ہوتے۔ اس کاوش کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ اس میں مغربی دنیا اور اقوام متحدہ کے نمائندوں کا کوئی کردار نہیں تھا۔ نجیب اللہ کو بزور ہٹا کر مجاہدین کی حکومت قائم کرنے کی ایک خالص داخلی کوشش تھی جو موثر منصوبہ بندی کی عدم موجودگی کے سبب ناکام ہو گئی۔ اس وقت کی افغان عبوری حکومت نے بھی گلبدین حکمت یار کے فارمولے کو پسند نہیں کیا تھا۔ بقول صبغت اللہ مجددی "کمیونسٹوں کو معاف کرنا یا ان کے ساتھ مل کر حکومت بنانا بالکل غیر فطری ہے" اس لئے اس کی حمایت نہیں کی گئی تھی۔ کچھ افغان رہنماؤں کا خیال ہے کہ انہوں نے ۱۹۸۹ء میں بھی صبغت اللہ مجددی پر اعتماد کر کے دھوکہ کھایا تھا کیونکہ مجددی صاحب نے طے شدہ اہداف کے حصول کے لئے نہ تو کوئی کوشش کی اور نہ ہی اس کے لئے منصوبہ بندی کی اور اب ۱۹۹۲ء میں مجددی صاحب انتقال اقتدار کے لئے سنجیدہ کوششیں نہیں کریں گے۔ ۱۹۸۹ء میں انہوں نے سادہ لوحی میں مجددی صاحب پر اعتماد کر لیا تھا جبکہ ۱۹۹۲ء میں ان پر اعتماد ڈپلومیسی اور سیاسی حکمت عملی کے حوالے سے ہے۔

مولوی محمد یونس خالص کا شمار ایسے افغان مجاہد رہنماؤں میں ہوتا ہے۔ جو اپنی سادہ دلی اور بے باکی کی وجہ سے خالص افغان قبائلی جنگجو رہنما کے طور پر معروف ہیں۔ ۱۹۸۹ء میں صبغت اللہ مجددی کے افغان عبوری حکومت کے صدر منتخب ہونے پر بھی انہوں نے صاد نہیں کیا تھا کیونکہ ان کے نزدیک مجددی صاحب کا اپنی خاندانی اور ذاتی شرافت اور وقار کے علی الرغم جہاد افغانستان میں کوئی حصہ نہیں تھا۔ لیکن عبوری حکومت کے قیام کے مولانا جلال الدین حقانی فارمولے کے تحت صبغت اللہ مجددی کو حیران کن حد تک ووٹ کیوں زیادہ مل گئے عام قاری یہ سوچ سکتا ہے کہ شاید اتحاد ہفت گانہ میں شامل جماعتوں میں سب سے زیادہ پاپولر مجددی صاحب ہی ہوں اور گلبدین وغیرہ کو یہ جماعتیں اس قدر زیادہ پسند نہ کرتی ہوں لیکن یہ سوچ مبنی بر حقیقت نہیں ہے۔ بات دراصل یہ ہوئی کہ جلال الدین حقانی فارمولے کی روح کے برعکس محمد نبی محمدی (حرکت انقلاب اسلامی) پیر سید آفندی گیلانی (محاذ ملی) اور صبغت اللہ (جبہ نجات ملی) نے خفیہ گٹھ جوڑ کیا یا یوں کہئے کہ انتخابی اتحاد (ELECTION ALLIANCE) کیا جس کے تحت آفندی اور نبی محمدی کے نمائندوں کے ووٹ بھی صبغت اللہ مجددی کو مل گئے۔ اس طرح صبغت اللہ مجددی تین جماعتوں کے ووٹ حاصل کر کے عبوری حکومت کے صدر منتخب ہو گئے جبکہ باقی چار پروفیسر عبدالرب رسول سیاف (اتحاد اسلامی) انجینئر گلبدین حکمت یار (حزب اسلامی)' مولوی محمد یونس خالص (حزب اسلامی اور پروفیسر برہان الدین ربانی (جمعیت اسلامی) کے ووٹ آپس میں ہی اس طرح تقسیم ہو گئے کہ سیاف دوسرے نمبر پر حکمت یار چوتھے اور ربانی چھٹے نمبر پر آئے اور اسی حوالے سے انہیں عبوری حکومت میں وزارتیں مل گئیں۔ اس عبوری حکومت کے قیام سے ایک تاثر یہ بھی ابھرا کہ افغان مجاہدین میں بھی "بنیاد پرستوں" کو سند قبولیت حاصل نہیں ہے بلکہ ماڈریٹس (MODERATES) یا اعتدال پسند ہی مستقبل میں افغانستان کے حکمران ہوں گے صبغت اللہ مجددی کے اس طرح صدر منتخب ہونے کو اس بات کے بین ثبوت کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ صبغت اللہ مجددی نے روسیوں کے خلاف جہاد کے دوران بھی ایسا موقف اپنائے رکھا جس سے ان کے "بنیاد پرست" ہونے کی نفی ہوتی رہی مغرب نے "بنیاد پرست" (FUNDAMENTALIST) اور بنیاد پرستی (FUNDAMENTALISM) (کو ایک

"گناہ کبیرہ" اور "اچھوت قسم کے مرض" کے طور پر اس طرح معروف کر دیا ہے کہ پڑھے لکھے سمجھ دار اور اصولاً بنیاد پرست مسلمان بھی اپنے آپ کو بنیاد پرست کہلوانا پسند نہیں کرتے حالانکہ ایک عام بے عمل اور گنہگار شخص بھی پانچ بنیادی ارکان اسلام کو مانے بغیر مسلمان ہونے کا تصور بھی نہیں رکھتا۔ اللہ اور اس کے رسول محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان اور ان کے احکامات پر عمل پیرا ہونے کا اقرار ہی وہ بنیادی واولین دروازہ ہے جس کے ذریعے کوئی شخص دائرہ اسلام میں داخل ہو سکتا ہے۔ اس لحاظ سے ہر مسلمان بنیاد پرست (FUNDAMENTALIST) ہے ہر مسلمان اسلام کی بنیادوں کو ضرور مانتا ہے اسی طرح کسی عیسائی کے لئے تثلیث (TRINITY) "صلیب" CRUCIFICATION اور اس طرح کے کئی دیگر عقائد پر ایمان لانا ضروری ہے۔ اس لئے ہر عیسائی بھی بنیاد پرست ہوا۔ غرض دنیا کے کسی بھی مذہب یا نظریئے کا پیرو کار اپنے کچھ نہ کچھ بنیادی عقائد کا اقرار اور ان پر اصرار ضرور کرتا ہے۔ اس طرح ہر شخص کسی نہ کسی اعتبار سے بنیاد پرست ہے۔ کیا رونالڈ ریگن نے پوپ جان پال کے ساتھ مل کر اشتراکیت کے خلاف جس منصوبے کا آغاز کیا تھا وہ عیسوی بنیاد پرستی (CHRISTIAN FUNDAMENTALISM) کا مظہر نہیں تھا؟ کیا جارج بش نے عراق کے خلاف اعلان جنگ کرتے ہوئے جو تقریر کی تھی وہ اس کی عیسوی بنیاد پرستی (FUNDAMENTALISM) نہیں .... کیا عربوں کے خلاف اسرائیلیوں کے خلاف مسلسل اعلان جنگ یہودی بنیاد پرستی نہیں ہے۔ اگر یہ سب کچھ ہے تو پھر تمام افغانوں کا اشتراکی افواج اور ان کے گماشتوں کے خلاف "اعلان جنگ" بھی بنیاد پرستی تھا۔ اشتراکیوں اور ان کے نامزد کردہ حکمرانوں کی حاکمیت کے خلاف افغان مجاہدین کا طویل جہاد بھی بنیاد پرستی ہے اس میں ہمیں یا افغانوں کو شرمانے کی ضرورت نہیں ہے گلبدین حکمت یار اپنے اس موقف کا اعلان بار بار کرتا رہا ہے اس لئے اس پر بنیاد پرست کی پھبتی کس کر عام لوگوں کی نظروں میں اسے "متشدد" اور "ہٹ دھرم" ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مجددی صاحب افغان عوام کے حقیقی موقف کے برعکس اعلانیہ طور پر "ماڈریٹ" ہیں انہیں "ظاہر شاہ" کی واپسی بھی قبول ہے حالانکہ اس کے چالیس سالہ دور حکومت (۱۹۳۳ء ۱۹۷۳ء) میں افغانوں کے

ساتھ جو کچھ ہوتا رہا وہ افغان تاریخ کا ایک شرمناک باب ہے مجددی صاحب نجیب اللہ کو عام معافی دینے کے لئے بھی تیار ہیں کیونکہ انہیں نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے فتح مکہ کے وقت عفو و درگزر کی پالیسی پسند ہے لیکن مجددی صاحب کیونکہ اپنے آپ کو "ماڈریٹ" کہلوانا پسند کرتے ہیں اس لئے انہیں افغانستان کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے بے شمار یتیم' بیواؤں اور مجروح و معذور ہم وطنوں کی آہوں اور سسکیوں سے غرض نہیں ہے۔ کابل کے قیصر صدارت میں برا جمان ہونے کے بعد انہیں اس بات کا شاید قطعاً احساس نہیں رہا کہ پندرہ لاکھ افغان شہداء کے خون اور ۳۵ لاکھ مہاجروں کی تکالیف اور مصائب کا بھی کوئی ذمہ دار ہے جسے سزا دے کر کیفر کردار تک پہنچانا ان کی اولین ذمہ داری ہے۔ افغانوں کو طویل مصائب میں مبتلا کرنے والے اور اشتراکی فوجیوں کے ساتھی بن کر افغانوں کے خون سے ہولی کھیلنے والوں سے حساب چکانے میں بھی انہیں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ افغانوں کا خون ابھی بہنا بند نہیں ہوا کہ انہوں نے نجیب اللہ کو معافی دینے اور ظاہر شاہ کو واپس بلانے پر بھی آمادگی ظاہر کر دی ہے۔ حتیٰ کہ گلبدین حکمت یار کے خلاف ایران' پاکستان اور دیگر ممالک سے امداد حاصل کرنے کا اعلان بھی کر دیا ہے۔ مجددی صاحب کی "آزاد روی" اور "مغرب پرستی" کا ایک اور اہم شاہکار جلیل شمسی کی بطور نائب وزیر خارجہ تقرری ہے۔ یہ صاحب عرصہ طویل سے جنیوا میں رہتے رہے ہیں۔ جب روسی افواج اور ان کے افغان گماشتے ان کے ہم قوم اور مذہب بھائیوں پر ظلم کے پہاڑ توڑ رہے تھے تو یہ صاحب سوئٹزرلینڈ کی پرسکون فضاؤں میں داد عیش دیتے رہے۔ پھر جب مجاہدین کی قربانیوں کے صلے میں افغانستان آزاد ہوا اور یہاں افغانوں کی اپنی حکومت قائم ہونے کی سبیل پیدا ہوئی تو ظاہر شاہ اور جلیل شمسی جیسے عیش پرست اور بزدلی کا مظاہرہ کرنے والے نام نہاد افغان اقتدار میں حصہ طلب کرنے لگے ہیں مجددی صاحب کیونکہ "بنیاد پرست" ہونے کے باوجود بنیاد پرست کہلوانا پسند نہیں کرتے اس لئے ایسے افراد کو عبوری کونسل میں شامل کر کے یا شمولیت کا عندیہ دے کر "ماڈریٹ" یا "اعتدال پسند" ہونے کا عملی ثبوت فراہم کر رہے ہیں۔ افغان عبوری کونسل کے نامزد پروفیسر برہان الدین ربانی 'اور پروفیسر عبدالرب رسول سیاف کو بھی کابل میں غیر مسلح ہو کر داخلے کی اجازت دی گئی حالانکہ اس وقت کابل شہر میں ہی کمیونسٹ جنرل عبدالرشید

دوستم کی ۱۸ہزار افراد پر مشتمل ملیشیا' ربانی کے کمانڈر احمد شاہ مسعود کے ۹ہزار مجاہدوں کے علاوہ جلال الدین حقانی کے ۴ہزار اور چھ ہزار شیعہ مجاہدین بھی کابل میں موجود ہیں لیکن ربانی و سیاف کو کابل میں غیر مسلح حالت میں داخلے کا کہہ کر مجددی صاحب اپنے اعتدال پسند ہونے کا ثبوت فراہم کر رہے ہیں کابل شہر کو کشت و خون سے بچانے کے لئے قائم کی جانے والی گیارہ رکنی کونسل میں شامل افراد کے بارے میں جان کر یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ جیسے اب تک حکومت کمیونسٹوں کی ہے اور کچھ اعتدال پسند مجاہدین اس میں تبرک کے طور پر شامل ہیں۔ اس گیارہ رکنی انتظامی کونسل یا کمیٹی میں کمیونسٹ ملیشیا کے چھ جنرل اور پرچم پارٹی کے دو لیڈر (جن میں ببرک کارمل کے دو صاحبزادے بھی شامل ہیں) پروفیسر سیاف' یونس خالص اور نبی محمدی گروپ کے ایک ایک فرد کو بھی شامل کر لیا گیا ہے۔ گویا اصل انتظام دوستم ملیشیا اور پرچم پارٹی کے افراد کے ہاتھوں میں ہی رہے گا جبکہ چند ایک مجاہدوں کے نمائندے بنیاد پرستوں کا منہ بند کرنے کے لئے بھی شامل انتظام کر لئے گئے ہیں گویا پہلے جو کام نجیب اللہ کی زیر قیادت کیا جاتا تھا اب ویسا ہی سب کچھ صبغت اللہ مجددی کی زیر نگرانی کیا جانے لگا ہے۔ مولوی محمد یونس خالص جیسے بے باک اور بے ساختہ " OUT-SPOKEN " رہنما جنہوں نے ۱۹۸۹ء میں مجددی صاحب کے عبوری حکومت کے صدر منتخب ہونے پر زیادہ خوش دلی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا' ۱۹۹۲ء میں مجددی صاحب کی زیر قیادت بننے والی عبوری کونسل میں شمولیت کا فیصلہ کر کے بہت سے لوگوں کو حیران کر دیا ہے کہ ایک نجی محفل میں ایک پاکستانی فوجی اہلکار سے گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے کہا "۱۹۸۹ء میں میرا فیصلہ مبنی بر حقیقت ضرور تھا لیکن اس میں سادگی تھی جبکہ اب (یعنی ۱۹۹۲ء میں) میں نے سیاسی انداز فکر کے تحت مجددی کی سربراہی قبول کی ہے۔ "

پچاس لاکھ افراد کی اپنے وطن سے ہجرت ۲۰لاکھ شہدا کا خون اور لاتعداد مجروحوں کی آہیں اور سسکیاں کیا ایسے ہی انجام کے لئے ہیں کیا؟ ۲۰لاکھ شہدا کے خون کے ذمہ داران کو قیام امن کے نام پر یونہی چھوڑ دیا جانا چاہئے۔ ۲۷ر دسمبر ۱۹۷۹ء سے لے کر ۱۵ر فروری ۱۹۸۹ء تک روسی افواج کے ساتھ مل کر افغان مسلمانوں کو خاک و خون میں نہلانے والوں کو اپنے جرائم کی سزا نہیں ملنی چاہئے "طویل جنگ کے خاتمے" اور "قیام امن" کے نام پر لاکھوں بیواؤں اور یتیموں کے "مطالبہ قصاص" کو نظر انداز کر دینا چاہئے۔ افغانوں کی تاریخ ہے کہ انہوں نے بیاں

کبھی بھی جارح اور حملہ آور کو نہ صرف ٹھہرنے نہیں دیا بلکہ "پشتون ولی" کلیے کے تحت خون بھی معاف نہیں کیا۔ قبائلی اور انفرادی چپقلشوں میں بہنے والے خون سے لے کر چھوٹی بڑی اور طویل معرکہ آرائیوں میں ہونے والے کشت و خون تک' افغانوں نے ہمیشہ اپنے خون کے ایک ایک قطرے کا حساب لیا ہے زیادہ دور جانے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ رواں صدی کے آغاز میں ہی تاجِ برطانیہ اور افغانوں کے مابین ہونے والی جنگوں کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لیجئے' افغانوں نے اپنے بہنے والے خون کے ایک ایک قطرے کا انتقام برطانوی سپاہ اور ان کے افغان ایجنٹوں سے لیا۔ اس دور میں برطانوی سلطنت روس سے بھی بڑی اور طاقتور تھی۔ برطانوی مقبوضات تین برِّاعظموں تک پھیلی ہوئی تھیں۔ دنیا کے بڑے سمندروں پر بھی برطانوی عملداری قائم تھی۔ افغان اس وقت بھی "غیر مہذّب" اور "پسماندہ" تھے لیکن انہوں نے اس وقت کی سپر طاقت کو بھی اس طرح میدانِ جنگ سے بھاگنے پر مجبور کر دیا تھا جس طرح روسی افواج کو پسپائی پر مجبور ہونا پڑا۔ لیکن ایک بات بڑی اہم ہے کہ اس وقت افغانوں کو کسی "مسلم برادر ملک" یا "غیر مسلم دوست ملک" کی تائیدو حمایت حاصل نہیں تھی۔ ایران کے صفوی حکمران بھی افغانوں کے خلاف تھے اور اشتراکی روس کے ساتھ بھی افغانوں کے دوستانہ مراسم قائم نہیں ہوئے تھے۔ باقی ارد گرد کے تمام علاقے برطانوی عملداری میں تھے اور یہاں کے بسنے والے مسلمان "انگریزوں کی تابع دار یا مجبور رعایا" کے طور پر زندگی گزارنے پر مجبور تھے۔ اس لئے افغان نہ صرف تنہا معرکہ آرا تھے۔ بلکہ غیر دوستوں کے درمیان گھرے ہونے کے باوجود انہوں نے اس وقت کی سپر طاقت کو شکست سے دوچار کیا بلکہ ان کے ایک ایک سپاہی اور ایجنٹ کو کیفرِ کردار تک پہنچایا۔ اس پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے حالات کا ایک تجزیہ کیا جائے تو موجودہ منظر ابھی واضح نہیں ہو رہا ہے۔ افغانوں نے حسبِ روایت اپنے دشمن کے دانت کھٹے کر دیے ہیں۔ صدی کی تاریخ کا محیر العقول کارنامہ "روسی افواج کی شکست اور واپسی" بھی انجام پذیر ہو چکا لیکن ایک تاریخ ہنوز دہرائی جانے والی ہے۔ یعنی "افغانوں کے بہائے جانے والے خون کا صلہ" ۱۵ لاکھ شہداء کی قربانیوں کا انجام' پچاس لاکھ ہجرتوں کا صلہ۔ لاتعداد زخمیوں' معذوروں' اپاہجوں اور بیوہ ویتامیٰ کی آہوں' سسکیوں اور دعاؤں کا انجام کیا افغانوں نے اسی طرح کی "وسیع البنیاد" حکومت کے قیام کے لئے قربانیاں دی تھیں جس میں پاکستان دشمن ظاہر شاہی نظام کے وفاداروں کے علاوہ ماسکو نواز پی ڈی پی اے کے پرچم و خلق دھڑوں کے نمائندے شریک ہوں' اور ایک لادین افغان حکومت قائم ہو؟ کیا پاکستان نے طویل افغان

جدوجہد کا اسی لئے ساتھ دیا تھا کہ افغانستان میں اشتراکیوں کو ہٹا کر دوبارہ ملحدوں ' لادینیوں اور پاکستان دشمنوں کی حکومت قائم کر دی جائے؟؟ کیا افغانستان میں انتخابات کے ذریعے حکومت کا قیام ہی ایسا اعلیٰ وارفع مقصد تھا جس کے لئے افغانوں نے آگ وخون کا کھیل کھیلا اور پاکستان نے اس کھیل میں ان کی معاونت ومددگار کا فریضہ سرانجام دیا؟؟

یقیناً ان تمام باتوں کا جواب نفی میں ہے۔ پاک افغان تعلقات کی نصف صدی پر محیط تاریخ کا مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ظاہر شاہی نظام کے قیام واختتام سے لے کر سردار داؤد نور محمد ترکئی ' حفیظ اللہ امین ' ببرک کارمل اور ڈاکٹر نجیب اللہ کے ادوارِ حکمرانی تک ' وہاں پاکستان دشمن نظریات نے پرورش پائی۔ پاکستان کے قیام کے بعد پاکستان کے اقوامِ متحدہ میں رکن بننے کے مرحلے سے لے کر مسئلہ کشمیر ' اور دیگر پاک بھارت مسائل تک افغان حکمرانوں نے پاکستان دشمن کا کردار ادا کیا۔ خاد ' واد اور راء کے ایجنٹ یہاں تخریب کاریوں میں مصروف رہے اور اب تک مصروف ہیں۔ پشتونستان کا مرکز گریز نظریہ بھی افغان حکمرانوں کی آشیرباد کی وجہ سے ہی پاکستان میں زندہ بھی رہا اور سر بھی اٹھاتا رہا۔ پاکستان میں اسلامی نظام کے نفاذ کے خلاف لابی کو فعال ومتحرک رکھنے والوں میں افغان حکمرانوں کا نام بھی شامل رہا ہے۔ پشتونستان کے مسئلے پر بھٹو دور میں "جوابی کارروائی" کا منصوبہ بنایا گیا تھا۔ بلکہ یوں کہئے کہ پاکستان نے پہلی بار افغان حکمرانوں کی پاکستان دشمن سرگرمیوں کا سنجیدگی سے نوٹس لیا اور پھر افغان حکومت کے "باغیوں" کو یہاں نہ صرف پناہ دی گئی بلکہ ان کی مالی وعسکری مدد بھی شروع کی گئی ' تاکہ انہیں ایک "جواب آں غزل" کے طور پر استعمال کیا جاسکے۔ یہاں اس نکتے پر بھی پاک افغان (حکومت کے مخالف عناصر) مفادات یکساں ہوئے تھے اس لئے تعاون کی راہیں کھلیں۔ "افغان باغی" اپنے حکمرانوں کے ظلم وستم اور لادینی پالیسیوں کے خلاف عملی جدوجہد کر رہے تھے ان حکمرانوں کے خلاف جو پاکستان کے دشمن تھے۔ "دشمن کا دشمن (افغان حکمرانوں/حکومت کا دشمن) ہمارا دوست" قائدے کے مطابق یہ "باغی" پاکستان کے دوست بنے اور سردار داؤد دورِ حکومت میں افغان تحریک مزاحمت نے یہاں پاکستان میں پرورش پانی شروع کر دی تھی۔ اس وقت صوبہ سرحد کے گورنر اور ذوالفقار علی بھٹو کے معتمد خاص میجر جنرل نصیر اللہ بابر نے اس تحریک کی پذیرائی کے متعلق تفصیلات روزنامہ جنگ میں چھپنے والے ایک انٹرویو میں بتائی ہیں۔ دسمبر ۷۹ء میں جب روسی افواج افغانستان میں داخل ہو گئیں تو ایک "خونخوار اور طاقتور دشمن" کی ہماری سرحدوں پر موجودگی نے صورتحال کی سنجیدگی میں یکدم

اضافہ کر دیا۔ سردار محمد داؤد خان کے دور میں شروع ہونے والی مزاحمتی تحریک اور اس کو پاکستان کی امداد' پھر گوریلا سرگرمیاں ایک طرح کا کھیل لگنے لگیں اور ایک لاکھ طاقتور روسی افواج کی موجودگی نے صورتحال یکسر بدل دی تھی۔ جنگ اب پاکستان کے دروازوں پر دستک دینے لگی تھی۔ تحریکِ حُریّت کی قیادت نے اپنی سرزمین افغانستان سے اشتراکی افواج کے انخلا کیمونسٹ حکومت کا خاتمہ اور وہاں اپنی حکومت قائم کرنے کے نظریئے کے تحت اپنی شہرہ آفاق جدوجہد کو نئے سرے سے ترتیب دیا۔ اس سے پہلے جدوجہد ماسکو نواز پرچمی و خلقی حکمرانوں کے خلاف تھی۔ اب جدوجہد کفر کے خلاف "جہاد" بن گئی تھی۔ پاکستان نے بھی اپنی قومی وملی امنگوں کے مطابق اپنی "افغان خارجہ پالیسی" ترتیب دی جس میں

۱...... افغانستان سے روسی افواج کا مکمل اور غیر مشروط انخلا

۲...... افغانستان کے اسلامی اور عدم وابستہ تشخّص کی بحالی

۳...... افغان عوام کے حقِ خود ارادیت کی بحالی (کسی بھی خارجی طاقت یا دباؤ کے بغیر افغان عوام کے اپنی حکومت قائم کرنے کے حق کا احیاء)

۴...... افغان مہاجرین کی پُرامن اور باعزت واپسی کے لئے ساز گار حالات کا قیام

جیسے مرکزی نکات شامل تھے۔ یہی افغان مجاہدین کی خواہشات تھیں۔ جذبۂ اسلامی سے سرشار افغان قوم نے انہی مقاصد کے حصول کے لئے ۹ سال تک جدوجہد کی۔ کفار کی افواجِ قاہرہ کا مقابلہ کیا۔ روسی افواج کے انخلا کے بعد' باقی ماندہ مقاصد کے حصول کے لئے چار سال سے ان کی جدوجہد جاری ہے۔ لیکن روسی افواج کے انخلا کے اعلان کے بعد' عالمی و علاقائی صورتحال میں کچھ اس طرح ڈرامائی تبدیلیاں آنی شروع ہو گئیں کہ اس مسئلے میں شامل مختلف عوامل نے اپنی پوزیشن تبدیل کرنی شروع کر دی۔ اس کھیل میں جہاں کھلاڑی تبدیل ہو رہے ہیں وہاں کھلاڑیوں کی پوزیشن بھی تبدیل کر دی گئی ہے یا کھلاڑیوں نے از خود اپنی پوزیشن تبدیل کرنے میں عافیت سمجھی ہے۔

241

جہادِ افغانستان کا متنازعہ جرنیل

جنرل حمید گل کے بارے میں کہی اَن کہی باتیں

جہاد افغانستان کے حوالے سے جنرل حمید گل کا نام خاصا متنازعہ بن کر سامنے آیا ہے۔ کچھ صحافتی حلقے انہیں " LEGEND " کے طور پر پیش کرتے ہوئے نہیں تھکتے۔ انہیں جہاد افغانستان کا چیمپئن اور ہیرو ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ ان کے دل میں جہاد افغانستان کی محبت اور مجاہدین کے ساتھ قلبی اور افسانوی لگاؤ کی باتیں بھی کی جاتی رہی ہیں۔ انہیں مجاہدین کے درمیان اتحاد اور اتفاق پیدا کرنے کیلئے اپنی خدمات پیش کرتے ہوئے بھی سنا گیا ہے۔ لیکن حقائق کے بارے میں زیادہ جستجو نہیں کی گئی۔ بلکہ جذبات کے غلبے کے تحت بہت سی تحریریں لکھی گئی ہیں جو حقائق کے برعکس نہ ہونے کے باوجود پوری طرح مبنی بر حقائق نہیں ہیں۔ مارچ ۱۹۸۷ء میں جب جنرل حمید گل کو آئی ایس آئی کی قیادت سونپی گئی تو اس وقت مجاہدین کی سرگرمیاں اپنے عروج پر تھیں۔ روسی افغانستان سے واپسی کا فیصلہ کر چکے تھے۔ مجاہدین کی فتح اور روسیوں کی شکست نوشتہ دیوار بن چکی تھی۔ جنرل اختر عبدالرحمان نے اپنے رفقاء کار کے ساتھ مل کر روسیوں کی عسکری ہزیمت کے اس خواب کو ایک حقیقت کا رنگ دے دیا تھا جو انہوں نے ۱۹۸۰ء کے اوائل میں دیکھا تھا۔ انہوں نے آٹھ سال تک بڑی رازداری کے ساتھ اس خواب میں حقیقت کا رنگ بھرنے کی کوشش کی تھی۔ انہوں نے افغانستان میں بکھری ہوئی مزاحمتی تحریک کو "اتحاد اسلامی" کی لڑی میں پرو کر ایک ایسی گوریلا فوج میں تبدیل کر دیا تھا جس نے روسیوں کو

چھوٹے چھوٹے ہزاروں نہیں بلکہ لاتعداد زخم لگا کر مضمحل کر دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ روسی افغانستان کو رستا ہوا زخم قرار دے کر یہاں سے فرار ہو رہے تھے۔ رازداری اور گوریلا آپریشنوں کی خفیہ نوعیت ہی کامیابی کا راز تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جنرل اختر اس پورے عرصے میں نہ تو کبھی پریس کے سامنے پیش ہوئے اور نہ ہی انہوں نے سیاسی و صحافتی حلقوں تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی۔

ایران کی انقلابی قیادت جنرل ضیاء الحق کو بوجوہ پسند نہیں کرتی تھی اس میں جنرل ضیاء کے کٹر قسم کے خیالات کا بھی عمل دخل تھا ایران کے دورے کے دوران جنرل نے امام خمینی سے ملنے کی کوشش بھی کی لیکن امام خمینی نے جنرل ضیاء الحق کی "امریکہ دوستی" کی پالیسی کی وجہ سے ان سے ملنے سے انکار کر دیا جنرل اختر نے آئی ایس آئی کے بریگیڈیئر ترمذی کو ڈیفنس اتاشی بنا کر ایران بھیجا تاکہ ایران کی انقلابی قیادت سے معاملات طے کئے جاسکیں

جنرل حمید گل آئی ایس آئی میں آنے سے پہلے ملٹری انٹیلی جینس کی قیادت کر چکے تھے۔ یہاں ان کی ذمہ داریوں کا تقاضا خفیہ معلومات کا افشا تھا یعنی چھپی ہوئی باتوں کو معلوم کرنا۔ لیکن آئی ایس آئی کی ذمہ داریوں میں ایک اور اہم بات افغانستان کے حوالے سے کی جانے والی سرگرمیوں کا پوشیدہ رکھنا بھی شامل تھا۔ جنرل حمید گل رازداری کے اس اہم پہلو پر توجہ نہ دے سکے جو گوریلا سرگرمیوں کی ریڑھ کی ہڈی تھی۔ جنرل اختر کی احتیاطی تدابیر اور شہرت سے دور بھاگنے والی طبیعت کے برعکس جنرل حمید گل نے پریس و سیاست کے معاملات میں آزاد روی اختیار کی۔ جہاد افغانستان کے بارے میں بڑا واضح اور مومنانہ نقطہ نظر رکھنے کے باوجود رازداری کے تقاضے پورے نہ کر سکے۔ ان کے دور سربراہی میں آئی ایس آئی کا نام بچے بچے کی زبان پر آنے لگا جہاں کچھ تعریفیں بھی ہوئیں وہاں نقطہ چینوں نے ہر اچھی بری سرگرمی آئی ایس آئی کے کھاتے میں ڈالنی شروع کر دی۔ ایک انتہائی اہم اور باوقار قومی ادارے پر عام حلقوں میں بحث ومباحثے نے اس کے وقار کو شدید دھچکا پہنچایا۔ سیاستدان آئی ایس آئی کے چیف کو "بادشاہ گر" سمجھنے لگے۔ جنرل حمید گل کے سیاسی و صحافتی رابطوں نے انہیں معروف کر دیا۔ اس سے آئی ایس آئی کا کڑا نظام بھی کمزور پڑ گیا۔ اس کی دہشت و رازداری میں کمی واقع ہونے لگی۔ بین الاقوامی پریس میں بھی آئی ایس آئی کے بارے میں باتیں شروع ہو گئیں۔ اس دور میں آئی ایس آئی کے بارے میں کئی مضامین بین الاقوامی جرائد میں بھی چھپے۔ اس سے بھی حمید گل کے امیج میں اضافہ ہوا اور جہاد افغانستان کے بارے میں ان کے خیالات لوگوں تک پہنچے۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ انہیں طویل عرصے سے جاری افغان معاملات کے بارے میں زیادہ معلومات

حاصل نہیں تھیں۔ اس کی وجہ ان کی افغان امور سے براہ راست وابستگی کا نہ ہونا تھا۔ لیکن دوسری طرف جنرل حمید گل کا اخلاص، نظری اعتبار سے معاملہ فہمی اور پھر تجزیہ کر کے نتائج پیش کرنے کی صلاحیت اپنی جگہ موجود تھی۔ انہوں نے ذاتی مراسم، اخلاص اور قوت استدلال کے بل بوتے پر صحافتی حلقوں کے علاوہ سیاسی میدان میں بھی اپنے مداح پیدا کئے۔ اسلام، جہاد افغانستان اور نظریہ پاکستان کے حوالے سے اپنے ذاتی خیالات کو بیان کرتے وقت انہوں نے اپنی محکمانہ بندشوں کی پرواہ نہیں کی۔ افغان معاملات میں طویل عرصے سے طے شدہ پالیسیوں کے برعکس انہوں نے مہم جو اور بنیاد پرست مجاہد تنظیموں کے ساتھ فیاضانہ سلوک شروع کیا۔ عسکری اور اقتصادی امداد سے لے کر ذاتی پسند و ناپسند کے لئے معیار قائم ہوئے۔ ایسا کرنا ان کے خیال میں جہاد کی روح کے عین مطابق تھا۔ دوسری طرف انہوں نے اپنی سرکاری حیثیت کو اپنے نظریات کی ترویج کیلئے بھی استعمال کیا۔ آئی ایس آئی کے ڈائریکٹر جنرل کے طور پر انہوں نے اپنے سیاسی نظریات کو اسلامی جمہوری اتحاد کی تشکیل کی بنیاد بنایا۔ اور پھر الیکشن ۱۹۸۸ء میں آئی ایس آئی کا کردار قومی سطح سے ہٹ کر ایک فریق کا ہو گیا۔ آئی جے آئی کی تشکیل سے لے کر بے نظیر حکومت کے قیام تک آئی ایس آئی نے ایک فریق کے طور پر کام کیا جو اس عظیم اور باوقار ادارے کے شایان شان نہیں تھا۔ مارچ ۱۹۸۷ء سے لے کر ۱۹۸۹ء تک جنرل حمید گل کے آئی ایس آئی کے دور سربراہی کے خاتمے تک اوجھڑی کیمپ کی تباہی، جنیوا معاہدے میں زین نورانی کے کردار، افغان عبوری حکومت کے قیام، سی۔ ۱۳۰ کے حادثہ اور آپریشن جلال آباد کی ناکامی جیسے تمام واقعات نے مسئلہ افغانستان کے مثبت حل کی طرف اٹھتے ہوئے قدموں کو روک دیا۔ ان تمام معاملات کا براہ راست تعلق آئی ایس آئی کی ناقص کارکردگی سے تھا۔ معاملات کے بگاڑ میں شومی قسمت کے علاوہ دیگر عوامل نے بھی کوئی کردار ادا کیا ہو گا لیکن حتمی ذمہ داری آئی ایس آئی کے سربراہ کے کاندھوں پر ہی آتی ہے جو اس وقت ان اہم امور کے نگران اعلیٰ تھے۔ جنرل حمید گل نے مجموعی طور پر اپنے نظریات اور اس حوالے سے اپنی سرگرمیوں کو چھپانے کی کوشش نہیں کی وہ اپنے تمام تر سیاسی و غیر سیاسی اقدامات کو اپنے دین اور ایمان کا معاملہ سمجھتے ہیں۔ اپنی سیاسی وابستگیوں اور سرگرمیوں کو ایک مسلمان اور پاکستانی کے نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں۔ ۱۹۸۷ء اور ۱۹۸۹ء کے دوران آئی ایس آئی کے سربراہ کے طور پر پیش آنے والی مشکلات اور ناکامیوں کو "قسمت کا کھیل" قرار دیتے ہیں۔ جونیجو دور حکومت میں ان کا کردار زیادہ واضح نہیں رہا لیکن الیکشن ۸۸ء اور اس کے بعد ان کا کردار بڑا واضح اور غیر مبہم تھا انہوں نے کھل کر ایک فریق کی حمایت اور دوسرے کی مخالفت کی۔ اپنے حمایتی فریق کو مخالف فریق سے

بچانے اور آگے بڑھانے کی منصوبہ سازی بھی ان کے دور آئی ایس آئی کی ایسی یادگار ہے جس پر انہیں ناز ہے۔ ۱۹۸۷ء میں جنرل اختر کی جگہ پر بطور ڈائریکٹر آئی ایس آئی تقرری کے حوالے سے انہوں نے غلط فہمیوں کو دور کرتے ہوئے ایک نجی محفل میں برملا کہا کہ مجھے جنرل ضیاء الحق نے نہیں بلکہ وزیراعظم محمد خان جونیجو نے آئی ایس آئی کا DG بنایا تھا۔ جنرل ضیاء الحق کی CHOCE کوئی اور تھا۔ وہ (جونیجو) جنرل اختر عبدالرحمان کو پسند نہیں کرتے تھے۔ اس کی وجہ نامعلوم ہے۔ مجھے انہوں نے (جونیجو) ذاتی طور پر ٹیلی فون کر کے درخواست کی کہ میں آئی ایس آئی کا چارج سنبھال لوں۔ میں نے ان سے تین شرائط منوائیں اولاً میرے کام میں مداخلت نہیں کی جائے گی۔ ثانیاً انہیں میری کھری باتیں سننے کیلئے تیار رہنا ہوگا ثالثاً ان میں سب سے اہم جہاد افغانستان تھا یعنی جہاد افغانستان کے بارے میں گڑبڑ یا پالیسی تبدیل کرنے کی کوشش نہیں کی جائے گی۔ وزیراعظم کی یقین دھانی کے بعد میں نے آئی ایس آئی DG کا عہدہ قبول کیا۔ ویسے یہ عہدہ حاصل کر کے مجھے خوشی بھی ہوئی تھی کیونکہ اس طرح مجھے افغان جہاد سے متعلقہ امور سے براہ راست نبرد آزما ہونے کا موقع مل رہا تھا۔ جہاد افغانستان سے میری شعوری وابستگی اور لگاؤ تھا جسے اب عملی صورت دینے کا موقع ہاتھ آ رہا تھا۔ جنرل ضیاء الحق میری جذباتیت اور جوش و خروش سے واقف تھے اس لئے انہوں نے مجھے چارج سنبھالتے ہی دو نصیحتیں کیں۔ (۱) افغان مجاہدین میں اتحاد قائم رکھنے کی پوری کوشش کرنا (۲) جہاد کو ایک خاص حد سے آگے نہ بڑھنے دینا یعنی جہاد کا TEMPO اتنا زیادہ نہ کر دینا کہ روس زچ ہو جائے اور بنتی بنتی بات بگڑ جائے۔ اب یہ بات غور طلب ہے کہ "مجاہد جرنیل" نے ان دو نکات پر کس قدر عمل کیا۔ یہ بات ریکارڈ پر ہے کہ حمید گل کے دور میں آئی ایس آئی کی مجاہدین افغانستان پر گرفت کمزور ہو گئی تھی۔ اس کی بنیادی وجہ جنرل صاحب کا خود ایک پارٹی بن جانا تھا۔ حمید گل اپنے مخصوص سیاسی نظریات اور جذباتی وابستگی کی وجہ سے آئی ایس آئی۔ افغان مجاہدین تعلقات کے حوالے سے وہ کردار ادا نہ کر سکے جو جنرل اختر عبدالرحمان پچھلے آٹھ سال سے ادا کر رہے تھے۔ اس بات کا اعتراف جنرل حمید گل نے بھی نجی ملاقاتوں میں کیا کہ جنرل اختر ایک خالص پیشہ ور جرنیل کے طور پر اپنے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ ان کی ذاتی دلچسپی طے شدہ ٹارگٹس کو حاصل کرنے کی حد تک محدود تھی۔ ان کی ذاتی پسند و ناپسند کا کہیں بھی دخل نہیں ہوتا تھا وہ طے شدہ طریق کار اور فارمولے پر عمل پیرا رہ کر بڑے ٹیکنیکل انداز میں کام کرتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ آٹھ سال کے دوران نہ صرف افغان رہنماؤں کو کوئی شکایت پیدا ہوئی اور نہ ہی کبھی جہاد کا ٹمپریچر مطلوبہ ڈگری سے بڑھا۔ لیکن جنرل حمید گل کے دور میں ان کی ذاتی پسند و ناپسند نے افغان

معاملات میں دخل اندازی (شعوری یا غیر شعوری طور پر) شروع کر دی۔ یہی وجہ ہے کہ کچھ افغان لیڈر جو جنرل حمید گل کی آنکھوں کا تارا بنے ہوئے تھے انہیں بہت پسند کرنے لگے۔ اب آئی ایس آئی کی حکمت عملی انہی کے مشوروں پر ترتیب پانے لگی جبکہ کچھ افغان رہنما جنہیں حمید گل نے زیادہ اہمیت نہ دی وہ حسد ور قابت کے جذبات کے تحت اس حلقے سے دور ہٹتے چلے گئے جو جنرل اختر عبدالرحمان نے طویل عرصے میں قائم کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ حزب اسلامی (حکمت یار) اور جمعیت اسلامی (برہان الدین ربانی) کے گروپوں کے درمیان خانہ جنگی شروع ہوئی جس میں سینکڑوں مجاہدین شہید ہوئے اور بے شمار زخمی ہوئے۔ اس معاملے میں آئی ایس آئی نے کیا کردار ادا کیا؟ کس کا ساتھ دیا اور کس کو دبانے کی کوشش کی؟؟ اس کا جواب تو آنے والا وقت ہی دے گا لیکن اس معاملے میں آئی ایس آئی کے کردار کی جھلک اس بات سے ضرور دیکھی جا سکتی ہے کہ حمید گل صاحب جن "افغانوں کی آنکھوں کا تارا" ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں وہی ان کے منظور نظر تھے' اور انہوں نے ان کے دور سربراہی (یعنی آئی ایس آئی کی سربراہی) میں وسیع تر افغان اتحاد کی بجائے "پارٹی پالیٹکس" کو زیادہ اہمیت دی۔ شوریٰ اسلامی' افغان عبوری حکومت کے قیام سے لے کر جلال آباد کی فتح کی ناکامی تک افغان تنظیموں کے درمیان افتراق وانتشار کو اسی تناظر میں دیکھنا چاہئے۔ اگر آئی ایس آئی کے سربراہ ذاتی خیالات و پسند ناپسند کی بجائے خالص سپاہی کے طور پر' ایک جرنیل کی حیثیت میں عسکری فتح کے اس مشن کو لے کر چلتے رہتے جو ان کے پیش رو جنرل اختر عبدالرحمان کے پیش نظر رہا تھا تو اب صورتحال بہتر ہوتی۔

ویسے تو جنرل حمید گل نے بھی جنگی ہیرو بننے کے لئے کسی فوری فتح کا تمغہ حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ایک جرنیل کے لئے سیاسی محاذ پر کامیابی قابل فخر نہیں بلکہ میدان جنگ میں مہم جوئی اور تسخیر و کامرانی قابل فخر ہوتی ہے۔ پروپیگنڈہ اور تشہیر کے ذریعے وقتی طور پر تو امیج بنایا جا سکتا ہے لیکن بالآخر حقیقت حال سامنے آ ہی جاتی ہے۔ جنرل حمید گل کی سیاسی مہم جوئیاں آہستہ آہستہ سامنے آ رہی ہیں کہ انہوں نے کس انداز میں "سیاست بازی" کے ذریعے نہ صرف افغان مجاہدین کے درمیان تفرقے کو ہوا دی بلکہ جہاد افغانستان کے طویل مدتی مفادات کو نقصان بھی پہنچایا۔ افغان جنرل تنائی کی بغاوت کے ذریعے "افغان جہاد" کو مقررہ سطح سے زیادہ ابالنے کی کوشش بھی پیشہ وارانہ نابالغ نظری کا ایک ایسا شاہکار تھی جس نے نہ صرف نجیب اللہ اور اس کے حواریوں کی صفوں میں وقتی طور پر اتحاد پیدا کر دیا بلکہ اس سے افغان مجاہدین اور حکومت پاکستان کو بھی شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا۔ حکمت یار کی "سولو فلائٹ" نے صورتحال میں اضطراب پیدا کر دیا' جنرل حمید گل کے ہیرو بننے کی خواہش پوری نہ ہو سکی۔ اس سے نجیب اللہ حکومت کی پوزیشن

خاصی مستحکم ہو گئی اور یہ تاثر کہ "روسی افواج کے انخلا کے بعد کابل انتظامیہ کا خاتمہ ہو جائے گا" بری طرح مجروح ہوا۔ جنرل تنائی کو بغاوت پر آمادہ کرنا بے شک ایک اچھا اور مستحسن قدم تھا لیکن اسے کامیابی تک پہنچانے کے لئے جس پیشہ وارانہ مہارت کی ضرورت تھی وہ شاید اس منصوبے کے خالقوں کے پاس نہیں تھی کیونکہ وہ روز اول سے ہی اس منصوبے کے ساتھ سیاسی مفادات وابستہ کئے ہوئے تھے اس لئے اس عسکری منصوبے کی ناکامی نے سیاسی دھچکا بھی لگایا۔ مجاہدین اور پاکستان کی ساکھ بری طرح متاثر ہوئی اور مجاہدین کی صفیں اور بھی زیادہ کمزور اور منتشر ہوئیں۔ دوسرے نکتہ "جہاد کو خاص درجے سے زیادہ ابلنے نہ دینا" کے حوالے سے بھی جنرل گل حمید کی کارکردگی خاصی متنازعہ ہے۔ جنرل اختر عبدالرحمان نے ابتدا ہی سے ایسی پالیسی اختیار کی تھی جس کا مقصد حملہ آور فوج کو چھوٹے چھوٹے زخم لگا کر اتنا کمزور کرنا تھا کہ وہ خود ہی واپسی کیلئے آمادہ ہو جائے اور ایسا ہی ہوا۔ روسی قیادت نے بالآخر فیصلہ کر لیا کہ وہ افغانستان سے فوجیں واپس بلا لے گی۔ انہیں اس فیصلے تک پہنچانے میں کلیدی کردار گوریلا جنگ نے ہی ادا کیا۔ جنرل اختر کی گوریلا جنگی حکمت عملی کامیاب رہی۔ دشمن کو اس قدر خون آلود کر دیا گیا کہ بالآخر وہ نڈھال ہو کر پسپا ہونے پر مجبور ہو گیا۔ اس نکتہ کے بعد جنرل اختر عبدالرحمٰن کی حکمت عملی کیا تھی، اس پر بات کرنے سے پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ یہ حکمت عملی یقیناً وہ نہیں تھی جو جنرل حمید گل نے اختیار کی کیونکہ اس حکمت عملی نے نہ صرف مجاہدین کی حربی و عسکری ساکھ کو متاثر کیا بلکہ پاکستان کو بھی شرمندہ کیا۔ جنرل اختر عبدالرحمٰن کی زیر قیادت آئی ایس آئی نے افغانستان میں عسکری و حربی طور پر جو سرمایہ کاری کی تھی بہت تھوڑے ہی عرصے میں جنرل حمید گل کی قیادت میں آئی ایس آئی نے اس سرمایہ کاری کا نفع پاکستان اور افغان عوام تک پہنچانے کی بجائے اصل سرمایہ کاری ہی ہندوکش کے پہاڑوں میں کابل و جلال آباد کے درمیان کہیں ضائع کر دی۔ جنرل حمید گل کی نظریاتی وابستگی اور جذباتیت اپنی جگہ مسلم ہی سہی، ان کی پیشہ وارانہ تربیتی کورسوں میں شاندار مہارت (نظری تربیت کے دوران) اپنی جگہ درست ہو گی لیکن کسی جرنیل، اعلیٰ جرنیل کی کارکردگی اس کے کاغذی کورسوں میں حاصل کرنے والے نمبروں سے نہیں بلکہ میدان عمل میں فتح و نصرت اور کامرانی کے گراف کی بلندی سے لگایا جاتا ہے۔ خالد بن ولید سے لے کر طارق بن زیاد و محمد بن قاسم تک اور دوسری طرف جنرل منٹگمری و جنرل رومیل سے لے کر جنرل نارمن شوارز کوف تک تمام عسکری شخصیات کے بارے میں لوگ ان کی تربیت و تربیتی کورسوں کے دوران میں حاصل کردہ اعزازوں سے نہیں بلکہ میدان جنگ میں حاصل کردہ کامیابیوں کے حوالے سے جانتے ہیں۔ سلطان صلاح الدین ایوبی میدان جنگ میں جانا ہی نہیں چاہتا تھا، وہ مصر

میں رہ کر آسودہ زندگی گزارنا چاہتا تھا' اسے حرب وضرب سے زیادہ شغف بھی نہیں تھا لیکن جب وہ صلیبیوں کے مقابلے میں صف آرا ہوا تو تاریخ اسلام میں ہی نہیں بلکہ دنیا کی تاریخ پر اپنے ان مٹ نقوش چھوڑ گیا۔ دنیا آج بھی اسے غازی صلاح الدین فاتح بیت المقدس کے نام سے جانتی ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تربیتی کورسوں میں اعلیٰ کارکردگی کا مظاہرہ "چہ معنی دارد" قوم تو یہ جاننا چاہتی ہے کہ آئی ایس آئی نے جسے جنرل اختر عبدالرحمٰن نے دنیا کی صف اول کی انٹیلی جینس ایجنسیوں کے معیار پر لا کھڑا کیا تھا روسی افواج کے انخلا کے بعد کیا کارکردگی دکھائی؟ آگ و خون کے اس کھیل کا انجام مجاہدین کے حق میں کیوں نہ ہوا؟ آئی ایس آئی حتمی مراحل میں معاملات کو پاکستان و مجاہدین کے حق میں کیوں استعمال نہ کر سکی بلکہ بنی بنائی ساکھ کیوں بگڑ گئی اور "صورتحال کو جنرل ضیاء الحق کے کہنے کے باوجود ایک خاص درجہ حرارت سے اوپر کیوں جانے دیا گیا اور پھر اگر صورتحال کی تیزی کسی منصوبے کا حصہ ہی تھی تو اس ابال سے دشمن کے بھسم ہونے کی بجائے مجاہدین کا اتحاد ہی کیوں متاثر ہوا اور پاکستان کو عالمی برادری کے سامنے شرمندہ ہونا پڑا؟ یہ ایسے سوالات ہیں جن کا جواب جنرل حمید گل کے ذمے ہے۔ جنرل حمید گل اپنے آپ کو غازی افغانستان سمجھتے ہیں' اپنی جبری ریٹائرمنٹ کو اسی نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں' ان کا کہنا ہے کہ میں نے ان ہدایات کی روشنی میں افغان کاز کے لئے کام کیا کیونکہ میرے خیال میں یہ پاکستان کی بقا کی جنگ تھی اور اب بھی ہے' میں نے ایک مشن کے لئے ایک کاز کے لئے پاکستان آرمی جوائن کی تھی اور انہی آدرشوں کے لئے خود کو ساری زندگی وقف کئے رکھا پاکستان اور اسلام سے میری وابستگی ہی میری زندگی ہے میں' نے اپنی اس وابستگی کو کبھی کسی سے نہیں چھپایا جہاد' افغانستان کو بھی زندگی کا مشن سمجھا' اس کیلئے کام کیا یہی وجہ ہے کہ افغان مجاہدین میری عزت کرتے ہیں۔ کئی لوگ مجھ پر طرح طرح کے الزامات لگاتے ہیں' افغانستان کی حاضر صورتحال کے حوالے سے مجھے تنقید کا نشانہ بھی بنایا جارہا ہے لیکن میں یہ بات بالکل واضح کرنا چاہتا ہوں کہ افغانستان کی موجودہ صورتحال کا میں ذمہ دار نہیں ہوں بلکہ میں نے تو اسے حتی الامکان کامیاب و حتمی بنانے کی کوشش کی۔

مجاہدین کی حکومت کے قیام کے لئے جتنی کاوشیں کیں وہ افغان تاریخ کا ایک ریکارڈ ہیں۔ یہ بات شاید بہت کم لوگوں کو پتہ ہے کہ افغانستان کے جہاد کو فیصلہ کن نہ ہونے دینے میں جتنا ہاتھ روس اور امریکہ کا ہے اس سے زیادہ ہاتھ ہمارے حکمرانوں کا بھی ہے۔ روسی افواج کے انخلا کے حتمی فیصلے کے آخری لمحات کے وقت میں نے جونیجو حکومت پر دباؤ بھی ڈالا کہ وہ جنیوا معاہدے پر دستخط کرنے سے پہلے مجاہدین کی حکومت کے قیام اور نجیب حکومت کے مستقبل کے بارے میں بھی

معاملات پر غور کریں اور کوئی ایسی شرط نہ مانیں جس سے افغان مجاہدین کی قربانیاں ضائع ہو جائیں اور پاکستان کے علاقائی مفادات متاثر ہوں ۔ اس معاملے میں وزیر اعظم محمد خان جونیجو کو تو شاید زیادہ تفصیلات کا علم نہیں تھا لیکن صاحبزادہ یعقوب خان صاحب تفصیلات سے آگاہ تھے۔ محمد خان جونیجو سے جب میں نے بات کی کہ اس سلسلے میں ان سے بات کر لی جائے تو انہوں نے کہا کہ اتنے طویل عرصے تک صاحبزادہ صاحب ہی جنیوا معاہدے پر دستخطوں کی راہ ہموار کرتے رہے ہیں' انہی کے طے کردہ نقاط کے تحت سمجھوتہ ہو رہا ہے۔ زین نورانی (وزیر خارجہ) نے بھی اس سلسلے میں اچھا کردار ادا نہیں کیا بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ انہوں نے افغان قوم اور پاکستان کے وسیع تر مفادات کے خلاف کام کیا۔ اگر انہیں سمجھ نہیں تھی یا قوت فیصلہ نہیں تھی تو پھر انہیں ایسے تاریخی و نازک حالات میں وزارت خارجہ کی ذمہ داریاں نہیں سنبھالنی چاہئیں تھیں۔ حقیقی بات یہ ہے کہ زین نورانی صاحب کے آئی ایس آئی سے پرانے روابط تھے بلکہ وہ ہمارے PAY ROLL پر بھی رہے۔ انہیں حقیقت حال کی سمجھ بوجھ تھی۔ وہ چاہتے تو محمد خان جونیجو کی رہنمائی کر سکتے تھے انہیں ملکی مفادات اور افغان کاز کے حوالے سے بہتر مشورہ دے سکتے تھے۔ جونیجو ان پر اعتماد بھی کرتے تھے لیکن زین نورانی نے عالمی و ملکی مفادات کو پس پشت ڈالتے ہوئے جنیوا معاہدے پر دستخط کر دیے ۔ (وزیر اعظم جونیجو کو تو جنرل ضیاء الحق کی باتوں کے خلاف عمل پیرا ہونے کی دھن سوار تھی اور وہ ہر وہ کام کرنا چاہتے تھے جس سے ضیاء الحق کو تکلیف ہو اور ہر وہ کام کرنے سے عملاً گریزاں رہتے جس کے کرنے سے ضیاء الحق کی پالیسیوں کو تقویت ملتی یا ملنے کا امکان ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے جب جنرل ضیاء الحق نے جنیوا معاہدے پر دستخط کرنے کے حوالے سے زین نورانی کو مشورہ دینے یا روسیوں سے شرائط منوانے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی تو جونیجو صاحب کی یہی سوچ آڑے آئی اور انہوں نے زین نورانی کو وہی کچھ کرنے کو کہا جو ضیاء الحق چاہتے تھے کہ نہ ہو' کیونکہ اس سے افغان کاز کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ زین نورانی نے بھی ویسا ہی کیا جیسا انہیں نہیں کرنا چاہئے تھا۔) اس میں کوئی شک نہیں کہ جنرل ضیاء الحق جنیوا معاہدے پر دستخطوں کو افغان جہاد کاز کے خلاف سمجھتے تھے کیونکہ اس طرح امن و امان قائم نہیں ہو سکتا تھا اور نہ ہی مجاہدین کی حکومت قائم ہونے کی کوئی سبیل پیدا ہو رہی تھی۔ ان تمام باتوں کے باوجود ضیاء الحق نے اپنے کلی اختیارات کو استعمال نہیں کیا۔ ۱۷ اپریل ۸۷ء کو معاہدے پر دستخط ہونے دیئے کیونکہ اس سے صرف افغان کاز کو نقصان پہنچ رہا تھا جبکہ جنرل ضیاء الحق کے حکمرانی کے جواز پر کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا۔ بلکہ جنرل ضیاء کی اپنی بچھائی ہوئی بساط کے حوالے سے وہی تاثر پیدا ہونا شروع ہو گیا تھا جو جنرل ضیاء الحق دینا چاہتے تھے یعنی "جمہوری اور منتخب حکومت کا قیام ہو

چکااور جنرل ضیاء الحق بھی آمر صدر ہیں۔ " آٹھویں ترمیم کے بعد اور چیف آف آرمی سٹاف کا عہدہ بھی اپنے پاس رکھنے کے بعد ضیاء الحق آمرانہ طور پر کتنے مضبوط ہو چکے تھے اور انہیں کس طرح کے آمرانہ اختیارات حاصل ہو چکے تھے اس بات سے توجہ دور رکھنے کیلئے جنرل ضیاء الحق نے محمد خان جونیجو کو من مانی کرنے کی اجازت دے رکھی تھی 'اس من مانی سے انہوں نے ناجائز فائدہ اٹھانا شروع کر دیا تھا۔ مسئلہ افغانستان پر بجائے سنجیدہ فکری کے انتہائی بچگانہ حرکات شروع کر دی گئیں۔ ایک طے شدہ راستے کو چھوڑ کر "عوامی راستہ" اختیار کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ طویل مدت سے جنیوا مذاکرات میں شامل وزیر خارجہ صاحبزادہ یعقوب خان کو صرف اس لئے نظر انداز کر دیا گیا کہ وہ جنرل ضیاء الحق کا چناؤ تھے۔ جونیجو نے مسئلہ افغانستان کے حل کے اس فیصلہ کن مراحل کو اپنا سیاسی قد بڑھانے کیلئے استعمال کرنے کی بڑی بھونڈی کوششیں کیں۔ تمام سیاسی جماعتوں کی گول میز کانفرنس بلائی جس میں پیپلز پارٹی سمیت کئی ایسی جماعتوں کو بھی دعوت شرکت دی جو روز اول سے ہی مجاہدین کے خلاف اور جارح روس کی حمایتی تھیں۔ لیکن جونیجو صاحب تو نیشنل نہیں بلکہ بین الاقوامی لیڈر بننے کے چکر میں تھے۔ اس لئے وہ عقل و شعور کے گھوڑے پر سوار ہو کر نہیں بلکہ حرص اور شہرت کے اندھے گھوڑے پر سوار ہو کر بام عروج تک جست لگا کر پہنچنا چاہتے تھے۔ بین الاقوامی حالات کے تحت جنرل ضیاء الحق محمد خان جونیجو کے بارے میں قائم اس تاثر کو مجروح نہیں کرنا چاہتے تھے کہ "محمد خان جونیجو اصلی وزیراعظم ہیں۔" جونیجو صاحب نے اس حوالے سے حالات کو اپنے سیاسی قد کاٹھ میں اضافے کے لئے استعمال کیا۔ مسئلہ افغانستان سے غیر متعلق افراد و سیاسی رہنماؤں سے مشاورت کر کے ضیاء الحق کو تنہا کرنے کی کوشش کی۔ محمد خان جونیجو کو مسئلہ افغانستان کے بے شمار نازک پہلوؤں کا پتہ ہی نہیں تھا۔ ہمارے عام ملکی سیاسی رہنماؤں کی طرح مسئلہ افغانستان کی تاریخی و جغرافیائی اہمیت کا اندازہ ہی نہیں تھا۔ سب سے زیادہ اہم بات یہ تھی کہ کسی بھی مسلم لیگ کے منشور میں مسئلہ افغانستان شامل نہیں تھا اس لئے محمد خان جونیجو اور ان کے دیگر سیاسی جماعتوں کے رہنما مشیر انہیں کیا مشورہ دے سکتے تھے۔ اس دور میں جمہوریت کا بخار اس قدر زیادہ چڑھا ہوا تھا کہ حقیقی جمہوریت پسندی کے اس نام نہاد ر ن نے پاکستان اور افغان مجاہدین کے وسیع تر مفادات کو وقتی مفادات پر قربان کر دیا۔ جنیوا معاہدے پر بغیر کچھ حاصل کئے بغیر کچھ منوائے نہ اپنے لئے نہ ہی افغان مجاہدین کے لئے دستخط کر دیئے اس معاہدے پر دستخطوں کے ذریعے روس کو دو فائدے ہوئے۔ ایک تو اسے افواج نکالنے کیلئے ایک قانونی چھتری مل گئی حالانکہ اس معاہدے پر دستخطوں سے پہلے ہی وہ اعلان کر چکا تھا کہ روسی فوجیں ہر حال میں افغانستان سے نکل جائیں گی۔ اگر بغیر

معاہدے کے یا پاکستان اپنی شرائط پر معاہدہ کرتا تو روس کی عسکری شکست کا تاثر پختہ ہوتا۔ افغان مجاہدین کالھورنگ لاتا۔ دنیا سپر طاقت کی عسکری ہزیمت کی داستان شوق سے سنتی۔ مسلمان پوری دنیامیں سرخرو ہوتے۔ لیکن محمد خان جونیجو نے جنرل ضیاء الحق کو نیچا دکھانے اور خود سیاسی ہیرو بننے کے چکر میں معاہدے پر دستخط کر کے ایسی تاریخی غلطی کی جس کا خمیازہ افغان مجاہدین ہی نہیں بلکہ پاکستان بھی ابھی تک بھگت رہا ہے۔ افغانستان میں متواتر خون بہہ رہا ہے اور نجانے کب تک بہتا رہے گا۔ مسئلہ افغانستان کے ابتدا ہی سے مسلم امہ نے O.I.C کے پلیٹ فارم پر متحد ہو کر ایک موقف اختیار کیا تھا۔ ۲۷ دسمبر ۱۹۷۹ء میں روسی افواج افغانستان میں داخل ہوئی تھیں اور ٹھیک ۳۰ دن بعد ۲۷ جنوری ۱۹۸۰ء کو اسلامی وزرائے خارجہ نے اسلام آباد میں مل کر افغان عوام کی مدد کیلئے لائحہ عمل تیار کیا۔ پاکستان اس معاملے میں اکیلا نہیں تھا بلکہ پوری اسلامی دنیا اس کے ساتھ شانہ بشانہ کھڑی تھی۔ بعد میں کیا ہوا ہم نے ان برادر ممالک کو صرف اخلاقی ومالی امداد کا ایک ذریعہ سمجھ کر ہی تعلق قائم رکھا۔ جتنی امداد مغربی ممالک بشمول امریکہ نے مجموعی طور پر دی اکیلے سعودی عرب نے اتنی امداد اپنے افغان بھائیوں کیلئے دی ہے اس لئے امریکہ اگر اب PRINCIPAL DONOR کے طور پر اس مسئلے کے حل کے آخری مراحل میں اپنی شمولیت پر اصرار کرتا ہے تو سعودی عرب اور دیگر امداد کنندگان کا بھی حق ہے کہ انہیں مشاورت میں شریک کیا جائے۔ ۱۹۷۹ء سے لے کر اب تک ایران بھی اس معاملے میں براہ راست شریک رہا ہے۔ ۱۰ لاکھ افغان مجاہدین کو اپنے ملک میں پناہ دینے کے حوالے سے بھی ایران کا حق بنتا ہے کہ اسے حتمی معاملات میں شریک کیا جائے لیکن صورتحال ایسی دکھائی نہیں دے رہی ہے۔ پاکستان کی وزارت خارجہ کی بیورو کریسی اور سیاستدان اس مسئلے کی نزاکتوں سے نہ تو پہلے واقف تھے اور نہ ہی انہوں نے بدلتے ہوئے حالات کے مطابق نئے زمانے کے تقاضے جاننے کی کوشش کی ہے۔ ہمارے اعلیٰ درجے کے منصوبہ بھی اس علاقے کے تاریخ و جغرافیہ سے واقفیت نہیں رکھتے۔ روسی زاروں سے لے کر اشتراکی روس کے حکمرانوں تک ان کی سوچ کیا تھی، اس سوچ میں سوویت یونین کے خاتمے کے بعد کیا تبدیلی آئی ہے، وسط ایشیائی مسلم ریاستوں کے حالات کیا تھے، کن حالات میں انہیں سوویت یونین میں ضم کیا گیا تھا، کیا وہاں بھی مزاحمت کی تحریک چلی تھی، اگر چلی تھی تو کامیاب کیوں نہ ہو سکی، افغانستان میں تحریک مزاحمت کی کیا تاریخ ہے، ظاہر شاہ سے لے کر سردار محمد داؤد تک افغان پاک تعلقات کی کیا نوعیت تھی، سردار محمد داؤد نے انقلاب ثور سے پہلے پاکستان، بھارت اور سعودی عرب کا دورہ کیوں کیا تھا، دوبار پاکستان کا دورہ کر کے وہ کیا معاملہ طے کرنا چاہتے تھے، جنرل ضیاء الحق دورہ افغانستان سے کیا حاصل کرنا چاہتے تھے۔ بہت

کم لوگوں کو پتہ ہے کہ جنرل ضیاء الحق کا دورہ افغانستان ہی سردار داؤد کی حکومت کے خاتمے کا فوری سبب بنا۔ جنرل ضیاء الحق نے سردار محمد داؤد کو روسی اثرات سے نکلنے میں مدد نہیں کی۔ سردار داؤد ڈیورنڈلائن کا مسئلہ حل کر کے پاکستان کے ساتھ ایک نئے باب کا آغاز کرنا چاہتے تھے۔ سعودی عرب کا دورہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ وہ دوسرے دورہ پاکستان کے دوران ڈیورنڈلائن کو تسلیم کر کے پاکستان کے ساتھ دوستی کی عمارت کی بنیاد رکھنا چاہتے تھے لیکن جنرل ضیاء الحق نے انہیں ایسا کرنے سے روک دیا اور ان سے وعدہ کیا کہ ان کے (جنرل ضیاء کے) دورہ افغانستان کے دوران یہ اعلان کیا جائے تو بہتر ہو گا۔ سردار داؤد پشتونستان کا مسئلہ بھی ختم کرنا چاہتے تھے لیکن جنرل ضیاء الحق نے یہ معاملہ بھی اپنے دورہ افغانستان تک اٹھائے رکھنے میں عافیت سمجھی۔ اس میں کیا مصلحت تھی یہ تو انہیں ہی پتہ ہو گا لیکن اگر یہ دونوں مسئلے حل ہو جاتے تو افغان حکمرانوں کے پاکستان دشمنی کے من گھڑت افسانے ختم ہو جاتے اور پاک افغان دوستی کا ایک شاندار باب شروع ہو جاتا۔ علاقے میں ایک قوت معرض وجود میں آئی جو روسی وامریکی اثرات کے خلاف موثر دفاع ثابت ہوتی۔ ہماری پشت محفوظ ہو جاتی اور ہم یکسو ہو کر ہندو سامراج کا مقابلہ کرتے۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ اگر ایسا ہو جاتا تو افغانستان اشتراکی افواج کے چنگل میں جانے سے بچ جاتا، ۴۵ لاکھ افراد مہاجر نہ ہوتے، ۱۰ لاکھ شہید نہ ہوتے۔ نجانے کتنے انسان زخمی و مجروح ہونے سے بچ رہتے۔ اگر ایسا ہو جاتا تو پھر جنرل ضیاء الحق کے دور حکمرانی کو طوالت نصیب نہ ہوتی اور وہ شہید افغانستان بھی نہ بن سکتے۔ جنرل ضیاء الحق نے اپنے دورہ افغانستان کے دوران بھی نہ تو ڈیورنڈلائن کے مسئلے کے حل کی طرف کی گئی پیش قدمی کو حتمی شکل دینے کی کوشش کی اور نہ ہی پشتونستان کے حل ہوتے ہوئے مسئلے کو ہمیشہ کیلئے دفن کرنے کی کوشش کی۔ اس طرح انہیں بین الاقوامی سیاسی شطرنج میں اپنی چالیں آگے بڑھانے کا موقع ملا۔ روسیوں نے سردار کو فوری طور پر منظر سے ہٹا دیا اور اس طرح پاک افغان دوستی کا باب شروع ہوتے ہی ہمیشہ کیلئے بند ہو گیا۔ نور محمد ترکئی اور حفیظ اللہ امین بھی جب روسی آدرشوں کے مطابق عمل نہ کر سکے تو روسی افواج ببرک کارمل کو اپنے ٹینکوں پر بٹھا کر کابل لے آئیں۔ اس کے ساتھ ہی دور جدید کی سب سے بڑی ہجرت اور تحریک مزاحمت کا آغاز ہوا۔ روس نے ۸۰ ہزار افواج افغانستان میں داخل کر کے علاقے میں طاقت کا توازن بگاڑ دیا۔ مغربی و اسلامی دنیا میں ہلچل مچ گئی اور ایک ایسے عالمی باب کا آغاز ہوا جس کے سرنامہ پر "روسی افواج کی ہزیمت" درج تھی لیکن اسے بہت کم لوگ پڑھ سکے۔ حتیٰ کہ جنرل ضیاء الحق بھی۔ جنرل ضیاء الحق کو مسئلہ افغانستان کے حوالے سے نہ تو زیادہ معلومات تھی اور نہ ہی افغانستان میں رونما ہونے والے واقعات کے نتائج و عواقب

کاعلم تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں ۲۷ اپریل ۱۹۷۸ء میں انقلاب ثور کے دوران رونما ہونے والے واقعات کا خاص علم بھی نہیں تھا۔ سردار محمد داؤد نے جو ظاہر شاہی دور میں وزیراعظم تھے پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو کے دورِ حکومت میں پاکستان دشمن سرگرمیوں میں ملوث رہے تھے۔ ظاہر شاہ کے دور کے بعد انہوں نے اپنے دور حکومت میں بھی اسی پاکستان دشمنی کو جاری وساری رکھا۔ افغانستان سے ہجرت تو پہلے ہی شروع ہو چکی تھی۔ حکومت پاکستان نے بھی افغان حکومت کے خلاف کام کرنے والے افغانوں کو یہاں خوش آمدید کہا، انہیں منتظم کیا۔ پروفیسر برہان الدین ربانی کو جماعت اسلامی پاکستان نے اور انجینئر گلبدین حکمت یار کو حکمران جماعت پیپلز پارٹی نے سرکاری سطح پر خوش آمدید کہا۔ بھٹو حکومت نے حکمت یار کو اس کی فعالیت کے سبب خوش آمدید کہا تھا کیونکہ افغان حکومتوں کی طرف سے پشتونستان کا شوشہ وقتاً فوقتاً چھوڑا جاتا تھا۔ جب افغانستان میں حکومت کے خلاف ایک ردعمل پیدا ہوا اور انقلابی لوگ ہجرت کر کے یہاں پہنچے تو حکومت پاکستان کو ایک جوابی ہتھیار مل گیا تھا۔ افغان حکومت پر دباؤ ڈالنے اور اسے اپنی حدود تک ہی رکھنے کے لئے انقلابی سرگرمیوں میں ملوث افراد کی پیٹھ ٹھونکنی شروع کر دی۔ گلبدین حکمت یار کیونکہ جوشیلا اور جوان رہنما تھا اس لئے ذوالفقار علی بھٹو نے اس سے قریبی تعلقات قائم کئے اور اس کی حزب اسلامی کو یہاں منظم کرنے میں مدد دی۔ جنرل حمید گل پر ایک الزام یہ بھی لگایا جاتا ہے کہ انہوں نے اپنے فرائض منصبی پر توجہ مرکوز کرنے کی بجائے سیاست بازی بھی شروع کر دی، دائیں اور بائیں بازو کی سیاست میں الجھے اور اس قدر الجھتے گئے کہ حکومتوں کے الٹ پھیر میں بھی نمایاں ہو گئے۔ بے نظیر حکومت کو الٹنے اور نواز شریف حکومت کو پہلے پنجاب اور پھر مرکز تک پہنچانے میں انہوں نے موثر ہی نہیں بلکہ حتمی کردار ادا کیا۔ کچھ لوگ اس کردار کو حمید گل کیلئے باعث شرم قرار دیتے ہیں لیکن حمید گل کو اس کام پر فخر ہے۔ وہ اس خدمت کا صلہ بھی لینا چاہتے تھے۔ پاک فوج کی سربراہی ان کی خواہش تھی لیکن وہ پوری نہ ہو سکی بلکہ انہیں نہ صرف کور کی کمانڈ سے ہٹا دیا گیا بلکہ فوج سے بھی اس طرح رخصت کر دیا گیا کہ پوری قوم انگشت بدنداں رہ گئی۔ جنرل حمید گل اپنے ماضی پر شاداں و فرحاں ہیں۔ انہیں اپنی سیاسی وابستگیوں پر فخر ہے۔ وہ حکومتوں کے الٹ پھیر میں حصہ داری پر نازاں ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ۔ میں نے پاکستانی کے طور پر مسئلہ افغانستان کے حل کی کاوشیں کیں۔ میرا نقطہ نظر پہلے بھی یہ تھا اور اب بھی یہ ہے کہ مسئلہ افغانستان پر پاکستان کو سب سے پہلی لبیک O.I.C نے دی۔ اب جبکہ ہم اس مسئلے کے حل کی حتمی منزل کی طرف بڑھ رہے ہیں تو ہمیں ان ممالک سے مشورہ کرنا چاہئے۔ انہیں اعتماد میں لینا چاہئے۔ اقوام متحدہ کے پانچ نکاتی پروگرام کی بجائے ہمیں برادر

اسلامی ممالک کی طرف ہاتھ بڑھانا چاہئے۔ جتنی امداد امریکہ اور دیگر مغربی ممالک نے ہمیں دی اس سے کہیں زیادہ امداد اکیلے سعودی عرب نے دی۔ اس لئے ہمیں اس کو بھی اعتماد میں لینا چاہئے۔ لیکن ہم بدراہ ہو چکے ہیں۔ ہم نے نجیب اللہ کو گرانے کی کوشش کی تو پہلے روسی اس کے حمایتی بنے رہے' اب امریکی اس کے حامی و ناصر بنے ہوئے ہیں۔ ایران بھی نجیب اللہ کے ساتھ ہے۔ ایران افغان جہاد کے دوران کسی نہ کسی حد تک ہمارے ساتھ نہیں بلکہ مجاہدین کے ساتھ تھا۔ ۱۰ لاکھ مجاہدین کو پناہ دیئے ہوئے تھا لیکن وہ سفارتی و سیاسی کاوشوں میں پاکستان کے ساتھ نہیں رہا۔ جنیوا معاہدے کے وقت بھی اس نے ہماری ہاں میں ہاں نہیں ملائی۔ اب بھی وہ نجیب کے ساتھ ہے۔ ایران کے ہر کولیس طیارے ہر روز غذائی امداد لے کر کابل و ہرات کے ہوائی اڈوں پر اتر رہے ہے۔ ایران اپنے قومی مفادات کے مطابق پالیسی پر عمل پیرا ہیں لیکن ہمارے سفارتی نمائندے امریکہ کے طفیلی بنے پھرتے ہیں لیکن انہیں کچھ نہیں مل رہا ہے ایک سٹیج پر روسی نجیب اللہ کو ہٹانے پر تیار تھے تاکہ افغانستان میں امن و امان قائم ہو جائے۔ لیکن کیونکہ اس طرح مجاہدین کی حکومت کے قیام کی راہیں ہموار ہو جاتیں اس لئے امریکہ نے ایسا نہیں ہونے دیا۔ ہندوستان بھی ایسا ہی چاہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ریگن کے بعد جب جارج بش نے حکومت سنبھالی تو راجیو گاندھی نے انہیں یقین دلا دیا کہ وہ افغانستان میں مجاہدین کی حکومت قائم نہیں ہونے دیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ نے ہندوستان کی امداد شروع کر دی۔ تجارتی اور اقتصادی تعلقات قائم کئے اور انہیں امداد فراہم کی۔ یہ ان کی سفارتکاری اور سیاست بازی کی بہترین مثال ہے کہ انہوں نے بغیر کسی شے کی قربانی دیئے امداد بھی حاصل کی اور ایک سپر طاقت کی حمایت بھی۔ لیکن ہم نے کیا حاصل کیا۔ جنرل ضیاء الحق نے جہاد افغانستان پر IVE STAND لیا۔ امداد ملی لیکن جب مسئلہ افغانستان مجاہدین کے حق میں ہوا' انہیں عسکری کامیابیاں ملنی شروع ہوئیں تو امریکی صدر ریگن نے جنرل ضیاء الحق پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا اور انہیں پازیٹو سٹمری پر آمادہ کر لیا۔ یہ آمادگی افغانستان میں معاہدہ امن ہونے کے باوجود جنگ جاری رکھنے کا بندوبست تھا۔

مجھے معلوم نہیں کہ جنرل ضیاء الحق ایسی شرائط ماننے پر کیسے آمادہ ہو گئے۔ ہمارا سفارتی دفتر' دفتر خارجہ اس معاملے میں بالکل بے حس اور نالائق ثابت ہوا۔ جنیوا امن بات چیت بڑے عرصے سے جاری تھی۔ پھر جب روسیوں نے افغانستان خالی کرنے کا عندیہ دیا تو ہمارے دفتر خارجہ کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ انہیں سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کریں۔ انہوں نے چار انسٹرومنٹ ہی تیار کئے تھے جبکہ افغانستان میں تبدیلی حکومت کا انسٹرومنٹ بالکل غائب تھا۔ روسی بتدریج مفاہمت کی طرف آ رہے تھے۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ ہم ان کی واپسی کے بعد پیدا ہونے والے خلا کو پر کرنے کی

منصوبہ بندی کرتے لیکن ہمارے دفتر خارجہ نے کچھ بھی نہ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ جنیوا معاہدے کے نتیجے میں روسی افواج تو باعزت طور پر واپس چلی گئیں لیکن ۴۵ لاکھ مہاجرین کی اپنے ملک واپسی کا بندوبست نہ ہو سکا۔ کابل پر افغان مجاہدین کی فتح کے جھنڈے نہ گاڑے جا سکے موجودہ روسی قیادت بھی افغانستان میں اپنے مفادات کو دیکھ رہی ہے۔ بورس یلسن نے روس میں کمیونسٹ پارٹی پر پابندی عاید کر دی ہے لیکن افغانستان میں کمیونسٹ پارٹی کی ترجمان وطن پارٹی کی حمایت جاری ہے کیونکہ انہیں معلوم ہے کہ افغانستان میں کمیونسٹوں کے بعد مجاہدین منظر عام پر آجائیں گے جو انہیں منظور نہیں ہے۔ صاحبزادہ یعقوب خان نے بے نظیر دور حکومت میں ملکی مفادات کی بجائے ذاتی پسند و ناپسند کے تحت کام کیا۔ انہوں نے اپنے طویل دور وزارت میں خارجہ محاذ پر پاکستان کو سرخرو نہیں کیا بلکہ امریکی پالیسیوں کو (TOE) کر چلتے رہے۔ اس لئے جب روسی فوجوں کی واپسی یقینی ہو گئی اور امریکی مفادات پورے ہو گئے پھر جب افغان عوام کی بات ہونے لگی تو صاحبزادہ صاحب کے پاس کچھ نہیں تھا۔ بے نظیر دور حکومت میں انہوں نے بے نظیر کو زچ کئے رکھا۔ حکومت کی افغان پالیسی کے خلاف بیان دیئے اور بے یقینی پیدا کر دی۔ فرانس کے ساتھ ۹۰۰ میگاواٹ کے ایٹمی پلانٹ کے حوالے سے معاہدے کا مشورہ ان کے پاس پہنچا تو انہوں نے ۹ ماہ تک اسے دبائے رکھا۔ کیونکہ اگر اس معاہدے پر دستخط ہو جاتے تو اس کا کریڈٹ بے نظیر کو ملتا جو صاحبزادہ کو پسند نہیں تھا۔ میں نے یکسوئی سے افغان مجاہدین کی کامرانی کے لئے منصوبہ بندی کی۔ ان کے کاز کو اپنا کاز سمجھا اور انہیں فاتح بنانے کی کوشش کی لیکن بے نظیر حکومت نے میرے ساتھ تعاون نہیں کیا۔ امریکی بھی مجاہدین کی فتح کے مخالف تھے۔ انہوں نے بھی ایڑی چوٹی کا زور لگایا کہ مجاہدین فاتح کی صورت میں نہ ابھر سکیں۔ حتیٰ کہ افغان مجاہدین کی صفوں میں بھی نقب لگائی۔ آپریشن جلال آباد کے دوران میں نے وزیر اعظم بے نظیر سے درخواست کی کہ مجاہدین کی کمک کا بندوبست کیا جائے لیکن وہ نہ مانیں بلکہ پائپ لائن میں موجود امداد بھی روک دی۔ مجاہدین کئی روز تک جلال آباد کے مضافات میں کمک کے منتظر رہے لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ آفندی کے کمانڈر ثمر خیل تک پہنچ چکے تھے۔ میں نے حکمت یار سے درخواست کی کہ خدا کیلئے اگر اب جلال آباد پر یلغار حتمی مراحل میں پہنچ چکی ہے اور مجاہدین تمہارے بغیر فتح نہیں کر سکتے تو وہ بھی اس معرکے میں شامل ہو گئے لیکن حکمت یار کی شمولیت سے آفندی کے کمانڈر شاید ناراض ہو گئے اس لئے انہوں نے گڑبڑ شروع کر دی۔ وہ پہلے بھی امریکیوں کے زیر اثر ہی لڑ رہے تھے۔ اب انہوں نے ہماری INSTRUCTIONS کو بھی OVER-LOOK کرنا شروع کر دیا۔ میں نے انہیں جن راستوں کو کاٹنے کا کہا تھا تاکہ کابل انتظامیہ کی کمک محصور فوج

تک نہ پہنچ سکے وہ راستے انہوں نے کھلے چھوڑے رکھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جلال آباد میں مقیم فوج کو تو کمک ملتی رہی لیکن مجاہدین پٹرول کی بوند اور ایک ایک گولی کو ترستے رہے۔ دراصل آپریشن جلال آباد نام کی کوئی منصوبہ بندی ہم نے نہیں کی تھی بلکہ مجاہدین خود بخود فتح کی سمت چل نکلے تھے۔ کچھ امریکیوں نے جان بوجھ کر انہیں اس رستے پر ڈالا تھا۔ بے نظیر حکومت نے بھی یہ پابندی عاید کی تھی کہ جب تک مجاہدین کوئی بڑی کامیابی حاصل نہیں کر لیتے اس وقت تک ان کی حکومت کو تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ میں نے محترمہ سے کہا کہ کیا فلسطینیوں نے کسی بڑے علاقے پر قبضہ کیا تھا یا انہیں اسرائیل کے مقابلے میں کوئی بڑی فتح حاصل ہوئی تھی کہ دنیا نے فلسطین کی حکومت کو تسلیم کیا' یاسر عرفات کو فلسطینیوں کا رہنما تسلیم کیا' حالانکہ دیگر کئی لیڈر بھی موجود تھے لیکن بے نظیر صاحبہ نے ہنس کر ٹال دیا۔ سعودی حکمرانوں نے اس مسئلے پر مجاہدین کی عبوری حکومت کا ساتھ دیا اسے تسلیم کیا اور تقویت پہنچانے کی کوشش کی لیکن اس مسئلے پر پاکستان کا رویہ منفی رہا۔ ہم لوگوں نے یہاں افغان مجاہدین کی چپقلشوں کا بڑا چرچا سنا ہے ہمارا حکمران طبقہ خواہ وہ سول بیوروکریسی میں ہو یا یونیفارم میں' مجاہدین کی صفوں کے درمیان بے ترتیبی کا بڑا ذکر کرتا ہے لیکن دنیا نے دیکھا کہ افغانوں نے مشترکہ موقف اختیار کیا۔ ۲۷ دسمبر ۱۹۷۹ء سے لے کر عبوری حکومت کے قیام تک اور اس کے بعد بھی اب تک کلی معاملات پر مجاہدین کا موقف یکساں رہا ہے۔ جزوی معاملات پر اختلافات کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے۔ روسی افواج کے انخلا کے بعد جہاد دشمنوں نے خوب پروپیگنڈہ کیا کہ اب مجاہدین اکٹھے نہیں رہ سکیں گے لیکن سب نے دیکھا کہ ۲۴ فروری ۱۹۸۹ء کو افغان مجاہدین نے مشترکہ موقف کے تحت عبوری حکومت قائم کی۔ دشمنوں کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ انہوں نے بڑی فتح کے بارے میں پروپیگنڈہ کیا۔ پاکستانی حکومت اور امریکیوں نے جلال آباد کی فتح کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کر کے مجاہدین کے مورال کو کم کرنے کی کوشش کی۔ سعودی عرب نے عبوری حکومت کو تسلیم کیا لیکن پاکستان ایسا کرنے سے باز رہا' بلکہ نصرت بھٹو صاحبہ نجیب اللہ کو پیغام بھجواتی رہیں کہ اسے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجاہدین کی حکومت افغان حکومت کی جگہ نہیں لے سکے گی' کیونکہ پاکستان اسے تسلیم نہیں کرے گا اور ایسا ہی ہوا۔ افغان عبوری حکومت انہوں کی سازشوں کا شکار ہو گئی۔ صاحبزادہ یعقوب خان کا کردار بھی اس سلسلے میں منفی ہی رہا۔ محمد خان جونیجو کے دور حکومت سے ہی افغان مسئلے پر پالیسی میں گڑبڑ ہو گئی تھی۔ جونیجو صاحب جمہوریت کے چیمپئن بننے کے چکر میں جنرل ضیاء الحق کو نظرانداز کرتے چلے جا رہے تھے۔ پروموشنوں کے مسائل سے لے کر جنیوا معاہدے پر دستخطوں تک انہوں نے مفاہمت کی بجائے خاصمت کی پالیسی اختیار کئے رکھی۔ جنرل ضیاء الحق نے کئی موقعوں پر جونیجو صاحب کو سمجھانے بجھانے کی کوشش کی۔ مثلاً

جنرل ضیاء الحق جنرل پیرداد کی پروموشن کرنا چاہتے تھے۔ ان کے خیال میں اس طرح پاک فوج کی صف اول میں ایک کہنہ مشق جرنیل کا اضافہ ہو جاتا لیکن محمد خان جونیجو ذاتی یا دیگر وجوہات کی بنیاد پر ان کی پروموشن کے خلاف تھے۔ دوسری طرف محمد خان جونیجو شمیم عالم کو پروموٹ کرنا چاہتے تھے جو ضیاء الحق کو پسند نہیں تھا۔ بالآخر دونوں ہی پروموٹ ہو گئے۔ اس طرح جب دو متحارب اقتدار کے مراکز قائم ہوں تو نتیجہ بہتر نہیں نکل سکتا تھا۔ ایسا ہی ہوا' ۲۹ اگست ۱۹۸۸ء جونیجو صاحب رخصت کر دیئے گئے۔ امریکیوں نے جونیجو کو خوب استعمال کیا۔ ۱۹۸۷ء میں روسی افواج کے اعلان انخلا کے بعد ایک ایسی صورتحال پیدا ہو گئی تھی جسے پاکستان اور افغان مجاہدین کے کاز کے لئے بہتر انداز میں استعمال کیا جا سکتا تھا لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ افغانستان سے روسی افواج کے انخلا کے بعد امریکیوں کے مقاصد تو پورے ہو گئے تھے' وہ افغانستان میں مجاہدین کی حکومت قائم نہیں ہونے دینا چاہتے تھے سو انہوں نے ایسا ہی کیا۔ افغانستان سے روسی افواج کی واپسی کے بعد امریکیوں کے نزدیک پاکستان کی اہمیت بھی کم ہو گئی ہے سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے ریسرچ سیل میں پہلے پاکستان ویسٹ ایشین ممالک میں تھا اب اسے ساؤتھ ایشین ممالک کی صف میں لا کھڑا کیا گیا ہے۔ امریکہ کی اب پاکستان سے دلچسپی اس حد تک ہے کہ اسے وسط ایشیا سے دور رکھا جائے کیونکہ پاکستان کے وسط ایشیائی تعلقات سے نو آزاد مسلم ریاستوں کو سیاسی اور فوجی تقویت ملنے کا امکان موجود ہے۔ ایران نے ان ممالک سے تعلقات قائم کر کے علاقے میں اپنی بالادستی کے منصوبے پر عمل پیرا ہونے کا اعلان بھی کر دیا ہے۔ امریکہ اس منصوبے کے راستے میں پاکستان کی بجائے ترکی کو آگے لانا چاہتا ہے کیونکہ ترکی سیکولر بھی ہے اور وسط ایشیائی ریاستوں کے لئے زیادہ قابل قبول بھی۔ پاکستان کو مسئلہ افغانستان میں الجھائے رکھ کر امریکہ اپنے مہرے آگے بڑھاتا رہے گا۔ افغانستان کا مسئلہ انتقال اقتدار کا نہیں بلکہ شرکت اقتدار کا ہے۔ اسے اس نقطہ نظر سے حل کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ اوجھڑی کیمپ کا حادثہ در حقیقت غلط منصوبہ بندی کا نتیجہ تھا۔ کیمپ دراصل غلط جگہ پر قائم کیا گیا تھا اور اس کی منصوبہ بندی بھی ناقص تھی۔ میں نے آئی ایس آئی کا چیف بنتے ہی اس کیمپ کو نئی عمارات میں منتقل کرنے کی منصوبہ بندی شروع کر دی تھی۔ کچھ نئی عمارتیں تعمیر بھی ہو چکی تھیں۔ جونیجو صاحب کو ان عمارتوں کا دورہ بھی کروایا جا چکا تھا کہ حادثہ ہو گیا۔ اسی دوران چترال اور کوئٹہ میں بھی اسلحے کے کیمپوں میں آگ لگی اور وسیع پیمانے پر نقصان ہوا۔ میں اس سارے قصے کا ذمہ دار نہیں تھا لیکن کیونکہ یہ کیمپ آئی ایس آئی کی کمان میں آتے تھے اس لئے میں نے ۱۰ تاریخ...... کو اپنا استعفیٰ وزیر اعظم کو پیش کر دیا۔ پوری قوم سراپا احتجاج بنی ہوئی تھی وہ حادثے کی وجوہات جاننا چاہتی تھی۔ جونیجو صاحب بھی بار بار اعلان کر رہے تھے کہ ذمہ داران کو کیفر کردار تک پہنچایا جائے گا۔ اس لئے میں نے اپنے آپ کو ہر کورٹ

آف انکوائری کے آگے پیش کرنے کیلئے تیار کیا۔ استعفیٰ دیا لیکن جونیجو صاحب کے ارادے کچھ اور تھے۔ وہ اس قصے میں جنرل اختر عبدالرحمٰن کو پھنسانا چاہتے تھے۔ اس طرح جنرل ضیاء الحق کو نیچا دکھانا مطلوب تھا کیونکہ جنرل اختر ہی ضیا کے سارے عرصہ اقتدار میں ان کے دست و بازو بنے رہے تھے اس لئے وہ جنرل اختر کو پھنسا کر ضیاء الحق کو کمزور کرنا چاہتے تھے۔ میں اس کھیل کا حصہ بننے کو تیار نہیں ہوا اس لئے جونیجو صاحب اپنے منصوبوں میں کامیاب نہ ہو سکے۔ میں بنیادی طور پر جونیجو صاحب کے اس منصوبے کو ملکی مفادات کے خلاف سمجھتا تھا اس لئے خود قربانی کا بکرا بننے کیلئے انہیں اپنا استعفیٰ پیش کر دیا۔ لیکن جونیجو صاحب نے میرا استعفیٰ نامنظور کر دیا۔ جنرل عمران اللہ کمیٹی بنی اس کی رپورٹ کا مطالعہ کر کے بھی حقائق تک پہنچا جا سکتا ہے کہ اوجھڑی کیمپ کے حادثے کا ذمہ دار کون ہے۔ میں اس وقت ان تفصیلات میں نہیں جانا چاہتا۔

۱۷ اگست ۱۹۸۸ء میں جب C-130 کا حادثہ ہوا تو سیاستدان مرغی کے چوزوں کی طرح ادھر ادھر بھاگ رہے تھے پیپلز پارٹی کی قوت کا مقابلہ کرنے کا کسی میں حوصلہ نہیں تھا' بڑے بڑے سیاستدان مارشل لاء کی امید لگائے بیٹھے تھے۔ اگر اس وقت ہم جمہوریت کیلئے تگ و دو نہ کرتے تو شاید آج نواز شریف وزیر اعظم اور بے نظیر اپوزیشن لیڈر نہ ہوتیں۔ ہم نے نواز شریف یا کسی اور کے لئے نہیں بلکہ ملک کے وسیع تر مفاد کیلئے اسلامی جمہوری اتحاد قائم کیا۔ کیڑوں مکوڑوں کی طرح بکھرے ہوئے سیاست دانوں کو اکٹھا کیا اور پی پی پی کی انتقامی و طوفانی لہر کے سامنے کھڑا کیا۔ اس پورے پراسس میں ہمیں صدر اسحاق خان کا تعاون حاصل رہا و گرنہ سیاستدان تو نالائق تھے۔ وہ بے نظیر کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ بے نظیر کے راستے میں اگر آئی جے آئی کھڑی نہ ہوتی تو وہ بھی تمام پارلیمانی و قانونی روایات کو پامال کرتے ہوئے انتقامی سیاست کو ایسا فروغ دیتیں کہ بس اللہ حافظ ہی ہو جاتا۔ ہم نے ملک کے وسیع تر مفادات کی خاطر جمہوریت قائم اور جاری رکھنے کیلئے جمہوری اتحاد بنوایا اور مجھے اس سروس پر اب بھی بجا طور پر فخر ہے کہ جمہوریت کی گاڑی چل رہی ہے۔ حکومتیں پر امن طریقے سے تبدیل ہو رہی ہیں الیکشن بھی ہو رہے ہیں۔ جنرل حمید گل کی فوج سے رخصتی بڑے عجیب و غریب انداز میں ہوئی۔ اس پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد انہیں جس انداز میں پیش کیا گیا اس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ جیسے فوج میں اب کوئی اور محب وطن اور جہاد افغانستان سے دلچسپی رکھنے والا رہ نہیں گیا ہے۔ حمید گل "اسلامی فوج" کے آخری مسلمان جرنیل تھے۔ بات دراصل یہ ہے کہ سیاسی خدمات سرانجام دینے' ۱۷ اگست ۱۹۸۸ء کے بعد آئی جے آئی بنوانے' مرکز میں بے نظیر حکومت کے خلاف سرگرمیاں اور بالآخر بے نظیر حکومت کے خلاف تحریک عدم اعتماد جیسی خدمات کے باعث وہ نواز شریف سے واضح طور پر یہ توقع رکھتے تھے کہ وزارت عظمیٰ تک پہنچنے کے بعد انہیں بھی ان کی

بے لوث خدمات کا صلہ ملے گا۔ وہ افواج پاکستان کی سربراہی کے امیدوار تھے 'ان کا نام زیر غور بھی تھا لیکن قرعہ فال آصف نواز جنجوعہ کے نام نکل آیا۔ یہ حمید گل کے لئے ایک دھچکا تھا۔ وہ ذہنی طور پر یہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ انہیں نظر انداز کر دیا جائے گا۔ پھر انہیں آئی ایس آئی سے ہٹا کر کور کمانڈ کرنے پر لگا دیا گیا۔ ابھی وہ اس نئے صدمے سے جانبر ہو بھی نہیں سکے تھے کہ انہیں ہیوی ری بلڈ فیکٹری ٹیکسلا پہنچنے کا حکم دیا گیا۔ انہوں نے اسے "کھڈے لائن" تصور کیا اور ایچ آر ایف کا چارج سنبھالنے کی بجائے وزارت دفاع میں چلے گئے اور قانونی کارروائی شروع کی ابھی یہ سلسلہ جاری تھا کہ انہیں فوج سے "فراغت نامہ" موصول ہو گیا۔ اس حوالے سے وہ خاصے تلخ بھی ہوئے۔ ان کا کہنا ہے کہ "میری ریٹائرمنٹ کا فیصلہ غلط ہے اس سلسلے میں وزیر اعظم کو اعتماد میں نہیں لیا گیا۔ ایچ آر ایف کی سربراہی کیلئے فوج کی طرف سے تین افراد کے نام پیش کئے جاتے ہیں 'پھر وزارت دفاع ان میں سے ایک شخص کو چنتی ہے لیکن یہاں معاملہ ہی الٹ ہوا 'صرف میرا نام ہی پیش کیا گیا۔ پیش ہی نہیں کیا گیا بلکہ نامزد ہی کر دیا گیا جو روایات کے خلاف تھا۔ میں نے وزارت دفاع کی رپورٹ کو اور قائدے کے مطابق اپنا LETTER OF GRIEVANCE وزیر اعظم کو ارسال کیا اور اس کے جواب کے انتظار میں وہاں بیٹھا رہا۔ میں ایک دن بھی ڈیوٹی سے غیر حاضر نہیں ہوا 'وردی پہن کر وزارت دفاع میں بیٹھتا رہا 'میں نے حکومت کو اپنے حالات سے آگاہ کیا 'مجھے کچھ لوگوں نے کہا کہ ایچ آر ایف جیسے قومی اہمیت کے حامل ادارے کو تمہارے جیسے لوگوں کی ضرورت ہے 'وہاں الخالد ٹینک کی تیاری ہونی ہے تم بہتر انداز میں دیکھ بھال کر سکو گے۔ میں نے انہیں کہا کہ میری بیوی کینسر کی مریضہ ہے 'میری سروس چھ ماہ بعد ختم ہونے والی ہے 'الخالد ٹینک ۱۹۹۶ء میں مکمل ہو گا میں ان چھ ماہ میں اس سلسلے میں زیادہ ممد و معاون ثابت نہیں ہو سکتا ہوں۔ میں نے اپنی بیوی کے علاج کیلئے چھٹی حاصل کرنے کی درخواست بھی دے رکھی تھی لیکن مجھے ایچ آر ایف کیلئے نامزد کر دیا گیا۔ حکومت کو ایک پینل تجویز کرنے کی بجائے مجھے ایچ آر ایف کیلئے اپوائنٹ کر دیا گیا۔ یہ بات سراسر غلط تھی۔ میں نے اس کے جواب میں ایک قانونی طریقہ اختیار کیا لیکن اس کے باوجود مجھے زبردستی فوج سے فارغ کر دیا گیا۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ مجھے اگر مکینک ہی بننا تھا تو میں فوج میں شرکت کا فیصلہ نہ کرتا۔ میں نے اعلیٰ آدرشوں کے مطابق فوج میں خدمات سرانجام دیں ' مجھے ان پر فخر ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اگر میں وہ کچھ نہ کرتا جو میری پیشہ وارانہ زندگی کا روشن باب ہے تو آج ملک میں کچھ اور ہی ہوتا جمہوریت کی گاڑی نہ چل رہی ہوتی۔ بات دراصل یہ ہے کہ خلیجی جنگ کے دوران ہی بہت سے فیصلے ہو گئے تھے۔ بڑے پیمانے پر پالیسیوں میں تبدیلیوں کا فیصلہ کر لیا گیا تھا۔ میری ریٹائرمنٹ سے پہلے سینٹ کے چیئرمین وسیم سجاد نے امریکہ کا دورہ کیا '

پھر آرمی چیف جنرل آصف نواز امریکہ گئے' یہ دورہ سفارتی نوعیت کا تھا' کانگریس کے ممبر بارکفیلمو سے بھی ملے' انہوں نے اپنے با اختیار ہونے کا ثبوت دینے کیلئے مجھے ریٹائر کرنے کا فیصلہ کیا' انہوں نے امریکیوں کو یقین دھانی کروائی کہ افغان پالیسی ان کی مرضی کے مطابق ہی ہو گی ثبوت کے طور پر میری سبکدوشی کا پروانہ پیش کر دیا گیا۔ ویسے تو یہ فیصلہ کافی عرصہ پہلے ہو گیا تھا اور اس فیصلے کے اعلان کیلئے مناسب وقت کا انتظار تھا۔ اس اعلان کے سلسلے میں صرف "ٹائمنگز" غلط ہوئے اور آصف نواز کا دورہ امریکہ کے ساتھ ہی یہ فیصلہ منظر عام پر آ گیا اور اس سے تاثر یہ پیدا ہوا کہ جیسے یہ سب کچھ امریکہ کے اشارے پر ہوا ہے اور ابھی ابھی ہوا ہے۔ حالانکہ یہ فیصلہ خلیجی جنگ کے دوران یا اس کے فوراً بعد ہو گیا تھا بس اس کا اعلان ہونا باقی تھا۔ میری جبری ریٹائرمنٹ کی تین وجوہات ہیں جو میں کسی مناسب وقت پر قوم کے سامنے رکھوں گا' فی الوقت خاموشی ہی بہتر ہے۔ "مسئلہ افغانستان پر بہت سے لوگوں کے کردار کے متعلق تحقیقات کی ضرورت ہے۔ بہت سے لوگ طویل عرصے تک اس مسئلے کے کرتا دھرتا بنے رہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ مسئلہ ابھی تک حل کیوں نہیں ہو پایا۔ نہ تو سفارتی محاذ پر ہمیں کامیابی حاصل ہوئی ہے اور نہ ہی مجاہدین کو عسکری محاذ پر کامیاب ہونے دیا گیا ہے۔ اس میں محمد خان جونیجو کا بھی ہاتھ ہے۔ وزارت خارجہ کا کردار بھی زیادہ قابل ستائش نہیں ہے۔ روئیداد خان جیسے لوگ تیرہ سال تک ضیاء الحق' جونیجو اور پھر بے نظیر دور تک حکومتی دھڑے میں شامل رہے۔ آخر انہوں نے کیا کیا۔ اس کے بعد اے این پی میں چلے گئے۔ یہ خمیر کے اعتبار سے اے این پی کے ہی تھے۔ حکومت میں رہ کر انہی کے مفادات کی نگرانی کرتے رہے جب حکومتوں کے الٹ پھیر ہوئے اور نئی دھڑے بندیاں قائم ہوئیں تو وہ چھلانگ لگا کر اپنے اصلی مقام تک پہنچ گئے۔ کسی نے آج تک انہیں یہ نہیں پوچھا کہ وہ اپنے عرصہ حکمرانی میں کیا کرتے رہے ہیں۔ اگر انہوں نے اے این پی میں ہی جانا تھا تو ضیاء الحق کے ساتھ رہ کر کیا حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اگر وہ ضیاء الحق کی پالیسیوں کے دلدادہ تھے تو اب اے این پی میں کیوں چلے گئے ہیں۔ میں نے اپنے آپ کو پہلے بھی احتساب کے لئے پیش کیا تھا اب بھی حاضر ہوں۔ اگر کسی کو میری حب الوطنی پر شک ہو تو بندہ حاضر ہے۔

مسئلہ افغانستان کے اہم کردار

تعمیر و تخریب کے حوالے سے اہم افغان لیڈروں اور جماعتوں کا تعارف

264

محمد ظاہر شاہ

۷۳ - ۱۹۳۳ء

برطانوی استعماری طاقت کے خاتمے کے بعد جب افغانستان میں نادر شاہ کی بادشاہی قائم کی گئی تو ایسا محسوس ہونے لگا کہ جیسے اب افغانستان میں تعمیر وترقی کا دور لوٹ آئے گا۔ پایہ تخت کے زوال کے بعد یہاں پھیلتی ہوئی انارکی اور تخریبی سرگرمیوں کے باعث حالات دگرگوں ہو گئے تھے۔ نادر شاہی ریاست کے معرض وجود میں آنے سے بہتری کی صورت پیدا ہونے لگی کیونکہ نادر شاہ کا تعلق سابق حکمران خاندانوں سے تھا۔ اس کے علاوہ تربیت یافتہ فوج میں بھی اس کی حمایت موجود تھی۔ یورپی ممالک کی طویل سیاحت اور وہاں کے مختلف اداروں سے تربیت حاصل کرنے کے بعد نادر شاہ کے اندر کسی حد تک "آزادروی" پیدا ہو گئی تھی جو مغربی سفارتی حلقوں میں اس کی ذاتی مقبولیت کا سبب بن گئی تھی۔ لیکن روایتی افغان معاشرے میں اسی قدر اس کی مخالفت بھی موجود تھی یہی وجہ ہے کہ تخت شاہی پر برا جمان ہونے کے دو سال بعد ہی سکول کے ایک طالب علم نے نادر شاہ کو قتل کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی ۱۹۳۳ء میں اس کے تیرہ سالہ بیٹے محمد ظاہر شاہ کو تخت پر بٹھایا گیا۔ ظاہر شاہ نے چالیس سال تک افغانستان پر حکومت کی۔ اپنے چچاؤں اور عم زادوں کے ذریعے ظاہر شاہی کو مظبوط اور مربوط رکھنے کی کوشش کی۔ ظاہر شاہ نے اقوام مغرب کے ساتھ ساتھ 'روس کے ساتھ بھی تعلقات استوار کرنے کی کوشش کی۔ جنگ عظیم دوم کے دوران کسی کا حلیف اور کسی کا حریف بننے کی بجائے "غیر جانبدارانہ رویہ" اختیار کیا۔ اس طرح تمام طاقتوں سے افغانستان کی تعمیر وترقی کے لئے امداد حاصل کی۔ لیکن اسی دور شاہی میں سیکولرازم کے زیر سایہ اشتراکی تحریک نے پر پرزے نکالے اور پھر اس کا سایہ اقتدار کے ایوان تک جا پہنچا۔ ۱۹۷۳ء میں ظاہر کے ایک عم زاد اور سابق وزیر اعظم سردار محمد داؤد خان نے فوجی انقلاب کے ذریعے ظاہر شاہی کا بوریا بستر گول کر کے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ افغانستان کا بادشاہ اس وقت علاج معالجے کی غرض سے روم میں مقیم تھا اور اس کے بعد اب تک یہی ملک اس کا مسکن بنا رہا ہے۔

266

سردار محمد داؤد خان

۱۹۵۳ء - ۶۳
۱۹۷۳ء - ۷۸

۱۹۵۳ء میں ماسکو نواز نوجوانوں کی تنظیم ''ینگ افغان'' نے قصر شاہی میں وزیر اعظم شاہ محمود خان کی حکومت کے خلاف زبردست مظاہرہ کیا اور اسے ایک بغاوت کی شکل دے کر شاہ محمود کی معزولی اور ظاہر شاہ کے رشتے دار اور ملٹری کالج کے ساتھی داؤد خان کو وزیر اعظم بنانے کا مطالبہ کیا۔ ۱۹۵۳ء میں داؤد کے وزیر اعظم بننے کے بعد افغانستان میں روس نواز حلقے خاصے فعال ہوگئے' بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ افغانستان کے روسی حلقہ اثر میں جانے کی منظم ابتدا داؤد خان کے دور وزارت میں ہوئی۔ سردار داؤد کا یہ دور ۱۹۶۳ء تک قائم رہا۔ اسی دور میں پشتونستان کا مسئلہ بڑے زور وشور سے اٹھایا گیا اور پاکستان کے خلاف باقاعدہ محاذ آرائی بھی اسی دور میں شروع ہوئی۔ اسی دور میں افغانستان روسی اشیا سب سے بڑی منڈی بن گیا تھا۔ روس کے ساتھ بڑھتے ہوئے تعلقات سے مغربی ممالک بدک گئے۔ اس لیے داؤد کو ۱۹۶۳ء میں وزارت عظمیٰ سے ہٹا دیا گیا۔ ۱۹۷۳ء میں داؤد نے افغان فوج کے کمیونسٹ افسروں کے ساتھ مل کر ظاہر شاہی کا خاتمہ کر کے افغانستان کو جمہوریہ بنانے کا اعلان کر دیا۔ اس وقت اسے ماسکو نواز قرار دیا جاتا تھا لیکن پھر آہستہ آہستہ اس نے مسلم ممالک اور مشرق وسطیٰ کے ساتھ اپنے تعلقات قائم کرنے شروع کئے۔ حتیٰ کہ پاکستان کے ساتھ بھی دوستانہ تعلقات قائم کرنے کی کاوشیں شروع کیں۔ پاکستان کے وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو اور بعد میں جنرل محمد ضیاء الحق کے ساتھ ملاقاتیں اسی سلسلے کی کڑیاں تھیں۔ سعودی عرب کا دورہ بھی ''ماسکووی عناصر کے جال'' سے نکلنے کی کاوش تھی جسے روس نے پسند نہیں کیا۔ حتیٰ کہ ۱۹۷۸ء میں پیپلز ڈیمو کریٹک پارٹی آف افغانستان نے داؤد کے خلاف ایک خونی انقلاب برپا کر دیا۔ صدارتی محل میں اسے اس کے خاندان کے قریبی افراد سمیت قتل کر دیا گیا۔ یاد رہے پی ڈی پی اے یہاں کی کمیونسٹ پارٹی تھی۔ سردار داؤد کمیونسٹوں کے ساتھ اشتراک عمل کے ذریعے ہی اقتدار میں آئے اور انہی کے ہاتھوں اقتدار سے معزول ہو کر قتل بھی کر دیے گئے۔

267

نور محمد ترکئی

۱۹۷۸۔۷۹ء

۲۷ر اپریل ۱۹۷۸ء کو جس انقلاب کے ذریعے محمد داؤد کو منظر سے ہٹایا گیا اسے کمیونسٹوں نے انقلاب ثور کا نام دیا۔ انقلاب کی کامیابی کا اعلان کرتے ہوئے "عوامی جمہوریہ افغانستان" میں عوامی دور کے آغاز کی نوید سنائی گئی اور انقلابیوں نے اپنے کمیونسٹ ہونے کی تردید بھی کی۔ نور محمد ترکئی نے اعلان کیا کہ مملکت کی آئندہ پالیسیاں افغان نیشنل ازم کی بنیاد پر تشکیل پائیں گی۔ داخلی امور میں اسلامی اقدار کی پاسداری اور خارجہ امور میں غیر جانبداری برقرار رکھنے کا اعلان بھی کیا گیا۔ پی ڈی پی اے کے پرچمی اور خلقی دھڑوں نے مل کر ۳۵ رکنی انقلابی کونسل تشکیل دی اور پھر اس کونسل نے نور محمد ترکئی کو چیئرمین کونسل اور مملکت کا وزیر اعظم چنا۔ اس کے علاوہ پارٹی کی جنرل سیکریٹری شپ بھی نور محمد کے پاس ہی رہنے دی گئی۔ اس کونسل میں نور محمد ترکئی اور ببرک کارمل کے علاوہ ارکان نظریاتی اور عملی سیاست میں زیادہ قد آور نہیں تھے لیکن ان کا تعلق مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تھا۔ انقلاب ثور بھی افغان فوج کے کمیونسٹ افسران کی مدد سے ہی برپا کیا گیا تھا۔ نور محمد ترکئی کے دور حکومت میں "خون آشامی" نے نئے نئے گل کھلانے شروع کر دیے اس دور میں "شخصی آمریت" کو بڑی شدت سے نافذ کرنے کی کوشش کی گئی حکمران کے الفاظ قانون کی شکل میں ڈھل کر افغان عوام پر قہر و جبر کی صورت میں نازل ہونے لگے۔ اسی دور میں قومی اور اسلامی تحریک مزاحمت بھی اسی شدت سے ابھرنے لگی جس شدت سے نور محمد ترکئی کے مظالم بڑھتے گئے۔ اسی مزاحمتی تحریک کو کچلنے کے مسئلے پر "انقلابیوں" کے درمیان اختلافات پیدا ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ نور محمد ترکئی کے دست راست اور کونسل میں نائب وزیر اعظم اور وزیر خارجہ کے عہدے پر متمکن حفیظ اللہ امین نے ستمبر ۱۹۷۹ء میں ترکئی قتل کر کے انقلابی کونسل کی کمانڈ خود سنبھال لی۔ ترکئی دور میں ہی امریکی سفیر کو اغوا کر کے قتل کر دیا گیا تھا جس کا الزام ترکئی نے "تحریک مزاحمت" پر لگا دیا۔ اس قتل پر احتجاج کے طور پر جمی کارٹر نے افغان حکومت کو بھیجی جانے والی امداد روک دی تھی۔

268

حفیظ اللہ امین

ستمبر ۱۹۷۹ء تا دسمبر ۱۹۷۹ء

اقتدار پر قبضہ کرنے کے بعد حفیظ اللہ امین نے اعلان کیا کہ "روس انقلاب کی حفاظت کرے گا"۔ حفیظ اللہ امین کو "سب سے زیادہ" خون آشام اور طاقتور شخصیت" سمجھا جاتا تھا۔ داؤد کے خلاف فوجی انقلاب اور پھر قتل کے پورے منصوبے کی نگرانی بھی حفیظ اللہ امین ہی نے کی تھی۔ نور محمد ترکئی کے دور میں بننے والی تمام پالیسیاں بھی حفیظ اللہ امین کے مشوروں سے ہی ترتیب پاتی رہیں۔ ببرک کارمل اور دیگر پرچمی لیڈروں کو بھی اسی کے مشوروں سے بیرون ممالک سفارتی عہدوں پر تعینات کیا گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ حفیظ اللہ امین نے اقتدار سنبھالنے کے بعد ان لوگوں کو واپس بلانے کا فیصلہ کیا تو انہوں نے انکار کر دیا۔ حفیظ اللہ امین کے دور کے شروع ہوتے ہی روسی مشیر فوجی اور بھاری اسلحہ سے لدے ہوئے جہاز کابل پہنچنے لگے۔ اس کے ساتھ ہی مزاحمتی تحریک کو کچلنے کے لیے فوجی آپریشن شروع ہو گیا۔ روسی اسلحہ سے لدے افغان طیارے روسی مشیروں کے طے کردہ اہداف کو نشانہ بنانے لگے۔ پاکستان اور ایران پر مزاحمتی تحریک کی پشت پناہی کے الزامات لگنے شروع ہو گئے۔ تحریک مزاحمت بھی زیادہ قوت سے ابھرنے لگی۔ اور جلد ہی یہ واضح ہو گیا کہ مزاحمتی تحریک کو اتنی آسانی سے نہیں کچلا جا سکتا ہے۔ کمیونسٹوں کا سب سے طاقتور مہرہ بھی پٹ چکا تھا۔

تین ماہ بعد ہی کے جی بی کے خصوصی "ڈیتھ سکاڈ" نے اس مہرے کو بھی اگلے جہاں پہنچا دیا۔ اس طرح "بالواسطہ نفوذ پذیری" INDIRECT PENETRATION کی پالیسی ترک کر کے براہ راست مداخلت کی پالیسی اختیار کی گئی۔

269

ببرک کارمل

دسمبر ۱۹۷۹ء تا مئی ۱۹۸۶ء

حفیظ اللہ امین کو منظر سے ہٹانے کے بعد ببرک کارمل کو کابل میں مسند اقتدار پر بٹھایا گیا اور اس کے ساتھ ہی "معاہدہ دوستی" اور "حفاظتی اقدامات" کی آڑ میں روسی فوجیں افغانستان میں داخل ہونے لگیں۔ نور محمد ترکئی اور حفیظ اللہ امین جو کام نہیں کر سکے تھے، ببرک کارمل سے وہی کام لینے کا منصوبہ بنایا گیا تھا۔ اس دفعہ "ببرک کارمل" کا یہ اعلان بھی نشر کیا گیا کہ "روسی افواج کارمل حکومت کی درخواست پر بیرونی مداخلت کاروں کے خلاف کاروائیوں کے لیے یہاں آئی ہیں"۔ حالانکہ یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ روسی افواج پہلے یہاں آنا شروع ہوئیں اور ببرک کارمل کو بعد میں ماسکو سے یہاں لاکر حکومت سونپی گئی۔ حتیٰ کہ "کارمل کا نشر کردہ بیان" بھی ماسکو ہی میں ریکارڈ کیا گیا تھا جسے کابل سے نشر کیا گیا۔ جب یہ بیان نشر کیا گیا ببرک کارمل اس وقت تک افغانستان نہیں پہنچا تھا۔

۸۰ ہزار روسی فوجی ببرک کارمل کو کامیاب بنانا چاہتی تھیں۔ روسی مشاورت ناکام ہو چکی تھی اب روسی اپنے مشوروں کو اپنی فوجوں کے ذریعے ہی نافذ العمل کرنے کے لئے سرگرم عمل ہو گئے تھے۔ مزاحمتی تحریک کو کچل کر افغانستان کو مشرقی یورپی ممالک کی طرح اپنا باجگزار بنانا چاہتے تھے۔ اس دور میں مزاحمتی تحریک پورے افغانستان میں پھیل گئی اور اسے عالمی سطح پر سند قبولیت بھی ملی۔ کارمل انتظامیہ روسی افواج اور ہوائی قوت کی موجودگی کے باوجود اپنا بکھرا ہوا وجود نہ سمیٹ سکی۔ جوں جوں مزاحمتی تحریک موثر ہوتی گئی روسی افواج کی تعداد بھی بڑھتی گئی روایتی انداز اختیار کرنے کے علاوہ روسیوں نے جدید ترین حربی انداز بھی اختیار کیے لیکن وہ مزاحمتی تحریک کو ختم نہ کر سکے۔ حتیٰ کہ انہیں ببرک کارمل کو بھی قصر گمنامی میں دھکیل کر نجیب اللہ کو آگے بڑھانا پڑا۔

270

میجر جنرل ڈاکٹر نجیب اللہ

مئی ۱۹۸۶ء تا ۱۶ر اپریل ۱۹۹۲ء

میجر جنرل نجیب اللہ کا تعلق افغانستان کی خفیہ پولیس سے تھا۔ اسے "بیل" کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا کیونکہ یہ سفاکی اور طاقت کے بے دریغ استعمال کے لیے اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔ سفاکی اور طاقت کے بے دریغ استعمال کے لئے اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔ اس کا قوی جثہ اور موٹی گردن بھی اس کی شخصیت کو ظلم و سفاکی کے حوالے سے ہی متعارف کرواتا تھا۔ نجیب اللہ کو اقتدار میں لاکر ایک طرف مزاحمتی تحریک کو کچلنے اور دوسری طرف افغان عوام کی تالیف قلب کی ذمہ داریاں سونپی گئیں۔ دسمبر ۱۹۸۶ء میں نجیب اللہ نے ماسکو کا دورہ کیا اور واپسی پر جنگ کے خاتمے کے پروگرام کا اعلان کیا۔ اس مقصد کے لیے یکطرفہ جنگ بندی کا اعلان بھی کیا گیا۔ "قومی اتحاد" کی بنیاد پر ایک حکومت کی تشکیل کا ایسا منصوبہ بھی پیش کیا گیا جس میں مختلف فریقین کے نمائندے بھی شریک ہوں۔ ان سب اقدامات اور اعلانات کا واحد مقصد مزاحمتی تحریک کے دباؤ کو کم کرنا تھا۔ اس سے پہلی کٹھ پتلی حکومتیں بھی اس قسم کی تجاویز پیش کر چکی تھیں، ان کا مقصد بھی مزاحمتی تحریک کے زور کو کم کرنا ہوتا تھا۔ مجاہدین افغانستان کیونکہ اشتراکیوں کے خلاف جہاد کر رہے تھے اس لیے روسی افواج اور ان کی پروردہ حکومت کی موجودگی میں ایسی تجاویز پر عمل درآمد کی صورت ممکن نہیں تھی۔ مجاہدین ایسی تمام تجاویز مسترد کرتے چلے آئے ہیں۔ ۱۹۸۹ء میں روسی افواج کے انخلا اور پھر مجاہدین کے بڑھتے ہوئے فوجی دباؤ کے تحت نجیب اللہ نے ۱۶ر اپریل ۱۹۹۲ء میں اقتدار سے دستبرداری کا اعلان کیا اور اس وقت سے پناہ کی تلاش میں ہے۔

جنرل عبدالرحیم ہاتف



17ر اپریل تا 27ر اپریل 1992ء

اس کے بعد صبغت اللہ مجددی نے عبوری کونسل کے سربراہ کے طور پر افغانستان کے صدر کا عہدہ سنبھال لیا۔

نجات جبہ ملی

پروفیسر صبغۃ اللہ مجددی

علماء کو منظم کرنا شروع کیا۔ سردار داؤد کے زمانے میں ڈنمارک ہجرت کر گئے اور وہاں ایک مسجد کو مرکز بنا کر دعوت و تبلیغ کا کام شروع کیا۔ افغانستان میں روسی افواج کے داخلے کے بعد کمیونسٹوں کے خلاف جدوجہد کے لئے "نجات جبہ ملی" کے نام سے جماعت قائم کی۔ پروفیسر صبغۃ اللہ کا تعلق افغانستان کے معروف مجددی خاندان سے ہے جس کے لاکھوں مرید افغانستان اور وسط ایشیائی مسلم ریاستوں میں موجود ہیں۔ سلسلہ نقشبندیہ سے تعلق رکھنے والے اس خاندان کے اکابرین کی ایک خانقاہ "قلعہ جواد" کے نام سے کابل کے مضافات میں موجود ہے۔ امان اللہ خان کی مغرب پرستی کے خلاف اٹھنے والی تحریک میں اہم کردار ادا کرنے والا یہ خاندان بعد میں خود مغرب زدہ ہوتا چلا گیا۔ اب اس خاندان کی شہرت مذہب پرستوں کی نہیں بلکہ "اعتدال پسندوں" کی ہے۔ کابل یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد جامعہ الازہر میں حصول تعلیم کے لئے قیام پذیر رہے۔ ۱۹۷۱ء میں انہوں "جمعیت العلمائے محمدی" کے نام سے ایک تنظیم قائم کی اور دھریت کے خلاف علماء کو منظم کرنا شروع کیا۔ سردار داؤد کے زمانے میں ڈنمارک ہجرت کر گئے اور وہاں ایک مسجد کو مرکز بنا کر دعوت و تبلیغ کا کام شروع کیا۔ روس افواج کے داخلے کے بعد کمیونسٹوں کے خلاف جدوجہد کے لئے "نجات جبہ ملی" کے نام سے جماعت قائم کی۔ فروری ۱۹۸۹ء میں عبوری حکومت کی تشکیل کے لئے پورے افغانستان سے مجاہدین کے رہنماء اور کمانڈر جمع ہوئے۔ اس شوریٰ نے صبغۃ اللہ مجددی کو افغان عبوری حکومت کا صدر چن لیا تھا۔

صبغۃ اللہ مجددی کچھ عرصہ تک لیبیا میں بھی مقیم رہے۔ وہاں ان کی سرگرمیوں کے بارے میں زیادہ معلومات حاصل نہیں ہو سکیں۔

275

پروفیسر برہان الدین ربانی

پروفیسر ربانی کا شمار مزاحمتی تحریک کے ان بانیوں میں ہوتا ہے جو داؤد کے دور میں ہی مہاجر ہو کر پاکستان آ گئے تھے۔ یہاں جماعت اسلامی کے بانی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے ساتھ ان کے روابط قائم ہوئے ان روابط میں جماعت کے موجودہ امیر قاضی حسین احمد نے مرکزی کردار ادا کیا۔ شمالی افغانستان کے صوبہ بدخشان میں پیدا ہونے والے ربانی نے کابل یونیورسٹی کی شریعہ فیکلٹی میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد جامعۃ الازہر سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ اپنی اعلیٰ تعلیم مکمل کرنے کے بعد یہاں درس و تدریس میں مشغول ہو گئے یہاں ان کا تعلق اخوان المسلمین سے ہوا۔ حسن البناء اور سید مودودی کی تعلیمات سے متاثر ہوئے اور افغانستان واپس آ کر اسلامی تحریک کے لئے وقف ہو گئے۔ داؤد دور میں ہجرت کی اور پھر سید مودودی سے رابطے قائم ہوئے اور جمعیت اسلامی کو منظّم کیا۔ وادی پنج شیر میں روسیوں کو طویل عرصہ تک ناکوں چنے چبوانے والے عالمی شہرت کے حامل کمانڈر احمد شاہ مسعود کا تعلق انہی کی جماعت سے ہے۔ شمالی افغانستان میں ان کی جماعت کے اثرات خاصے گہرے ہیں۔ تاجک قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں اور فارسی بولتے ہیں۔ عربی زبان بھی بڑی روانی سے بولتے ہیں۔ کئی عالمی کانفرنسوں میں مجاہدین کی نمائندگی کر چکے ہیں۔ ۱۹۸۹ء میں بننے والی افغانوں کی عبوری حکومت میں تعمیر نو کی وزارت کا قلمدان ان کے سپرد تھا۔ پروفیسر ربانی دو درجن سے زائد کتب کے مصنف بھی ہیں اور دیگر چھ غیر ملکی زبانوں پر بھی عبور رکھتے ہیں۔

274

حزب اسلامی

انجینئر گلبدین حکمت یار

گلبدین کا شمار جہاد افغانستان کے ان قائدین میں ہوتا ہے جنہوں نے سردار محمد داؤد کے زمانے میں ہی اشتراکیوں کے خلاف جدوجہد شروع کر دی تھی کابل یونیورسٹی کی انجینئرنگ فیکلٹی میں حصول تعلیم کے دوران ہی انجمن نوجوانان اسلام کے پرچم تلے مزاحمتی سرگرمیاں شروع کیں۔ پھر جب داؤد خان نے عبدالرحیم نیازی اور دیگر قائدین کو راستے سے ہٹا دیا تونوجوان گلبدین نے اس کشتی کی پتوار سنبھالی اور پاکستان کو مرکز بنا کر مزاحمتی تحریک جاری رکھی۔ اسی دوران انہیں ایک کمیونسٹ طالب علم رہنما کو واصل جہنم کرنے کے جرم میں پھانسی کا حکم دیا گیا۔ گلبدین کا شمار مزاحمتی تحریک کے ان جیالوں میں ہوتا ہے جنہوں نے لادینی اور اشتراکی عناصر کے خلاف مسلح تحریک کا آغاز کیا۔ نور محمد ترکئی کے خلاف اولین مسلح بغاوت کا سہرا بھی گلبدین کے سر ہے۔ حتیٰ کہ ۱۹۹۰ء میں نجیب اللہ کی حکومت کے خلاف جنرل تنائی کی بغاوت کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اسے گلبدین کی حمایت حاصل تھی۔

۱۹۴۷ء افغانستان کے صوبہ کندز کے مقام امام صاحب میں پیدا ہونے والے گلبدین حکمت یار کی پوری زندگی اسلامی تنظیمات کے قیام و ترویج میں گزری ہے۔ یونیورسٹی میں حصول تعلیم سے لے کر پاکستان ہجرت تک اور پھر اشتراکیوں کے خلاف حزب اسلامی کی بنیاد رکھنے تک حکمت یار کی زندگی جدوجہد مسلسل کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ اشتراکی افواج کے داخلے سے لے کر ۱۹۸۹ء میں ان کے مکمل انخلا تک اشتراکی اگر کسی شخص سے سب سے زیادہ زچ رہے تو وہ گلبدین حکمت یار ہے جس کو راستے سے ہٹانے والے کے لئے لاکھوں روبل انعام کا اعلان بھی کیا گیا۔ روسی افواج کے انخلاء کے بعد سے لے کر مجددی حکومت کے قیام تک بھی گلبدین کا نام ہی متنازعہ ہو کر سامنے آتا رہا ہے۔

گلبدین انفرادی طور پر پشتون کردار کا بہترین نمونہ ہے جبکہ اس کی حزب اسلامی پشتونوں کی اجتماعی روایات کی امین ہے۔

حکمت یار ۱۹۸۵ء تک افغان مجاہدین کے سات جماعتی اتحاد کے نائب صدر کے علاوہ پہلی افغان عبوری حکومت کے وزیر خارجہ بھی رہ چکے ہیں۔

اتحاد اسلامی برائے آزادی افغانستان

پروفیسر عبدالرب رسول سیاف

ان کا اصل نام عبدالرسول سیاف ہے لیکن جہاد افغانستان میں شریک ایک عرب عالم دین یونیورسٹی پروفیسر ڈاکٹر عبداللہ عزام نے ان کا نام "عبدالرسول" یعنی "رسول کے بندے اور غلام" کی بجائے عبدالرب یعنی "رب کا بندہ اور غلام" رکھا۔ اب ان کا یہی نام معروف ہے۔ کابل یونیورسٹی سے شریعہ میں ڈگری حاصل کرنے کے بعد مصر کی جامعۃ الازہر سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ یہاں حصول تعلیم کے دوران ان کے تعلقات عالم عرب کے علماء اور شیوخ سے ہوئے جنہوں نے افغانستان میں ان کی جماعت کے قیام وبقا کے لئے اخلاقی اور مادی وسائل مہیا کئے۔ افغانستان میں الحاد، کمیونزم اور سوشلزم کے بڑھتے ہوئے اثرات کے خلاف لوگوں کو منظم کرنے کی کوشش کی۔

روسی افواج کے داخلے کے بعد مزاحمتی جدوجہد میں شریک رہے۔ اپنی فصیح وبلیغ عربی دانی کی وجہ سے ان کا رابطہ فلسطین کے ایک جلاوطن رہنما شیخ عبداللہ عزام سے ہوا جو پاکستان میں رابطہ عالم اسلامی کے نمائندے کے طور پر مزاحمتی تحریک سے وابستہ تھے۔ انہوں نے عبدالرسول کو "عبدالرب" ہی نہیں بنایا بلکہ بے پناہ مادی وسائل کے ذریعے افغانستان کے سلفی العقیدہ لوگوں کو اتحاد اسلامی برائے آزادی افغانستان کے پرچم تلے جمع ہونے کا موقع دیا اور انہیں ان کا امیر بننے کی راہ دکھائی۔ پھر اسی جماعت کی تنظیم کے ذریعے عالم عرب کے ہزاروں نوجوانوں کو میدان جہاد تک پہنچایا۔ پاکستان کے اہل حدیث مکتبہ فکر کے نوجوان بھی کافی عرصہ تک اس جماعت کی صفوں میں رہ کر اشتراکیت کے خلاف جہاد میں حصہ لیتے رہے۔ سیاف کئی بین الاقوامی فورموں پر مجاہدین افغانستان کی نمائندگی کا فریضہ سرانجام دیتے رہے۔ وہ افغان مجاہدین کے پہلے اتحاد کے صدر بھی منتخب ہوئے۔ انہیں شاہ فیصل ایوارڈ بھی مل چکا ہے۔ ۱۹۸۹ء میں بننے والی عبوری حکومت میں وزیر اعظم منتخب ہوئے۔

حزب اسلامی

مولوی محمد یونس خالص

۱۹۱۹ءمیں صوبہ ننگرہار کی تحصیل خوگیانی کے ایک گاؤں گندمک میں پیدا ہوئے۔ گھرانہ دینی تھا اس لئے شروع ہی سے دینی تعلیم حاصل کرنی شروع کر دی۔ ۱۹۳۹ءمیں اکوڑہ خٹک کے مشہور دینی مدرسے "دارلعلوم حقانیہ" میں پڑھنا شروع کیا۔ مشہور عالم دین مولانا عبدالحق جیسے اکابر علمائے کرام سے تعلیم حاصل کی۔ دس سال تک اس ادارے میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد کابل کے ایک ادارے میں بطور مدرس عملی زندگی کا آغاز کیا۔ ۱۹۵۱ءسے دینی موضوعات پر لکھنا شروع کیا۔ ۱۹۶۱ءمیں کابل سے شائع ہونے والے ایک مجلّے "پیمان حق" کے مدیر مقرر ہوئے۔ ظاہر شاہ کے دور میں جب شعائر اسلامی کا کھلم کھلا مذاق اڑایا جانے لگا تو آپ نے ان کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک تنظیم بنائی۔ ۱۹۶۸ءمیں "گھیر" کے نام سے ایک ہفت روزے کا آغاز کیا۔ نوجوانان اسلام کی تنظیم و تشکیل میں بھی آپ شریک ہوئے۔ عبدالرحیم نیازی، پروفیسر ربانی، پروفیسر سیاف اور حکمت یار کے ساتھ مل کر کام کیا۔ حزب اسلامی کی تشکیل کے وقت اس کے نائب امیر مقرر ہوئے۔ ۱۹۷۸ءمیں نور محمد ترکئی کے زمانے میں مسلح جہاد کا آغاز کیا اور دیگر رہنماؤں سے مل کر "حرکت انقلاب اسلامی" تشکیل دی حرکت کی ٹوٹ پھوٹ کے بعد آپ نے حزب اسلامی سے نام سے اپنی علیحدہ جماعت بنائی اور اس کے امیر مقرر ہوگئے۔ فاتح خوست مشہور کمانڈر مولانا جلال الدین حقانی، حاجی دین محمد، عبدالحق اور ملا ملنگ کا تعلق بھی اسی جماعت سے ہے۔ یونس خالص کو ۱۹۸۹ءمیں بننے والی عبوری حکومت میں وزارت داخلہ کا قلمدان دیا گیا۔

277

حرکت انقلاب اسلامی

مولوی محمد نبی محمدی

۱۹۲۱ءمیں صوبہ لوگر کے قصبہ برکی برک کے علاقے قلعہ عباس شاہ میں پیدا ہوئے۔ پانچ برس کی عمر میں حصول تعلیم کا آغاز کیا۔ لوگر ' میدان اور پغمان کے علاقوں میں واقع دینی مدارس میں پڑھنے کے بعد ۱۹۵۳ءمیں تعلیم مکمل کی اور پھر بطور مدرس عملی زندگی کا آغاز کیا۔ ۱۹۶۹ءمیں پارلیمینٹ (لوئے جرگہ) کے ممبر منتخب ہوئے پھر صوبہ ہلمند کے علاقے مرجامیں دینی مدرسے کی بنیاد رکھی۔ ظاہر شاہی دور میں جب کمیونسٹوں نے اسلام کے خلاف سرگرمیاں شروع کیں تو آپ نے علما کو منظم کر کے قلمی ولسانی جہاد کا آغاز کیا۔ مئی ۱۹۷۸ءمیں پاکستان ہجرت کی اور کوئٹہ میں "حرکت انقلاب اسلامی" کی بنیاد رکھی اور اس کے امیر مقرر ہوئے۔ کچھ عرصے بعد جب مختلف جماعتوں نے اتحاد قائم کیا تو نبی محمدی نے اس اتحاد میں شامل ہونے سے انکار کر دیا جبکہ ان کی جماعت کے مولوی نصراللہ منصور نے اپنا گروپ الگ کر کے اس اتحاد میں شمولیت اختیار کر لی۔ کچھ عرصے بعد جب آئی ایس آئی کی کاوشوں سے نبی محمدی نے اس اتحاد میں شمولیت اختیار کی تو مولوی نصراللہ منصور گروپ اس اتحاد سے نکل گیا۔ ۱۹۸۹ءمیں بننے والی عبوری حکومت میں وزیر دفاع منتخب ہوئے۔ لبرل اور اعتدال پسند افغان رہنماؤں میں نبی محمدی ایک مضبوط آدمی سمجھے جاتے ہیں۔ ان کی زندگی کا اکثر حصہ لوگر میں گزرا ہے۔

278

محاذ ملی اسلامی

پیر سید احمد گیلانی آفندی

۱۹۳۳ء میں کابل میں پیدا ہوئے۔ شریعہ فیکلٹی میں تعلیم حاصل کی آپ کا خاندان عراق سے یہاں آبسا تھا۔ پیر صاحب کا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے جاملتا ہے۔ اپنے والد کے انتقال کے بعد سید احمد قادریہ سلسلہ نسب کے پیر مقرر ہوئے سرخرود 'ننگر ھار مشرقی افغانستان ' دہانائی غوری' بغلان کے علاوہ شمالی افغانستان میں بھی ان کے خاندان کی وسیع و عریض جائیدادیں موجود ہیں۔ کابل میں کاروں کی تجارت کا ایک بڑا ادارہ بھی انہی کے خاندان کی ملکیت ہے۔ ۱۹۷۸ء میں پاکستان ہجرت کی اور "محاذ ملی اسلامی" کے نام سے اپنی جماعت بنائی جو اشتراکیوں کے خلاف جہاد میں مصروف رہی ہے ان کا شمار لبرل رہنماؤں میں ہوتا ہے جو افغانستان میں وسیع البنیاد حکومت کے قیام کے حامی ہیں۔

اتحاد ہشت گانہ

ایران میں مجاہدین کی نو جماعتیں کام کرتی ہیں۔ ان میں سے آٹھ کا اتحاد ہے۔ اس اتحاد میں سازمان نصر، عبدالکریم خلیلی کی قیادت میں، حرکت اسلامی، آیت اللہ محسنی کی قیادت پاسداران جہاد، دس افراد کی اجتماعی قیادت میں، حزب اللہ قاری احمد الیاس کی سربراہی میں نزہت انتہار، اخلاقی اور ذکی کی قیادت میں، جبہ متحد، اجتماعی قیادت میں نعرہ اسلامی، زیدی محقیقی کی قیادت میں اور غرنی صوبہ کی دعوت اتحاد اسلامی فعال ہیں جبکہ شعلہ انقلاب شیعہ مجاہدین کی ایک چھوٹی سی جماعت ہے جو اتحاد ہشت گانہ میں شامل نہیں ہے۔

شورائے اتفاق

پاکستان کے مجاہدین کے اتحاد ہفت گانہ اور ایران کے مجاہدین کے اتحاد ہشت گانہ سے علیحدہ آزادانہ طور پر کام کرتا ہے۔ یہ شیعوں کا سب سے بڑا اور منظم گروپ ہے۔ اس کے ہیڈکوارٹر افغانستان کے اندر ہزارہ جات کے علاقہ میں ہے۔ پاکستان میں کوئٹہ میں بھی اس کے دفاتر ہیں۔ یہ انتہائی تربیت یافتہ مجاہدین پر مشتمل تنظیم ہے افغانستان کے ہزارہ جات میں اس تنظیم کا سب سے زیادہ کنٹرول ہے۔

281

قوم پرست جماعتیں

افغانستان کے اعتدال پسند اور لادین عناصر جنہوں نے اشتراکیت کو من وعن قبول نہیں کیا یا اشتراکیت کی انتہا سے لوٹ آئے' قوم پرست جماعتوں میں شامل ہوئے' ان قوم پرست جماعتوں کے بانی اکثر کمیونسٹ ہی ہیں یہی وجہ ہے کہ ان جماعتوں کو بائیں بازو کی نیم کیمونسٹ قوم پرست جماعتیں کہا جاتا ہے۔ یہ جماعتیں افغانستان کے قدیم اور روایتی معاشرے کو جدید خطوط پر ترقی کی شاہراہ پر گامزن کرنا چاہتی ہیں۔ ان میں وحدت ملی ڈیمو کریٹک پروگریسو پارٹی' حزب اتحاد ملی' جمعیت عوام اور نیشنل فادر لینڈ جیسی جماعتیں شامل ہیں۔ افغانستان کے ڈاکٹر نجیب اللہ کا تعلق بھی (نیشنل فادر لینڈ) وطن پارٹی سے ہے۔

شیخ جمیل الرحمان

جماعت الدعوہ الی القرآن والسنہ کے بانی وامیر صوبہ کنڑکی وادی پیچ کے ایک گاؤں یں پیدا ہوئے۔ والدین نے ان کا نام محمد حسین رکھا۔ لیکن انہوں نے اپنے آپ کو جمیل الرحمٰن کے نام سے لکھنا شروع کیا اور اسی نام سے معروف ہوئے۔ ۱۹۵۹ء میں دینی تعلیم سے فارغ ہو کر دعوت و تبلیغ کا کام شروع کیا۔ عبدالرحیم نیازی، پروفیسر ربانی اور گلبدین حکمت یار نے جب تحریکی کام کی ابتدا کی تو شیخ جمیل الر حمان نے ان کے ساتھ بھرپور تعاون کیا

کنڑ میں جو شیخ کا آبائی صوبہ تھا اس جماعت نے بڑی ترقی کی۔ عرب ممالک سے یہاں تربیت حاصل کرنے کے لئے آنے والے سلفی العقیدہ نوجوان اس جماعت کی صفوں میں شامل ہو کر افغانستان میں جہاد کیا کرتے تھے نورستانی اہلحدیثوں کی قائم کردہ حکومت کے خاتمے کے بعد یہ لوگ جمعیت اسلامی (ربانی) حزب اسلامی (حکمت یار) اور جماعت الدعوہ میں ضم ہو چکے ہیں۔ سیاف کی جماعت کے ذریعے پاکستان پہنچنے والے کئی عرب نوجوان جماعت الدعوۃ کی صفوں میں شامل ہو جاتے رہے ہیں۔ روسی افواج کے انخلا کے بعد حزب اسلامی (حکمت یار گروپ) اور جماعت الدعوۃ (شیخ جمیل الر حمان) کے حامیوں کے درمیان خون ریز جھڑپیں بھی ہوئیں۔ ۱۹۹۱ء میں شیخ جمیل الر حمان ایک مصری نوجوان مجاہد کے ہاتھوں واصل بحق ہوئے۔ اس نوجوان کو بھی اسی وقت ہلاک کر دیا گیا تھا۔ اس لئے شیخ کے قتل کا معمہ ابھی تک حل نہیں ہوسکا جماعت الدعوۃ کے قائدین اس سانحے کے لئے حکمت یار اور جماعت اسلامی کو الزام دیتے ہیں۔

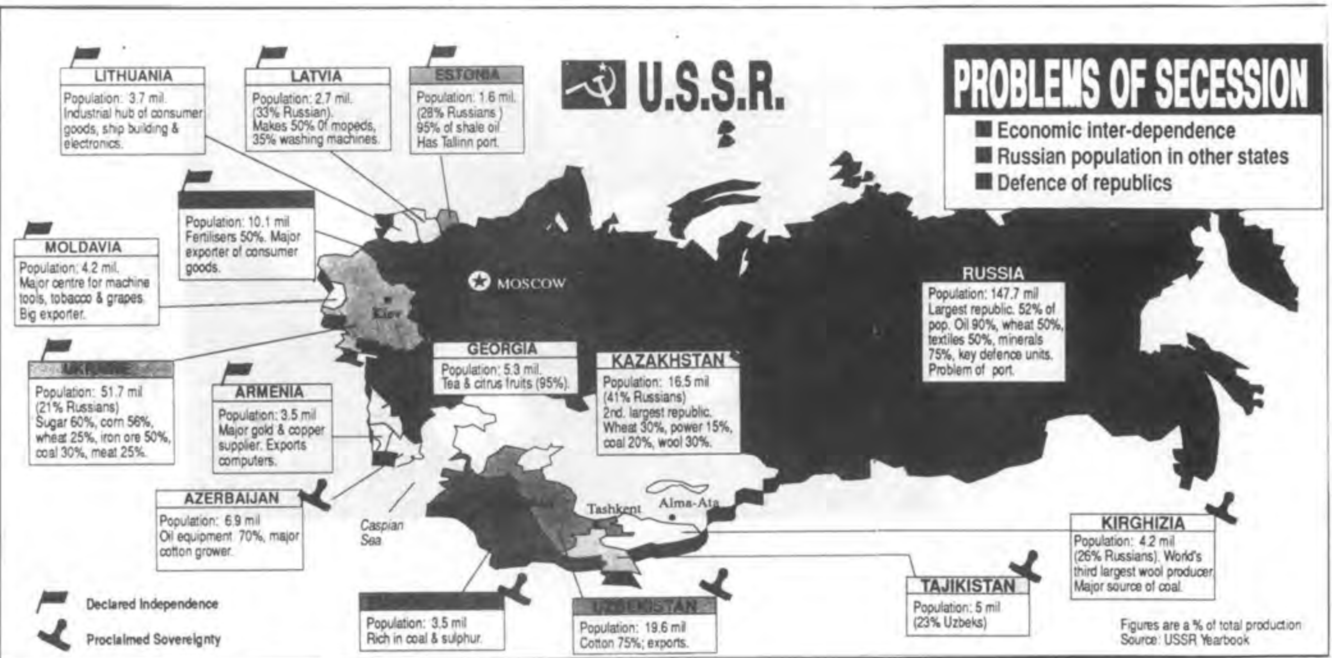
283

اشتراکی جماعتیں

افغانستان کی سب سے بڑی اشتراکی جماعت پیپلز ڈیمو کریٹک پارٹی آف افغانستان ہے جو خلق اور پرچم دھڑوں میں بٹ چکی ہے۔ یہ جھگڑے سردار محمد داؤد خان کے دور سے ہی شروع ہو چکے تھے۔ جو نور محمد ترکئی اور حفیظ اللہ امین ببرک کارمل اور نجیب اللہ کے دور تک جاری رہے روسی مشیروں اور افواج کی موجودگی میں بھی پرچمی و خلقی دھڑے دست و گریبان رہے۔ پرچمیوں اور خلقیوں کا اختلاف نظریاتی نہیں بلکہ عملی ہے۔

اس کے علاوہ ستم ملی پارٹی اور شعلہ جاوید بھی اشتراکی نظریات کی جماعتیں ہیں۔ صوبہ بدخشاں میں سیتامائز کے نام سے بھی کمیونسٹ نظریات کے حامل لوگ فعال ہیں لیکن روسی افواج کے افغانستان میں داخلے کے بعد ان جماعتوں کا نظریاتی کام ٹھپ ہو گیا اور نظریاتی مزاحمتی تحریک نے مسلح جدوجہد کی شکل اختیار کر لی۔ اس دوران اشتراکی اور لادینی نظریات کے حامل افراد قابل گردن زدنی رہے اور یہ صورت اب تک قائم ہے۔ کوئی شخص اب اپنے آپ کو ان اشتراکی جماعتوں سے وابستہ ظاہر نہیں کرتا کیونکہ مسلح ٹکراؤ کے بعد اب اشتراکی شکست کھا چکے ہیں اس لئے اب شکست خوردہ نظریئے سے اپنے آپ کو وابستہ قرار دینے والا احمق ہی ہو سکتا ہے۔

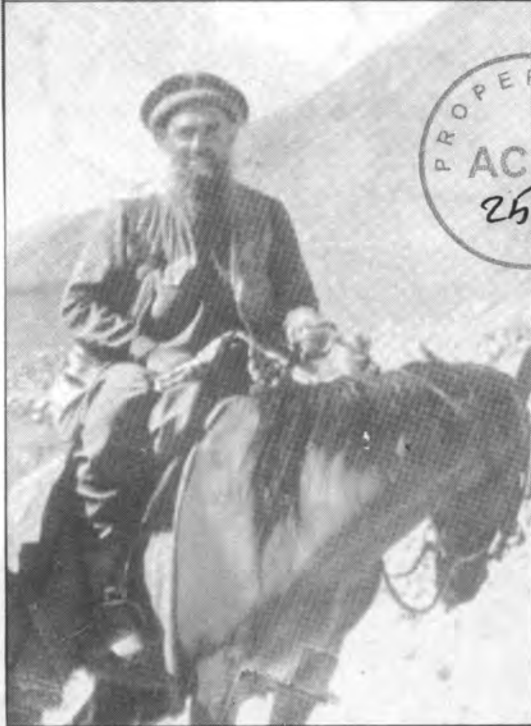
سابق سوویت یونین کا نقشہ جواب دنیا کے نقشے سے محو ہو چکا ہے





ضیادور کے اولین وزیر خارجہ آغاشاہی

عبداللہ عزام شمالی افغانستان کے دورے کے دوران پروفیسر برہان الدین ربانی اور احمد شاہ مسعود کے ساتھ



جہاد افغانستان کا ایک عرب کردار ـــ پروفیسر ڈاکٹر عبداللہ عزام شہید


جہاد آزادی میں شاندار فتح کے بعد
کیا افغانستان میں امن قائم ہو جائے گا؟



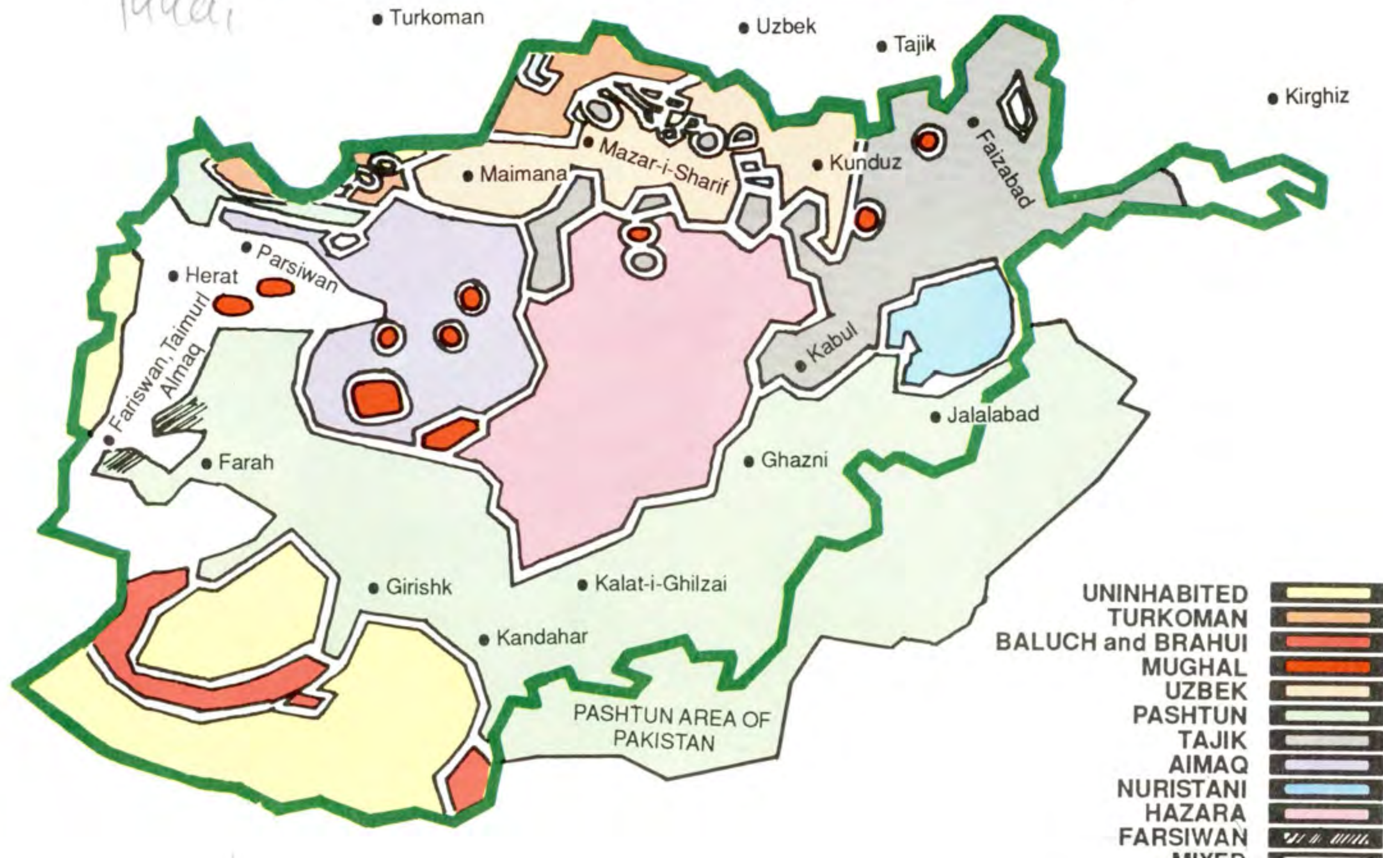



دنیا حیران ہے لڑ گئے توپ سے
ہم ہیں افغان! تیغ و تفنگ میں پلے



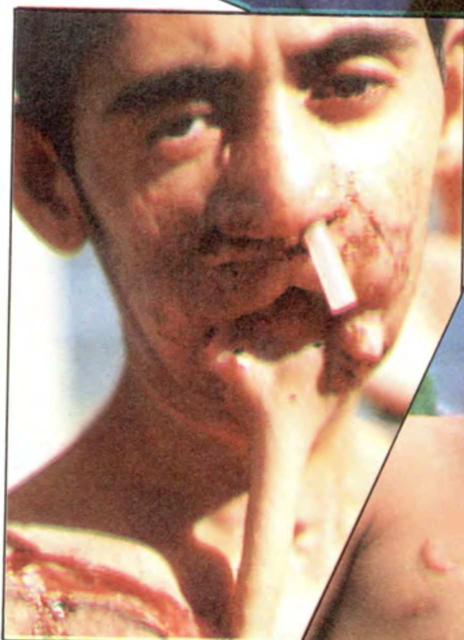


DISTRIBUTION OF THE MAJOR ETHNIC GROUPS IN AFGHANISTAN





















سوویت یونین کے خلاف فعال کردار رونالڈ ریگن اور
پوپ جان پال دونوں قاتلانہ حملوں میں بال بال بچے



جہاد افغانستان کا ایک
عظیم عرب کردار
پروفیسر ڈاکٹر عبداللہ عزام شہید

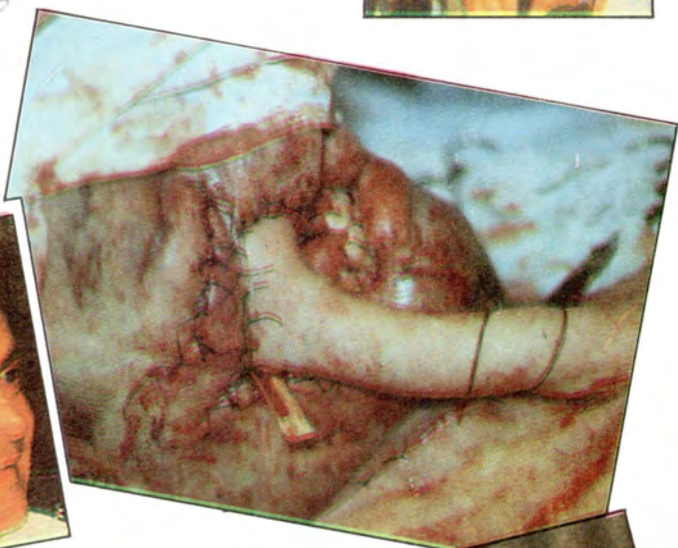
144 95









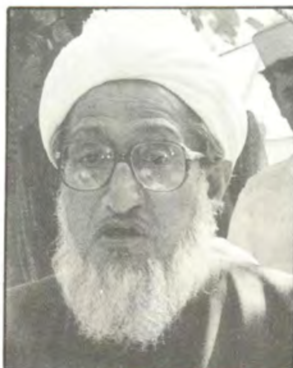




























افغان جہاد کی وکالت کرنے والا
امریکی کردار ولیم کیسی۔
سی آئی اے کا ڈائریکٹر جس کے
کہنے پر مجاہدین کی امداد
دوگنی کر دی گئی۔

ولیم کیسی





مصنف کی دیگر کتب

1 سی 130 کا حادثہ
2 ناسٹراڈ یمس کی پیش گوئیاں
3 یہودی سازش اور عالم اسلام
4 ایم ایم عالم کی داستان حیات
5 ECONOMICS OF PAKISTAN
6 CONCEPTS OF ECONOMICS

سرورق کا بالائی حصّہ

بیرونی دائروی سفیدی ، اشتراکی فوجی مداخلت سے پہلے افغانستان میں امن و سلامتی کی موجودگی کی علامت ہے جس پر اشتراکیوں کے قہر و جبر کی سیاہ رات غالب آ گئی - پھر آہستہ آہستہ یہ اشتراکی اندھیرا چھٹنے لگا۔ مجاہدین کی استقامت اور شہداء کے لہو کی سرخی اس سیاہ رات پر غالب آ گئی - اور بالا خر آزادی صبح کی روشنی چہار سو پھیلنے لگی:

سرورق کا زیریں حصّہ

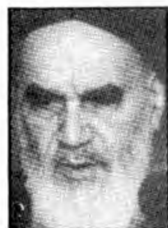
افغان مجاہدین کے پاؤں تلے پڑا ہوا اشتراکی جھنڈا - افغانستان میں اشتراکیوں کی عسکری ہزیمت اور پھر سوویت یونین کے خاتمے کی عکاسی کرتا ہے۔ جبکہ مجاہدین کی افغان پرچم کے حصول کیلئے کھینچا تانی - مزاحمتی تحریک میں پائے جانے والے اختلافات کو ظاہر کرتی ہے۔

فتحِ افغانستان کے حیران کُن انکشافات



افغان مزاحمتی تحریک کا آغاز

کیا ذوالفقار علی بھٹو کا کارنامہ ہے؟



تہران میں جنرل ضیاء کی آمد

آیت اللہ خمینی نے جنرل ضیاء کو ملنے سے انکار کیوں کیا؟



پوپ کے ایلچی کی پاکستان آمد

امریکہ نے افغانستان اور پولینڈ میں مزاحمتی تحریکوں کو زندہ رکھنے کا فیصلہ کیوں کیا؟



جنیوا معاہدے پر دستخط

جنرل ضیاء کا مسلسل انکار -- جونیجو کا فوری اقرار -- حقیقت کیا ہے؟



جنرل اختر کا خواب

روسیوں کی فوجی شکست، مجاہدین کی سیاسی فتح کیوں نہ بن سکی؟